عقیدہ، علم، اصلاح، اخلاق اور ادب پر پینتیس سالہ

مطالعے، تجزیے اور تجربے کا نچوڑ

ریزۂ الماس

افادات علمیہ

مفتی محمد سعید خان

(خلیفہ مجاز حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی طاب ثراہ)

ندوۃ المصنفین

الندوہ ایجوکیشنل ٹرسٹ اسلام آباد

عقیدہ، علم، اصلاح، اخلاق اور ادب پر پینتیس سالہ

مطالعے، تجزیے اور تجربے کا نچوڑ

افادات علمیہ

مفتی محمد سعید خان

(خلیفہ مجاز حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی طاب ثراہ)

ندوۃ المصنفین

الندوۃ ایجوکیشنل ٹرسٹ اسلام آباد

سلسلہ اشاعت:	متفرقات: ①
نام کتاب:	ریزۂ الماس
افاداتِ علمیہ:	مفتی محمد سعید خان
صفحات:	616
سال اشاعت:	۱۴۳۵ھ/ 2014ء
پروف ریڈر و مرتب فہارس:	محمد اورنگ زیب اعوان 0300-5203983
کمپوزنگ و ڈیزائننگ:	ندیم اقبال 0342-9206176
ناشر:	ندوۃ المصنفین، اسلام آباد
مطبع:	بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور
قیمت	=/1500 روپے

ملنے کا پتہ: ادارہ المناد، شفیع پلازہ بینک روڈ صدر راولپنڈی
0333-5134333 051-5111725

فہرس

عقائد

تفسیر القرآن الکریم

حدیث مبارکہ

سیرت النبی ﷺ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

ندوۃ المصنفین

فقہ

ندوۃ المصنفین

تصوف

تاریخ

شخصیات

ندوۃ المصنفین

ادب

اوراد و وظائف

متفرقات

ے کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر

پردے میں گل کے، لاکھ جگر چاک ہو گئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہٖ ونتوکّل علیہ

ونعوذ باللہ من شرور انفسنا ومن سیّئات اعمالنا

من یّھدہ اللہ فلا مضلّ لہٗ ومن یّضللہ فلا ھادی لہٗ

ونشھد ان لآ الٰہ الّا اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ

ونشھد انّ سیّدنا ومولانا محمّدًا عبدہٗ ورسولہٗ

صلّی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اُس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

مفتی محمد سعید خان

اے نازشِ آدم صَلِّ عَلٰی
اے مُرسلِ خاتم صَلِّ عَلٰی
اے رأفت و رحمت صَلِّ عَلٰی
اے خُلق مجسّم صَلِّ عَلٰی
اے حاشرِ محشر صَلِّ عَلٰی
اے رحمتِ پیہم صَلِّ عَلٰی
یا اسمک احمد صَلِّ عَلٰی
اے نامِ محمد صَلِّ عَلٰی

تو شوق و عقیدت کا مرکز
تو منزل ہے تو رہبر ہے
کُل جگ کی ہدایت کا ضامن
تو صدق و صفا کا پیکر ہے
تو غیب کا مخبرِ صادق ہے
تو حجتِ داورِ محشر ہے

اے رافع اِرْفَعْ صَلِّ عَلٰی
اے شافع اِشْفَعْ صَلِّ عَلٰی

وہ شاہ بنے مظلوم تھے جو
باہوش ہوئے ، مخمور ترے
پھر ظلم کی رسموں کو روندا
سب میرِ زماں ، مجبور ترے
انصاف و علم کو عام کریں
خدامِ صفا ، دستور ترے

ترے قلب کی راحت صَلِّ عَلیٰ
تری روح کی بہجت صَلِّ عَلیٰ

جو ہجرت پر مجبور ہوئے
اور درد اور دکھ سے چور ہوئے
انصار جنہوں نے نصرت کی
وہ ناصر اور منصور ہوئے
تری آنکھوں کے تارے، پیارے تھے
وہ فائز اور مغفور ہوئے

اے فاتح یکتا صَلِّ عَلیٰ
میرے آقا ، مولیٰ صَلِّ عَلیٰ

کل خلق جو غرق عصیاں تھی
وہ تیری وجہ سے بخشی گئی

وہ راہ جو تو نے دکھائی تھی
وہ نسبت بیضاء ، واصل تھی
احسان ترا ہے تابہ ابد
اس راہ پہ جو کہ مُوصِل تھی
اے محسن و مُوصِل صَلِّ عَلٰی
اے ہادی و مرسل صَلِّ عَلٰی
اب قُرب و بُعد کا فرق مٹے
اب شاہد و غائب یکساں ہو
اب دل کے سارے روگ مٹیں
اب اس کو حضوری حاصل ہو
بس دل ہی دل بن جاؤں میں
کل عمر کے عشق کا حاصل ہو
ہے صبح و مساء اب صَلِّ عَلٰی
اے باد صبا اب صَلِّ عَلٰی
اسراء و لقاء کی منازل کے
اِک تم ہی صاحبِ عرفاں ہو
اِک تم ہی وفا کا مرکز ہو
اِک تم ہی جان جاناں ہو

سب شاہ و گدا خادم ٹھہرے
اب تم ہی میرِ میراں ہو
اب ورد ہے ہر دم صَلِّ عَلٰی
اب آنکھیں پُرنم صَلِّ عَلٰی

جس شخص پہ تیری نظر اُٹھی
وہ حاشرِ خلقِ خدا ٹھہرے
جس جا پر تیرے پاؤں پڑے
عشاق نے واں پر سجدے کیے
جب در پر حاضر تیرے ہوئے
سو شوق سے سب یہ کہنے لگے
اے نافع و انفع صَلِّ عَلٰی
اے رافع و ارفع صَلِّ عَلٰی
اے درد کے مرہم صَلِّ عَلٰی
اے سرور عالم صَلِّ عَلٰی
اے ساقی کوثر صَلِّ عَلٰی
اے منزل و رہبر صَلِّ عَلٰی
اے نیّر تاباں صَلِّ عَلٰی
ہر درد کے درماں صَلِّ عَلٰی

جَــوَادٌ کَــرِيــمٌ، نَبِيُّ الـرَّحْـمَةِ وَالْهُـدَىٰ

شَـمَـائِـلُـهُ عَـفُـوٌّ، مَـنْبَـعُ الـجُـوْدِ وَالْوَفَـا

لَـهُ الْـمَـكَـارِمُ وَالْـحَـوْضُ وَالشَّفَاعَةُ وَاللِّوَا

لَـهُ السَّلَامُ مِـنْ رَبِّـهِ مَـا تَبَـارَتِ الصَّبَـا

مفتی محمد سعید خان

ترجمہ: نہایت سخی، بہت عزت والے، رحمت اور ہدایت کے نبی، جن کا طرزِ عمل ہمیشہ دشمنوں کو معاف کرنا رہا اور جو سخاوت کا مرکز اور وعدوں کو پورا کرنے کا منبع رہے۔ جنہیں بہت بلند مقامات ملے، حوض کوثر ان کا ہے، شفاعت کا مقام انھیں ملے گا اور قیامت میں سب سے بلند انھیں کا جھنڈا ہوگا۔ ان کے پروردگار کی طرف سے ہمیشہ ان کو سلام پہنچتا رہے، جب تک کہ بادِ صبا چلتی رہے۔

رشحات

بسم اللہ الرحمن الرحیم
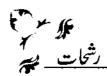
بفضلہٖ سبحانہ وتعالیٰ تقریباً پچھلے پینتیس برس سے دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف مقامات پر دروس کا سلسلہ جاری ہے اور بعض احباب ان دروس اور نجی محافل میں بھی علمی اور تحقیقی مضامین کو ریکارڈ یا قلمبند کرتے رہے۔

ان کی طباعت کے لیے بھی مدت سے اصرار تھا لیکن ''ایاز قدر خود بشناس'' کے قاعدے سے احساسِ مسئولیت ہمیشہ طبیعت پر غالب رہا۔ ادھر چند برس سے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ بادل نخواستہ وبکراہت اس کڑوی دوا کی جرعہ ریزی کرنی پڑی۔ سہارا صرف یہ ہے کہ فَعَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئاً وَّیَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْراً کَثِیْراً۔

مختلف احباب نے بہت باتیں قلمبند کرکے بھجوادیں، لیکن ایک تو اب نئے سرے سے ان تمام علمی وتحقیقی باتوں کے لیے مراجعتِ کتب اور ان کی استناد پر اطمینان اور دوسرے، زبان کی تبدیلی کہ گفتگو اور تحریر کی زبان بالعموم مختلف ہوا کرتی ہے، تو اس تبدیلی کے لیے محنت کرنا، یہ دونوں کام جہاں وقت طلب تھے وہاں عرق ریزی بھی کرنا پڑی۔

بفضلہٖ سبحانہ وتعالیٰ یہ ہفت خواں رستم (A Herculean Task) مکمل ہوا اور اب یہ یقین واطمینان ہے کہ جو کچھ اس خریطے میں ہے، مستند ہے، قابل بھروسہ ہے اور اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک کے مطابق ہے۔

طباعت واشاعت وغیرہ کے جان لیوا مراحل ابھی باقی ہیں اور یہ ''قطرہ'' کب

''گوہر'' بنے؟ عجلت بے ثمر

پڑا رہ اے دل وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے؟

کتابوں کا کوئی حوالہ نہیں۔ضرورت مند خود محنت کر کے اپنی تسکین کا سامان پیدا کریں اگر بدرجہ اضطرار کوئی ضرورت پیش آ ہی جائے اور مراجعتِ کتب کے باوجود گوہر مقصود ہاتھ نہ آئے تو خط کی زحمت اُٹھائیں۔

معترضین وحساد سے دست بستہ معافی، سعی لا حاصل نہ فرمائیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ صرف نظر فرمائیں اور چشم پوشی سے، محض اپنے فضل وکرم، عنایت ونوازش سے، اسے قبول فرمالیں تو ''بِضَاعَۃٌ مُزْجَاۃٌ'' ٹھکانے لگی اور اگر یہی حاصل نہ ہوا تو پھر معترضین وحساد کو مبارک ہو۔

إن كـان لـي عـنـد سـلـمىٰ قبـول
فـلا أبـالـي بـمـا يـقـول الـعـذول

والحمد لله الذى بنعمته تتم الصلحت

سعید
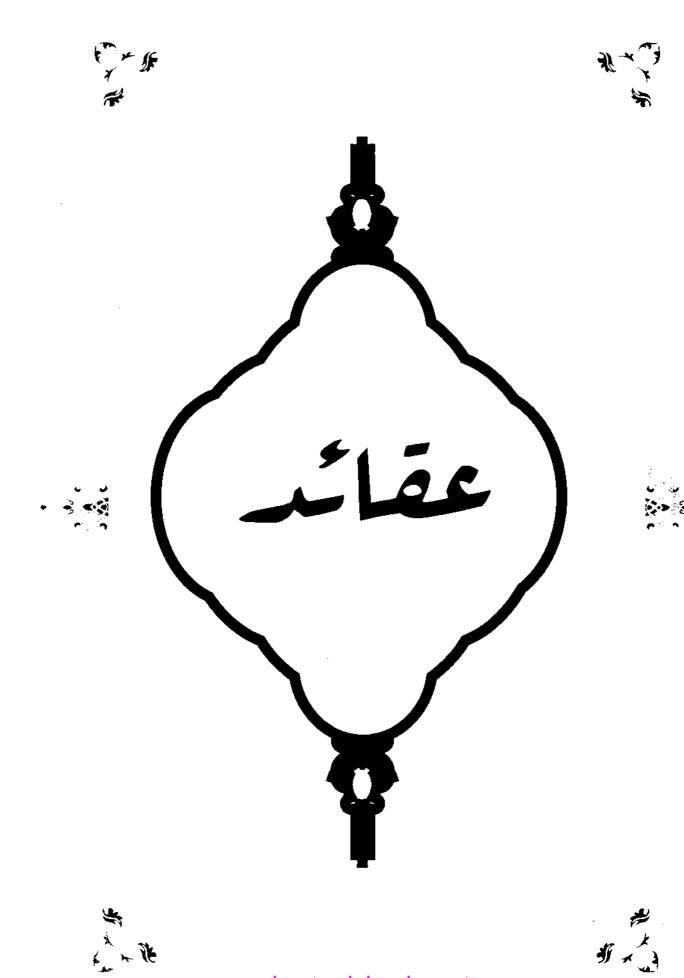
۲۵، جمادی الثانی ۱۴۳۵ھ

بمطابق 28، اپریل 2014ء بروز پیر

عقائد

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِیْدًا.

(پ:۵،سورۃ النساء،آیت:۱۳۶)

اے ایمان والو! ایمان لاؤ

① اللہ تعالیٰ پر

② اور اس کے رسول (ﷺ) پر

③ اور اس کتاب (قرآن کریم) پر، جو اس نے اپنے رسول (ﷺ) پر نازل کی ہے.

④ اور ان تمام کتابوں پر جو اللہ تعالیٰ اس (کتاب) سے قبل نازل کر چکا ہے.

اور یاد رکھو جو شخص بھی انکار کرتا ہے

① اللہ تعالیٰ کا

یا

② اس کے فرشتوں کا

یا

③ اس کی کتابوں کا

یا

④ اس کے رسولوں کا

یا

⑤ قیامت کے دن کا

تو یہ شخص گمراہی میں بہت دور جا پڑا ہے۔
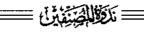
دو باتیں، جن میں بہت احتیاط درکار ہے۔

(فرمایا) دو باتوں میں بہت احتیاط درکار ہے کبھی غفلت نہ برتنی چاہیے۔ ایک تو "تَقَوُّلُ عَلَی اللّٰہ" (اپنی طرف سے کوئی جھوٹ گھڑ کر اللہ تعالیٰ کے ذمے لگا دینا) مثلاً اپنے مفاد کے لیے دین کو استعمال کرنا، اپنے مخالف کو ڈرانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ایسی وعید اور خوف کی بات سنانا جو اللہ تعالیٰ نے نہیں کہی، کسی سے خوش ہو کر اسے ایسی بشارتیں دیتے پھرنا جو اللہ تعالیٰ نے نہیں دیں۔ اپنی ذات کے تَرَفُّع اور تَعَلّی کے لیے اللہ تعالیٰ کا نام لے لے کر اپنے متعلق اچھے جملے کہنا۔ اللہ تعالیٰ کے ذمے ایسے ایسے مسائل لگانا جن کا شریعت میں کوئی وجود نہیں، جہالت اور بدعات و رسومات کو گھڑنا اور لوگوں سے یہ کہنا یا یہ تاثر دینا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، یہ سب کچھ تَقَوُّلُ عَلَی اللّٰہ یعنی اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنا ہے۔

اور دوسری بات جس سے بہت بچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اپنی زبان سے کوئی بات کہے اور پھر پوری نہ کرے۔ دعویٰ کرنا کہ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی بھی کام کرنے کو تیار ہوں اور پھر جب موقع آئے تو بھاگ کھڑے ہونا، دعویٰ کرنا کہ ہم غرباء و فقراء کے ملجا و ماویٰ ہیں اور وقت آنے پر اپنی دولت سینت کر رکھ لینا، دعویٰ اسلام کا اور اعمال منافقت پر مبنی، بظاہر ایمان اور درونِ خانہ کفر۔

یہ دونوں اعمال ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے غصے اور غضب کی آگ پر تیل ڈالنے کے مترادف ہیں۔ أعاذنا اللّٰہ تعالیٰ من جمیع الآثام و الفتن.

سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ اور صحیح عقیدے کی ترویج.

(فرمایا) اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عوام کو صحیح عقیدے کی دعوت دے اوراس کی ترویج بھی کرے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ عقیدے کے اعتبار سے اشعری اور مسلک کے اعتبار سے شافعی تھے۔ عوام کے عقیدے کی ایسی فکر تھی کہ امام محمد بن ہبۃ المکی رحمۃ اللہ علیہ نے اشاعرہ کی تصریحات کے مطابق عقیدے پر ایک کتاب لکھی اوراس کا نام رکھا "حدائق الفصول و جواهر العقول" یہ کتاب صحیح عقیدے کی وضاحت میں لکھی گئی اور امام نے اسے نثر کی بجائے نظم میں تحریر فرمایا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ نظم پیش کی گئی تو انہوں نے ملاحظہ فرمایا۔ نہایت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ پوری مملکت کے مدارس میں اس نظم کو داخل نصاب کیا جائے۔ بچے اسے یاد کریں تا کہ ان کا عقیدہ صحیح اور پختہ ہو۔ سوا سو برس قبل یہ مصر سے چھپی تھی اور اب نایاب ہے۔ کتاب کیا ہے، رسالہ ہے لیکن حضرات اہل السنۃ والجماعۃ (اشاعرہ) کے عقائد کی خوب ترجمانی کی گئی ہے۔

معتزلہ کے وضع کردہ پانچ بنیادی اُصول اوران کا انہی سے انحراف.

(فرمایا) تمام معتزلہ اوران کا پورا اعتزال، خود انہی کے وضع کردہ پانچ اصولوں پر مشتمل ہے۔

① التوحید: توحید اگر چہ ہر مسلمان مانتا ہے اوراس کے بغیر ایمان ہی درست نہیں ہوتا لیکن معتزلہ توحید میں اتنا مبالغہ کرنے لگے کہ صفات باری تعالیٰ تک میں اعتدال سے
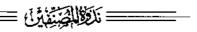
ہٹ کر گمراہی کی راہ اختیار کی۔

② عدل: یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے بغیر دین ہی قائم نہیں ہوتا لیکن انہوں نے عدل میں اتنا مبالغہ کیا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت مغفرت اور صفت رحمت سے صرف نظر کرلیا۔

③ وعد و وعید: یہ مسئلہ اگرچہ حق ہے اور امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں اس مسئلے پر بحث کی ہے لیکن معتزلہ نے یہاں بھی اپنے کو ''اہل السنۃ والجماعۃ'' کی راہ سے الگ کرلیا۔

④ المنزلة بين المنزلتين: یہ مسئلہ بھی بہت واضح تھا جو شخص بھی اسلام سے خارج ہوا، کفر میں داخل ہوگیا لیکن معتزلہ نے مرتکب کبیرہ کے متعلق یہ دعویٰ کیا کہ نہ وہ شخص مطلقاً مومن ہے اور نہ مطلقاً کافر ہے بلکہ دونوں کے درمیان کی منزل میں ہے۔

⑤ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر: یہ اسلام کی اساس ہے لیکن انہوں نے تشدد کی راہ اپنائی اور اپنے معاصرین محدثین کو نہ صرف گمراہ قرار دیا بلکہ تشدد سے بھی باز نہ رہے۔

جس شخص نے بھی معتزلہ اور اعتزال کو سمجھنا ہو وہ ان پانچ اصولوں پر ان کے موقف کو غور سے پڑھ لے تو نہ صرف یہ سمجھ جائے گا کہ معتزلہ کیا ہیں بلکہ اسے بخوبی معلوم ہو سکے گا کہ اہل تشیع نے اپنے عقائد درحقیقت کہاں سے لیے ہیں۔ اہل تشیع جو جادو کا انکار کرتے ہیں، رویت باری تعالیٰ کو نہیں مانتے، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر طعن و تشنیع کرتے ہیں اور توحید اور عدل کی دعوت دیتے ہیں تو ان کا اصل مقصد کیا ہے اور یہ نظریات کہاں سے اخذ کیے گئے ہیں؟

۱۳۱۶ھ میں شریعت مدار مولوی سید علی الحائری لاہوری نے ''منہاج السلامہ'' کے نام سے شیعہ عقائد پر، کتاب لکھی تھی اور وہ کتاب اسی وقت لاہور میں مطبع اسلامیہ پریس میں
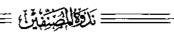
مولوی کرم بخش صاحب کی حسن عنایت سے چھپ بھی گئی تھی، انہوں نے اس کتاب میں توحید، عدل اور شیعہ عقائد وغیرہ کو بہت آسان زبان میں لکھا ہے، اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے عقائد اور معتزلہ کے عقائد میں کیا اتفاق اور کیا اختلاف ہے۔اس کتاب کی فوٹو کاپی ہمارے ہاں کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے اور معتزلہ کے جن پانچ اصولوں کا ابتداء میں ذکر کیا گیا ہے، ان کا بھی اگر تفصیلی مطالعہ کرنا ہو تو محمود بن محمد الملاحمی الخوارزمی کی کتاب ''کتاب الفائق فی اصول الدین'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔یہ کتاب بھی اپنے ہاں کے ذخیرے میں محفوظ ہے اور اس کے مصنف رکن الدین محمود الاصولی بن عبید اللہ الملاحمی الخوارزمی المتوفی ۵۳۶ ھ قاضی عبد الجبار معتزلی کے اس مدرسے کے مدرس تھے جس مدرسے کی بنیاد علاّف، جعفر بن حرب، جبّائی کبیر، جبّائی صغیر، ابو علی بن خلاد اور ابو ہاشم شیشدیو، جیسے اکابر معتزلہ کے افکار و نظریات پر تھی۔یہ محمود الملاحمی معتزلہ کے بارہویں طبقہ سے تعلق رکھتا تھا اور ابو عمرو قاشانی، ابو محمد خوارزمی، ابو رشید سعید نیشاپوری وغیرہ کے ہم پلہ معتزلی تھا۔

حنفیہ کثر اللہ سوادھم کے نزدیک خلافت راشدہ کا انکار.

فرمایا حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی خلافت راشدہ اگرچہ قطعی طور پر کتاب وسنت سے ثابت ہے لیکن اگر کوئی شخص ان حضرات کی خلافت کا راشدہ ہونے سے انکار کردے تو فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کے نزدیک وہ کافر نہیں ہوگا کیونکہ وہ ضروریات دین جو کافر کو دائرۂ اسلام میں داخل کرتی ہیں ان کا انکار ہی اسے اسلام سے خارج کرے گا ہر ایک

قطعی چیز کا اقرار نہ تو کافر کو اسلام میں داخل کرتا ہے اور نہ ہی ہر ایک قطعی چیز کا انکار مسلمان کو اسلام سے خارج کرتا ہے۔ مولانا احمد رضا خان صاحب کے والد مرحوم نے اس موضوع پر تفصیل سے ایک فتویٰ لکھا تھا جس کا تذکرہ "فتاویٰ رضویہ" میں بھی کیا گیا ہے۔

جن مشائخ کے اپنے عقائد ہی اہل السنۃ والجماعۃ کے مطابق نہ ہوں وہ دوسروں کی کیا رہنمائی کریں گے؟

(فرمایا) اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ نصیب فرمائے اور تمام عمر کوئی کشف، صحیح خواب، وجد، الہام، کچھ بھی نہ ملے، صرف یہ عقیدہ اور اتباع سنت کی دولت ملے تو اسے سب کچھ ملا۔ تمام کائنات سے بڑی دولت ملی۔ کونین عطا فرمائے تو ان دونوں نعمتوں کے مقابلے میں اس کی کچھ حقیقت نہیں اور اگر یہ دو نعمتیں نہ ملیں تو ہر شب اپنے کو عرش معلیٰ کا طواف کرتے دیکھے اور ہر دن حضرت رسالت پناہ ﷺ کی زیارت بھی خواب میں ہوتی رہے تو بھی خسارے میں رہا۔ برباد ہوا اور جہنم کا کندہ بنا۔ حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے از اکابرین سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ رحمہم اللہ نے کیا خوب فرمایا:

اگر احوال و مواجید را بما دہند و حقیقت ما را باعتقاد اہل سنت و جماعت ننوازند جز خرابی ہیچ نمید انیم و اعتقاد اہل سنت و جماعت را بدہند و از احوال ہیچ ندہند غم نداریم۔

ترجمہ: (اللہ تعالیٰ اگر تصوف کے تمام احوال و وجد وغیرہ تمام دولتیں بخشے اور ہمارا عقیدہ اہل السنۃ والجماعۃ کے مطابق نصیب نہ فرمائے تو سوائے بربادی
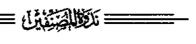
کے کچھ حاصل نہ ہوا۔اور اگر صرف عقیدہ اہل السنۃ والجماعۃ کا عطا فرمادیں اور تصوف کے احوال اور وجد وغیرہ کچھ نہ عطا ہو تو کوئی غم نہیں۔)

اس لیے جن مشائخ کے عقائد ہی اہل السنۃ والجماعت کے مطابق نہ ہوں، وہ خود ہی گمراہ ہیں، کسی اور کی رہنمائی کیا کریں گے؟

شفاعت، برحق اور اسے ماننا صحیح عقیدے میں شامل ہے.

فرمایا ہمارا عقیدہ ہے کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ روز محشر اللہ تعالیٰ کی اجازت اور اس کی خوشی کے مطابق اپنی امت کے نیک و بد، ہر شخص کی مدد فرمائیں گے۔ان کی اسی مدد اور سفارش کا نام ''شفاعت'' ہے اور اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک ''شفاعت'' برحق اور اسے ماننا، صحیح عقیدے میں شامل ہے۔اللہ تعالیٰ کا کلام شفاعت کرے گا، حضرات انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے لیے شفاعت کریں گے۔فرشتے شفاعت کریں گے، علمائے راسخین اور حضرات اولیاء کرام رحمہم اللہ شفاعت کریں گے۔ حُفّاظ شفاعت کریں گے۔ جو لوگ حساب و کتاب سے فارغ ہو کر جنت جا رہے ہوں گے، وہ شفاعت کریں گے۔والدین اور اولاد ایک دوسرے کی شفاعت کریں گے حتیٰ کہ وہ بچہ جو ولادت سے پہلے ہی انتقال کر گیا تھا، اپنے والدین کی شفاعت کرے گا اس لیے شفاعت سے انکار کرنا گمراہی ہے۔اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ عقیدہ کتاب وسنت کی واضح نصوص سے ثابت ہے۔اللہ تعالیٰ ان تمام شفاعت کرنے والوں کو اجازت مرحمت فرمائیں گے اور خوش ہوں گے کہ آج کے دن ان گنہگاروں کو جہنم سے بچانے کے لیے ان کی مدد کرو، تو اللہ تعالیٰ کی خوشی اور

اجازت کے بعد ہی یہ شفاعت یا مدد ہوگی۔

شفاعت کبریٰ تو حضرت رسالت پناہ ﷺ ہی کا خصوصی مرتبہ اور مقام ہے۔

فرمایا جن احادیث میں اس طرح کے جملے آئے ہیں کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے اپنے اہل خانہ اور اپنے قبیلے کے افراد سے یہ ارشاد فرمایا کہ وہ قیامت میں ان کے کام نہیں آئیں گے تو اس سے مراد شفاعت کی نفی نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اگر اس دن تم لوگ، ایمان ساتھ لے کر نہ آئے اور کافروں کے گروہ میں شامل ہوئے تو پھر میں تمھاری مدد نہیں کرسکوں گا کیونکہ شرعی کافر کے لیے کوئی شفاعت کلی طور پر کام نہ آئے گی البتہ جزوی طور پر ایسے کام آسکتی ہے کہ کسی کافر کے عذاب میں تخفیف کردی جائے جیسا کہ آگ کے جوتے پہنانے کا صحیح حدیث میں آیا ہے۔

حضرت رسالت پناہ ﷺ کی یہ مدد یا شفاعت ان کے لیے تو ہوگی ہی جو اس امت کے مسلمان افراد تھے اور کبیرہ گناہوں سے توبہ کیے بغیر دنیا سے رخصت ہوگئے یا توبہ، تو کی لیکن اللہ تعالیٰ نے قبول نہیں فرمائی تھی، تو اب شفاعت سے بخشے جائیں گے، یہ شفاعت مبارکہ ان لوگوں کے لیے بھی ہوگی اور انھیں بھی نفع پہنچائے گی جو نیکوکار اور صالح و متقی افراد تھے چنانچہ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے متعلق حدیث میں آتا ہے کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ ان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں بارگاہ خداوندی میں لے جائیں گے اور عرض کریں گے کہ یہ انس بن مالک ہیں، میری بہت خدمت کی ہے ان کو جنت میں داخلے کا پروانہ عطا ہو۔ حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ تو ویسے بھی جنتی ہی تھے یہ ایک خاص اعزاز ہوگا کہ

غلام کا ہاتھ اپنے آقا و مولیٰ، حضرت سید الکونین، رسالت مآب ﷺ کے ہاتھ میں ہوگا۔

حضرت رسالت پناہ ﷺ کی یہ مدد ان لوگوں کو بھی ان شاء اللہ پہنچے گی جو اس دن آپ سے ہاتھ بٹانے کی درخواست کریں گے۔ حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ عیسائی پادری تھے اور ''قدس'' کے گرجے میں رہتے تھے جب حضرت رسالت پناہ ﷺ کی خبر ملی تو ایک بہت پُر مشقت سفر کر کے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور اسلام قبول کیا۔ اور عرض کیا کہ مجھے کچھ عطا فرما دیں۔ حضرت رسالت مآب ﷺ کا جود و سخا اپنے تموج میں تھا ارشاد فرمایا کہ ''قدس'' کا پورا علاقہ تمیم کو دے دو۔ یہ علاقہ اس کا اور اس کی اولاد کا ہے۔ ان کے چچازاد بھائی حضرت سیدنا عبد الجبار بن حارث رضی اللہ عنہ بھی مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے حسب معمول نام دریافت فرمایا تو انہوں نے عرض کیا ''جبار'' ارشاد فرمایا نہیں، یوں کہیے کہ عبد الجبار، اسلام قبول کیا اور بیعت ہوئی۔ عرض کیا گیا کہ عبد الجبار بہت اچھے گھڑ سوار ہیں۔ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے گھوڑا منگوایا، انھیں سوار کرایا۔ کچھ عرصہ ان کا قیام ہوا مختلف غزوات میں شرکت بھی کی اور چونکہ خود ماہر گھڑ سوار تھے اس لیے گھوڑوں کی خاص نگرانی کرتے رہے۔ گھوڑے اپنی جنسی خواہش کے اظہار کے لیے اور بعض دیگر وجوہ کی بنا پر بھی ہنہناتے ہیں اور ایک مرتبہ ان کا ہنہنانا بند ہوگیا۔ جب کئی دن تک حضرت رسالت مآب ﷺ نے ہنہنانا نہیں سنا تو حضرت عبد الجبار رضی اللہ عنہ کو طلب فرمایا اور وجہ دریافت کی۔ انہوں نے عرض کیا کہ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ان گھوڑوں کی آواز سے آپ کو (نیند وغیرہ) میں دِقّت محسوس ہوتی ہے اس لیے میں نے ان کی جنسی خواہشات ختم کرنے کے لیے انھیں خصّی کر دیا ہے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے

آئندہ گھوڑوں کو اس عمل سے گذارنا منع فرما دیا۔

حضرت عبدالجبار رضی اللہ عنہ سے کسی شخص نے کہا کہ آپ کے چچازاد بھائی حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ نے جیسے حضرت رسالت پناہ ﷺ سے ''قدس شہر'' تحفے میں لیا تھا آپ بھی کوئی درخواست دے دیں۔ تو فرمانے لگے کیا مانگوں، کیا کوئی ایسی چیز جو مجھے دنیا میں نفع دے؟ یا پھر کوئی ایسی بات جو آخرت میں نفع دے؟ مشورہ یہ ملا کہ وہ چیز مانگنی چاہیے جو آج بھی کام آئے تو حضرت عبدالجبار رضی اللہ عنہ نے فرمایا چاہتا تو میں بھی یہی ہوں کہ جلدی سے کچھ مانگ لوں لیکن میں نے حضرت رسالت پناہ ﷺ سے درخواست کی ہے کہ روز محشر جب اللہ تعالیٰ کے حضور پیشی ہو، اس وقت میری مدد فرمائیں۔

اب یہ جو قیامت میں مدد کے لیے عرض کیا گیا یہ کیا ہے؟ یہ شفاعت یا مدد ہی تو ہے، جو حضرت رسالت مآب ﷺ قیامت میں کریں گے۔ شفاعت صغریٰ تو بہت سے کریں گے لیکن شفاعت کبریٰ تو حضرت رسالت پناہ ﷺ ہی کا خصوصی مرتبہ اور مقام ہے اور اہل السنہ والجماعۃ کا عقیدہ شفاعت یہی ہے۔ رزقنا اللّٰہ سبحانہ و تعالیٰ بمنہ و بکرمہ.
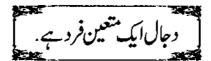
دجال ایک متعین فرد ہے.

فرمایا حضرت رسالت مآب ﷺ نے دجال کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اور صحیح سند سے جو کچھ ہم تک پہنچا ہے، اس کے مطابق، ہم اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ دجال ایک متعین فرد ہے، جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان لے گا۔ اس شخص، دجال کو غیر معمولی طاقت اور قدرت دی جائے گی اور وہ اس شخص کو بھی

زندہ کر سکے گا جسے اس نے قتل کیا ہوگا۔ زمین کے خزانوں پر اسے دسترس حاصل ہوگی اور وہ خشک زمینوں پر بارش بھی برسا سکے گا۔ اس کی یہ حرکتیں ہی لوگوں کا امتحان ہوں گی۔ وہ پہلے نبوت کا اور پھر خدائی کا دعویٰ کرے گا اور اس کے یہی کام دیکھ کر لوگ اسے خدا مانیں گے حتیٰ کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسے قتل کریں گے۔ کچھ گمراہ فرقوں خوارج، معتزلہ اور جہمیہ نے دجال کا وجود ماننے سے ہی انکار کر دیا اور صحیح احادیث، جو دجال کے بارے میں کتب احادیث میں آئی ہیں، ان کے منکر ہوئے اور اس وجہ سے بھی ان فرقوں کو گمراہ قرار دیا گیا۔

معتزلہ میں سے ابوعلی جبائی نے البتہ بعض احادیث کا اقرار کر کے اگرچہ دجال کو ایک حقیقت قرار دیا ہے لیکن پھر بھی بہت سی احادیث اور تفصیلات کا انکار کر کے اپنی گمراہی کو بھی ثابت کیا ہے۔

کیا آخرت میں اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی؟

(فرمایا) ہم اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ عقیدہ ہے کہ آخرت میں اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کی زیارت نصیب ہوگی۔ اور وہ وقت جب وہ اپنے پروردگار کو دیکھیں گے، انتہائی مبارک اور خوشی کا وقت ہوگا۔ جب کہ کافر اپنے پروردگار کی زیارت سے محروم رہیں گے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے پردے میں ہوں گے اور اس نعمت عظمیٰ سے محروم رہیں گے۔ خوارج، معتزلہ، روافض اور مرجئہ میں سے بھی ان کے بعض آئمہ، ان سب نے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت کا انکار کیا ہے اور ان کی گمراہی کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کے "امّی" ہونے کی وضاحت.

(فرمایا) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت رسالت مآب ﷺ کو "امّی" فرمایا ہے اور اس مقام پر "امّی" سے مراد ہرگز ہرگز اَن پڑھ، جاہل اور غافل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص حضرت رسالت مآب ﷺ کے متعلق یہ کہے گا تو اس کا ایمان ہی جاتا رہے گا۔ حضرت رسالت پناہ ﷺ کا ادب، ان کا احترام، ان کے لیے ہمیشہ بلند پایہ الفاظ کا استعمال، ان کا ذکر جمیل اور ان کی تعریف وتوصیف ایمان کی اصل اور اس کی بقاء وشادابی کی علامات ہیں۔

"امّی" کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ "مکہ مکرمہ" کا رہنے والا۔ مکہ مکرمہ کا یک نام "اُم القریٰ" بھی ہے۔ قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ نے دو مقامات پر مکہ مکرمہ کو "اُم القریٰ" فرمایا ہے تو اس نسبت سے ہر وہ شخص جو "اُم القریٰ" (مکہ مکرمہ) کا رہنے والا ہے وہ امّی بمعنی مکی ہے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ بھی چونکہ ام القریٰ (مکہ مکرمہ) کے رہائشی تھے اس لیے انھیں "امّی"، یعنی بمعنی "مکی" ارشاد فرمایا گیا۔

یا پھر انھیں اس لیے "امّی" فرمایا گیا کہ عربی میں "اُمّ" ہر اس چیز یا شخص کو کہا جاتا ہے جو کسی دوسری چیز یا شخص کی تربیت کر سکے۔ ماں کو بھی اسی لیے "اُمّ" کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کے وجود میں آنے کا سبب یا اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کا سبب بنتی ہے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ اپنی بعثت مبارکہ کے بعد پوری کائنات کے لوگوں کی تربیت کا سبب ہیں۔ لوگ اگر ان کی تعلیمات کے مطابق تعلیم وتربیت حاصل کریں

گے تو فلاح پائیں گے اس لیے انھیں ''اُمّی'' بمعنی مصلح و مربی فرمایا گیا۔

یا پھر یہ کہ عربی میں ''الاُمّ'' کے معنی ہیں صحیح طور پر، کسی بھی طرف جھکے بغیر، ٹھیک اپنے مقصد کی طرف متوجہ رہنا۔ چونکہ حضرت رسالت مآب ﷺ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ فطرت اور صحیح راہ سے کبھی بھی دائیں بائیں نہیں ہوئے بلکہ ہمہ تن متوجہ الی اللہ رہے اس لیے وہ ''اُمّی'' قرار پائے۔

باقی ''اُمِّیَّۃ'' سے جو مراد جہالت یا غفلت ہے تو وہ عام عوام کے لیے ہے کہ انھیں معرفت باری تعالیٰ حاصل نہیں ہوتی۔ اُمتیں اس معنی میں کر کے اُمّی (جاہل اور غافل) ہوا کرتی ہیں اور ان کی طرف مبعوث شدہ حضرات انبیاء علیہم السلام انھیں علم و معرفت سے روشناس کراتے ہیں نہ یہ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اُمّی (جاہل اور غافل) ہوتے ہیں۔ معاذاللہ. اس لیے جو لوگ خود جاہل ہوتے ہیں اور اپنی جہالت کو چھپانے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ ہم اُمّی نبی کے اُمّی اُمتی ہیں تو انھیں سوچنا چاہیے کہ نبی اور امتی کی ''اُمّیت'' میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر ان دونوں کو ایک ہی معنی میں لیا جائے گا تو حضرات انبیاء علیہم السلام کی توہین لازم آئے گی۔

کیا بروز قیامت، ہر مومن کے اعمال کا وزن ہوگا؟

(فرمایا) قیامت میں مومن کے اعمال کا وزن کیا جائے گا یا اس کے اعمال تولے جائیں گے۔ جن کی نیکیاں زیادہ ہوں گی اللہ تعالیٰ کا فضل ان کے شاملِ حال ہوگا اور وہ جنت بھیج دیے جائیں گے اور جن کی برائیاں زیادہ ہوں گی وہ یا تو جہنم روانہ کیے
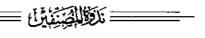
جائیں گے اور یا پھر اللہ تعالیٰ کا فضل، اس کی طرف سے معافی یا شفاعت ان کے کام آئے گی اور وہ بھی جنت میں داخلے کے مستحق ٹھہریں گے۔ جن لوگوں کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں گے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنت بھیج دیے جائیں گے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر مومن کے اعمال کا وزن ہو۔ آئمہ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ عقیدہ ہے۔

حضرت رسالت پناہ ﷺ نے بعض لوگوں کے متعلق یہ ارشاد فرمایا ہے کہ وہ لوگ بغیر کسی حساب و کتاب کے جنت میں داخل کر دیے جائیں گے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کے اعمال کا وزن نہیں کیا جائے گا اور یہ اہل السنۃ والجماعۃ کے آئمہ کی دلیل ہے کہ ہر مومن کے اعمال کا وزن نہیں ہوگا۔ اللّٰھم اجعلنا منھم.

جہنم موحدین سے خالی ہوجائے گی کہ کافروں سے؟ ایک شبہے کا جواب.

فرمایا بعض لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم پر ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس میں کوئی کافر بھی باقی نہیں رہے گا۔ جہنم کے دروازے ہواؤں کے چلنے سے بجتے رہیں گے اور وہاں پر کوئی نہیں ہوگا۔ ہمارے دور میں اس عقیدے کا پرچار زیادہ تر وہ لوگ کررہے ہیں جو یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ تمام دین یہودیت، عیسائیت، اسلام، بدھ مت، ہندومت وغیرہ ایک ہی ہیں اور کوئی بھی مذہب مانو بالآخر نجات پا جاؤ گے اور یا پھر اس عقیدے کے قائل وہ ہیں جو ختمِ نبوت کا انکار کرتے ہیں یعنی قادیانی، کہ وہ ختم نبوت کی تاویل کرتے ہیں اور بہر حال اجرائے نبوت کے قائل ہیں۔

ایک تیسرا گروہ کچھ اہل علم کا بھی رہا ہے جنہوں نے اپنی کتابوں میں ایسی آراء کا ذکر کیا

ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہم کے بعض اقوال سے اس عقیدے کو مضبوط کرنا چاہا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلک اور عقیدہ بالکل ردّی اور بے کار ہے۔نہایت گمراہ کن ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ نے اس عقیدے کو مردود قرار دیا ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے مسلک کی وضاحت کی ہے کہ ان حضرات کا فرمانا یہ تھا کہ جہنم پر ایک ایسا وقت آئے گا جب اس میں کوئی مومن باقی نہیں رہے گا۔یعنی کوئی شخص کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو اگر اس کی موت ایمان پر واقع ہوئی ہے تو یقیناً جہنم پر ایک ایسا دور آئے گا، جب ایسے تمام موحدین اس سے نکال لیے جائیں گے اور انھیں جنت بھیج دیا جائے گا۔سو جہنم ایسے موحدین سے خالی ہو جائے گی۔نہ یہ کہ جہنم کبھی کافروں سے خالی ہو جائے گی۔اور یہی اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے۔

جب خلافت راشدہ کی توہین برسرِ منبر کی جانے لگے
تو صحیح عقیدے کا تحفظ اور تشہیر ضرور کرنی چاہیے.
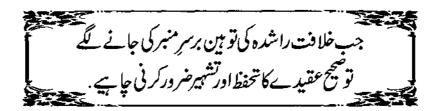
فرمایا ہمارا عقیدہ ہے کہ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ خلیفہ راشد تھے۔ان کے دور میں جنگِ جَمَل اور جنگِ صِفّین ہوئیں اور وہ ہر اعتبار سے حق پر تھے۔ان کا مؤقف بالکل درست تھا اور ان کے بالمقابل جتنے بھی صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم آئے خواہ وہ اُم المومنین حضرت عائشہ، طلحہ، زبیر اور امیر شام سیدنا معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہم جیسی ہستیاں ہی کیوں نہ ہوں، ان سب سے اجتہادی خطا ہوئی ان کا مؤقف درست نہیں تھا اور

امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے دور سے لے کر آج تک اہل حق، اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہی رہا ہے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جس صحابی رضی اللہ عنہ کو سب سے زیادہ ان واقعات، آزمائشوں اور فتنوں کی خبر دی تھی، جو اس اُمت کو پیش آئیں گے اور ان میں حق پر کون ہوگا اور ان سے زیادہ کسی اور سے ایسی راز کی باتیں ارشاد نہیں فرمائی تھیں، وہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ لوگوں کی نصیحت فرماتے تھے کہ دیکھو سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہنا انہی کا گروہ حق پر ہوگا۔ اور پھر حضرت عمار رضی اللہ عنہ کی شہادت نے تو بالکل فیصلہ ہی کر دیا کہ خلافت راشدہ بالکل درست ہے اور ان کے خلاف خروج درست نہیں۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے اپنی شہادت سے پہلے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص یہ چاہے کہ اسے جنت میں حورِ عین ملے اسے چاہیے کہ وہ آج صفین کے میدان میں آئے اور شام والوں کا احتساب کرے۔ لیکن خلافت راشدہ کے برحق ہونے اور امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مؤقف کے ہر طرح سے درست ہونے کے باوجود کسی بھی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان کے خلاف دوسرے گروہ کے صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کی توہین کرے۔ اسے چاہیے کہ ان حضرات کے معاملے میں بھی خدا سے ڈرے، البتہ عقیدہ وہی ہونا چاہیے جو کہ تمام امت کا رہا ہے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو وہ رویہ رہنا چاہیے جو حافظ الحدیث حضرت ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ جس شخص نے بھی علم حدیث پر محنت کی ہے وہ جانتا ہے کہ حضرت ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ محدثین میں کیا مقام رکھتے تھے۔ اپنے دور میں یہ ''امیر المومنین فی الحدیث'' کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے ان کے پاس ایک آدمی آیا اور کہنے لگا کہ مجھے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ
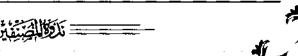
سے نفرت ہے۔ انہوں نے وجہ دریافت فرمائی تو وہ کہنے لگا اس لیے کہ انہوں نے بغیر کسی دلیل کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جنگ کی۔ تو حضرت ابوزرعہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسے سمجھاتے ہوئے فرمایا دیکھو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا پروردگار بہت رحیم ہے اور ان کے فریق مخالف سیدنا علی رضی اللہ عنہ بہت کریم تھے۔ تو رحیم اور کریم کے درمیان تم دخل دینے والے کون ہوتے ہو؟

مطلب یہ تھا کہ بلاضرورت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلافات کو زیر بحث نہیں لانا چاہیے لیکن اگر آج کے دور جیسا زمانہ آجائے اور خلافتِ راشدہ کی توہین برسرِ منبر کی جانے لگے تو پھر اہل السنۃ والجماعۃ کو اپنے عقیدے کا تحفظ اور تشہیر کرنی چاہیے۔

قیامت سے قبل بے شمار جھوٹوں سے اُمت کا واسطہ پڑے گا.

فرمایا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خبر دی کہ ان کی امت میں تیس ایسے افراد ہوں گے جو نبوت کا دعویٰ کریں گے۔ وہ تمام کے تمام انتہائی جھوٹے اور پرلے درجے کے فریبی بھی ہوں گے۔ اور ان تیس میں سے ستائیس مرد ہوں گے اور چار خواتین۔ اس اعتبار سے یہ تعداد اکتیس ہو جاتی ہے۔ پھر ایک اور روایت میں آتا ہے کہ ایسے افراد کی تعداد ستر ہوگی۔ اب ستر سے یا تو یہ مراد ہے کہ ان گمراہ قائدین کی تعداد ستر ہوگی یعنی عدد شمار فرمایا اور یا پھر یہ مراد ہوگی کہ بے شمار افراد ہوں گے۔ ستر کا عدد تکثیر کے لیے استعمال کیا گیا اور اگر یہی مراد لے لی جائے تو تیس اور اکتیس جھوٹے دعویداروں کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے کہ ان گمراہ قائدین میں تیس تو ایسے ہوں گے جو دعویٰ

نبوت کریں گے اور وہ جھوٹے ہوں گے اور باقی بے شمار ایسے گمراہ لوگ اٹھیں گے جو دعویٰ نبوت تو نہیں کریں گے لیکن ان کے عقیدے گمراہی پر مشتمل ہوں گے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ نے جن عقائد کو دین کی بنیاد ارشاد فرمایا اور اُمت جن عقائد پر ہمیشہ متفق رہی اور نسل در نسل ان عقائد کی حفاظت کی جاتی ہے، ان عقائد سے یہ گمراہ قائدین اور داعیین انحراف کریں گے۔ گمراہی کی دعوت دیں گے اپنی جماعتیں تشکیل دیں گے اور عام عوام کو گمراہیوں میں مبتلا کریں گے۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن کواء کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ وہ جو ستر گمراہ ہوں گے، تم بھی ان میں ہو۔ اور امر واقع یہ ہے کہ اس نے نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا لیکن خوارج میں چلا گیا۔ خوارج کے پہلے امیر عبداللہ بن وہب المراسبی کے ہاتھ پر سب سے پہلے اسی نے بیعت کی۔ پھر اس نے بارہ ہزار خارجیوں کو جمع کر کے امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت بھی کی اور ان کی تکفیر بھی کی۔ ایک انہی کو کیا، اس ظالم نے تو بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کافر کہا اور کوفہ کے قریب ''حروراء'' کے مقام پر ''یوم النہروان'' میں امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج کے ہاتھوں مارا گیا۔ حضرت حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری میں عبداللہ بن الکواء کو غلاۃ روافض میں شمار کیا ہے۔ حیرت ہے کہ ان جیسے باخبر مؤرخ کی نظر اس معاملے میں کیسے چوک گئی حالانکہ یہ عبداللہ بن الکواء تو امرائے خوارج اور مکفرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھا۔

سو کہنے کا مقصد یہ کہ یہ ضروری نہیں کہ ہر گمراہ نبوت ہی کا دعویٰ کرے بلکہ اُمت میں بہت سے گمراہ قائدین ایسے ہیں اور ایسے ہوں گے جو دعویٰ نبوت تو نہیں کرتے لیکن
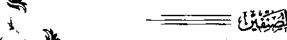
عقیدے کے اعتبار سے گمراہ اور گمراہی کی طرف دعوت دینے والے ہوتے ہیں۔
باطنی فدائی، روافض کے آئمہ، وحدۃ الوجود کے مسلک میں ایسے گمراہ صوفی جنہوں نے وجود کی وحدت کی بجائے موجودات کی وحدت کا گمراہ کن نظریہ پیش کیا، اللہ تعالیٰ کے حلول کے قائل، اسلامی حکومتوں کے خلاف بغاوت کرنے والے اور وہ تمام گروہ جن کے پاس حکومت کے ساتھ ٹکر لینے، حکومت کو تبدیل کرنے اور پہلے سے بہتر نظام لانے کے لیے نہ اسباب و وسائل موجود تھے، نہ نظام کا کوئی خاکہ ان کے پاس تھا اور نہ ہی حکومت بنا کر اسے سنبھالنے کے لیے کوئی اہل افراد کی جماعت موجود تھی اور ان شرائط کے مفقود ہونے کے باوجود انہوں نے حکومتوں سے ٹکر لے کر بے گناہ مگر جذباتی مسلمانوں کو شہید کروایا، مملکتوں میں قتل عام کیا، یہ تمام خوارج، یہ سب گمراہ افراد اور قائدین انہی ستر میں شامل ہیں جن کے متعلق حضرت رسالت مآب ﷺ نے فرمایا تھا کہ قیامت سے قبل ستر یعنی بے شمار جھوٹوں سے امت کا واسطہ پڑے گا۔
اس لیے ہمیشہ یہ دیکھنا چاہیے کہ قائد کا عقیدہ اہل السنۃ والجماعۃ کے مطابق ہے یا نہیں اور اگر عقیدہ درست ہے تو پھر اس کا علم مضبوط، وسیع اور ٹھوس یعنی راسخ فی العلم ہے یا نہیں، پھر وہ راسخ فی العلم بھی ہے تو اس نے خود کہیں رہ کر تربیت بھی حاصل کی ہے یا نہیں۔ تربیت حاصل کر کے وہ انسان بنا یا پھر خود کاشتہ پودا ہے ابھی تک اخلاقیات کی منازل اس نے طے نہیں کیں اور یہ بھی ہو جائے تو پھر وہ قیادت کا اہل ہے بھی یا نہیں پھر وہ اہل بھی ہو تو یہ تمام تحریک اور دعوت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے یا پھر اپنی ذات کی تشہیر یا کچھ اور عزائم ہیں۔ ان شرائط پر پورا اُترنے والا فرد قیادت کا اہل ہوتا ہے۔

روز قیامت کن کن کو منصب شفاعت پر فائز کیا جائے گا؟

فرمایا بہت سے گمراہ فرقوں نے قیامت میں شفاعت کے مسئلے کا انکار کیا ہے۔ خوارج، معتزلہ کے بعض فرقے اور دور جدید کے بعض نام نہاد مفکرین اسلام کی سوچ بھی یہی ہے۔ ان کے نزدیک حضرات انبیاء کرام علیہم السلام، علماء، اولیاء وشہداء رحمۃ اللہ علیہم کا شفاعت کرنا، قرآن کریم کا گنہگار لوگوں کی شفاعت کرنا، جلیل القدر فرشتوں کا شفاعت کرنا، جو بچے بچپن میں انتقال کر گئے یا کسی خاتون کا حمل ساقط ہو گیا اس بچے کی شفاعت، بیٹیوں کا اپنے والدین کی شفاعت اور خاص طور سے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کبریٰ، یہ سب بے کار باتیں ہیں۔ معاذ اللہ. حالانکہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کبریٰ سے بجز کسی ازلی شقی کے اور کون بے نیاز ہو سکتا ہے؟

ہم اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ جن جن صحیح احادیث میں شفاعت کا ذکر آیا ہے، ان کے مطابق قیامت میں یقیناً شفاعت ہوگی۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک پوری اُمت کا مسئلہ شفاعت پر اجماع بھی ہے اور معنوی اعتبار سے متواتر احادیث سے یہ مسئلہ ثابت بھی ہے اس لیے جو شخص بھی اس کا انکار کرے گا وہ بدعتی اور فاسق ہو جائے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر شفاعت ہے کیا چیز؟ لغوی معنی کے اعتبار سے ''شَفْعٌ'' عربی زبان میں ''طاق کو جفت'' کرنے کے معنی میں آتا ہے یعنی ایک عدد کو دو کر دینا۔ جیسے جڑواں بچے پیدا ہوں تو جو دوسرا بچہ ہے اسے ''شَافِعٌ'' کہیں گے کیونکہ

اس نے پہلے بچے کو جو تعداد میں ایک تھا، اپنی پیدائش سے دو کر دیا تو یہ طاق سے جفت ہو گیا۔ ''شَفْعَۃ'' ''دوگانہ''، ''نماز کی دو رکعتیں''۔ اسی وجہ سے عرف عام میں شفاعت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے علاوہ دوسرے کے لیے خیر یا اچھائی کا سوال کرنا یہاں بھی انسان چونکہ کسی دوسرے کے لیے خیر طلب کر کے، دوسرے کو شریک بنا رہا ہے اس لیے یہ شفاعت کہلائی اور شریعت کی اصطلاح میں شفاعت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی خیر اور اچھائی کا سوال یا سفارش کرنا جس کا نفع سفارش کرنے والے اور جس کے لیے سفارش کی جا رہی ہے، دونوں کو پہنچے۔

قیامت میں جتنے بھی شفاعت کرنے والے شفاعت یا سفارش کریں گے۔ اس سفارش کا نفع خود انھیں تو یہ ملے گا کہ ان کی عزت، احترام میں اضافہ اور ان کی وجاہت کا اظہار ہوگا اور جن لوگوں کو ان کی سفارش سے فائدہ پہنچے گا، اس کا فائدہ تو ظاہر ہی ہے۔

قرآن کریم میں جتنی بھی آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن کسی کو کسی کی سفارش نفع نہیں پہنچائے گی تو ان آیات سے سفارش کے فائدے کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ یہ تمام آیات کافروں کے متعلق ہیں۔ ان کے پاس تو ایمان ہی نہیں ہوگا اس لیے انہیں سفارش نفع بھی نہیں دے گی اور جن لوگوں کے پاس ایمان ہوگا یہ آیات ان لوگوں کے متعلق نہیں ہیں۔ ایمان کی وجہ سے سفارش کرنے والوں کی سفارش انھیں نفع دے گی۔

سفارش صرف ان لوگوں کی ہوگی جن کی موت ایمان پر واقع ہوئی۔ مرتے وقت وہ

مسلمان تو تھے لیکن سخت گنہگار تھے۔ دوسرے اللہ تعالیٰ خود بھی یہ چاہے گا کہ انھیں معاف فرمادے اس لیے اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر کسی کی مجال نہیں کہ کوئی کسی کی سفارش کر سکے اور تیسرے اللہ تعالیٰ خود جس جس کو سفارش کی اجازت دے گا بس وہی سفارش کر سکیں گے۔ تو شفاعت کے لیے تین امور ضروری ہیں۔

① جس کی شفاعت کی جائے گی اس کا مسلمان ہونا۔

② اللہ تعالیٰ کی اپنی خوشی کہ وہ اس گنہگار کو بخشنا چاہے گا۔

③ اللہ تعالیٰ کا کسی کو سفارش کی اجازت دینا۔

اللہ تعالیٰ جن کو بھی شفاعت کی اجازت دے گا۔ قیامت میں پوری دنیا پر یہ ظاہر کر دے گا کہ دیکھو اس سفارش کرنے والے کی میری نگاہ میں یہ قدر و قیمت ہے کہ آج ان کی سفارش قبول کی جارہی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ کسی بھی سفارش کرنے والے کو یہ آزادی نہیں ہوگی کہ وہ جس کے لیے خود چاہے سفارش کردے بلکہ وہ صرف انہی گنہگاروں کی سفارش کر سکے گا جن کی اجازت اللہ تعالیٰ مرحمت فرمائیں گے اور سفارش کرنے والے کو یہ آزادی بھی نہیں ہوگی کہ وہ جس کو چاہے اس کے گناہ معاف کروادے یہاں بھی مطلقاً مالک ومختار اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے، وہ خود جس کے بارے میں یہ چاہے گا کہ ان گنہگاروں کی خطاؤں کو معاف کرے، تو کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی اجازت اور خوشی کے بغیر کسی سفارش کرنے والے کو سرے سے یہ اجازت ہی نہیں ہوگی کہ وہ سفارش کرے۔ اسی لیے حضرت رسالت مآب ﷺ نے بھی یہ فرمایا کہ سفارش کے متعلق بھی میرے لیے
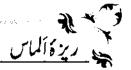
پابندی لگائی جائے گی کہ آپ صرف اس حد تک گنہگاروں کی شفاعت کر سکتے ہیں۔
حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت ابو عبیدہ بن جراح، معاذ بن جبل، ابو موسیٰ اشعری، ابوطلحہ انصاری اور عوف بن مالک رضی اللہ عنہم وغیرہ سے یہ بات بالکل ثابت ہے کہ یہ تمام حضرات حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کی رغبت اور اس کے لیے دعا مانگتے تھے، اس نعمتِ کبریٰ کے متمنّی تھے اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک شخص بھی ایسا ثابت نہیں کیا جا سکتا جو شفاعت کا انکار کرتا ہو۔ انہوں نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد گرامی سن رکھا تھا کہ اس اُمت کے کبیرہ گناہوں پر اصرار کرنے والے شفاعت کی وجہ سے جہنم سے نکال دیے جائیں گے۔

حضرت عبید بن عمیر رحمۃ اللہ علیہ جو کہ تابعی ہیں، حدیث شفاعت بیان کر رہے تھے تو ایک خارجی، ابو موسیٰ ہارون، جو شفاعت کا منکر تھا، اُٹھ کھڑا ہوا اور ناراض ہو کر کہنے لگا حضرت آپ یہ کیا حدیث بیان کر رہے ہیں؟
تو انہوں نے فرمایا اگر اس حدیثِ شفاعت کو میں نے تیس (30) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نہ سنا ہوتا تو ہرگز یہ روایت بیان نہ کرتا۔ خوارج بدعتی تھے اور شفاعت کا انکار کرتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کے انکار کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور انھیں گمراہ کہتے تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ تو صاف کہتے تھے کہ جو شخص بھی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا انکار کرتا ہے، قیامت میں اسے شفاعت میں سے حصہ نہیں ملے گا اور امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے خطبے میں یہ بات ارشاد فرمائی کہ لوگو دیکھو اس اُمت میں ایسے لوگ بھی آئیں گے۔

- جور جم کا انکار کریں گے۔
- دجال کو نہیں مانیں گے۔
- قبر کے عذاب کا انکار کریں گے۔
- شفاعت کا انکار کریں گے۔
- اس بات کا بھی انکار کریں گے کہ گنہگار مسلمان جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ جو خلیفۂ راشد اور جلیل القدر تابعی تھے، جب بنو اُمیہ کے ظالموں کو بد دعا دیتے تھے تو یہ فرماتے تھے کہ اس ظالم کو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت نصیب نہ ہو۔ اس لیے اب جو بھی شخص اس عقیدے سے انکار کرے گا تو وہ اُمت کے اس عقیدے سے ہٹ جائے گا جو قرونِ اولیٰ ہی میں طے ہو چکا تھا۔

اللّٰهم اجعلني ممن تناله شفاعة نبيه سيدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم.

اللہ تعالیٰ قیامت میں جب شفاعت کی اجازت دیں گے تو حضرت جبریل امین علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے، بعض گنہگاروں کی شفاعت کریں گے۔ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام بھی اپنی اپنی اُمتوں کی شفاعت کریں گے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے جس جس کو اجازت ہوگی وہ تمام حضرات شفاعت کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا کلام قرآن مجید بعض لوگوں کی شفاعت کرے گا۔ حضرت کعب بن احبار کی روایت کے مطابق تو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر ایک صحابیٔ رضی اللہ عنہ کو شفاعت کا اختیار دیا جائے گا۔ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو شفاعت کے لیے طلب کیا جائے گا، وہ شفاعت کریں گے۔

اس اُمت کے علماء کرام شفاعت کریں گے اور ہر ایک وہ عالم دین جو اللہ تعالیٰ کے ہاں عزت پائے گا اسے تین سو ایسے گنہگاروں کی شفاعت کی اجازت ملے گی جن کے لیے جہنم کا فیصلہ ہو چکا ہو گا۔ صدیقین کو بلایا جائے گا کہ وہ شفاعت کریں اور خلیفہٴ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے بڑھ کر کون صدیق ہو گا؟ اولیاء اللہ رحمہم اللہ کو شفاعت کی اجازت ملے گی۔ شہداء کرام کو بلایا جائے گا وہ بھی شفاعت کریں گے۔ عام مسلمانوں میں سے بچیوں کو حق ملے گا کہ اپنے ماں باپ کے بارے میں سفارش کریں۔ جن لوگوں نے معاشرے میں نیکی کے کام کیے ہوں گے انھیں بھی اختیار ملے گا اور سب سے بڑی شفاعت جسے شفاعتِ عظمیٰ یا شفاعتِ کبریٰ کہا جاتا ہے، وہ حضرت خاتم النبیین، شفیع المذنبین، سید الکونین حضرت رسالت مآب ﷺ کی شفاعت ہو گی۔ بعض اہل علم نے اسی شفاعت کو مقام محمود بھی کہا ہے اور حضرت رسالت مآب ﷺ کی یہ شفاعت کئی طرح کی اور بار بار ہو گی۔ مثلاً سب سے پہلے تو اس دن کی سختیاں ہوں گی۔ ظالموں پر خدا کا غضب برسے گا اور حساب و کتاب کا آغاز ہی نہیں ہو گا۔ لوگ مارے مارے پھریں گے اور حضرت آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کے پاس جائیں گے اور بالآخر حضرت رسالت مآب ﷺ کی شفاعت سے حساب شروع ہو گا۔ پھر حضرت رسالت مآب ﷺ کی شفاعت سے ہی بعض لوگ بغیر حساب و کتاب کے جنت میں بھیج دیئے جائیں گے۔ اگرچہ ان کی شفاعت کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے لیکن ایک مؤقف یہ بھی ہے کہ شفاعت یہاں بھی نفع دے گی۔ تیسری قسم کی شفاعت یہ ہو گی کہ جن لوگوں کو

حساب وکتاب کے بعد جہنم کا مستحق ٹھہرا دیا جائے گا انھیں شفاعت کا نفع ہوگا اور وہ بغیر عذاب کے ہی جنت میں بھیج دیے جائیں گے۔ پھر جو لوگ جہنم میں ڈال دیئے گئے تھے حضرت رسالت مآب ﷺ کی شفاعت ان کے کام آئے گی اور ایسے گنہگاروں کو جہنم سے چھٹکارا مل جائے گا۔ان میں وہ لوگ بھی ہوں گے جن کے اعضاء سجدہ ، پیشانی ، دونوں ہاتھ، دونوں گھٹنے ، دونوں پاؤں یعنی سات اعضاء پر نشانات پڑ گئے ہوں گے اور چونکہ سجدہ کرنے والوں کے سجدے کی جگہوں کو جہنم کی آگ جلائے گی نہیں اس لیے ان کی اسی پہچان سے انھیں شفاعت کے بعد جہنم سے نکال لیا جائے گا۔ یہ فائدہ ان لوگوں کے لیے ہے جو اگرچہ بہت گنہگار تھے لیکن نماز کی پابندی کرتے تھے، حضرت حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے والد علی بن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوبصورت اشعار میں، کیسی عمدہ دعا مانگی ہے۔

يَا رَبِّ أَعْضَاءَ السُّجُودِ عَتَقْتَهَا

مِنْ عَبْدِكَ الْجَانِيْ وَ أَنْتَ الْوَاقِي

وَالْعِتْقُ يَسْرِي بِالْغِنَىٰ يَا ذَا الْغِنَىٰ

فَامْنُنْ عَلَى الْفَانِي بِعِتْقِ الْبَاقِي

(ترجمہ) اے اللہ تو نے اپنے اس گنہگار بندے کے سات اعضاء (اعضائے سجدہ) کو تو جہنم کی آگ سے محفوظ فرما دیا اور درحقیقت محفوظ فرمانے والا تو ہی ہے۔اے بے نیاز ذات، بے پروا مالک کے لیے قصوروار غلام کو آزاد کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے۔اپنے اس فانی غلام پر احسان فرما
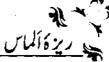
اور (ان سات اعضاء کی طرح) باقی جسم کو بھی جہنم سے محفوظ فرما دے۔

پانچویں قسم کے لوگ وہ ہوں گے جو جنت میں تو پہنچ جائیں گے لیکن حضرت رسالت مآب ﷺ کی شفاعت سے ان کے درجے بلند کر دیئے جائیں گے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ کی اس شفاعت کبریٰ سے کافر بھی محروم نہیں رہیں گے اور یہ آپ کی چھٹی قسم کی شفاعت ہوگی اور کافروں کے عذاب میں کمی کر دی جائے گی۔ ساتویں قسم کی آپ کی شفاعت اہل مدینہ کے لیے ہوگی اور اس میں وہ تمام لوگ شامل ہوں گے جنہوں نے مدینہ طیبہ میں رہنے میں جو تکالیف پیش آئیں صبر کیا۔ حضرت رسالت مآب ﷺ ان کے ایمان کی گواہی دیں گے اور ان کی سفارش فرمائیں گے۔ پھر اہل مکہ اور اس کے بعد طائف والوں کی شفاعت ہوگی۔

پھر آپ اپنے اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی شفاعت کریں گے، جس شخص کا رشتہ حضرت رسالت مآب ﷺ سے جتنے قریب کا ہوگا اسے اس شفاعت سے اتنا ہی نفع پہنچے گا۔ پھر آپ تمام عربوں کے لیے شفاعت فرمائیں گے اور اس کے بعد عجمیوں کی باری آئے گی۔ آٹھویں شفاعت حضرت رسالت مآب ﷺ ان لوگوں کے لیے کریں گے، جن کی نیکیاں اور گناہ برابر ہو چکے ہوں گے اور خدا کی رحمت یہ چاہے گی کہ انھیں کوئی سہارا ملے اور یہ لوگ جنت میں بھیج دیئے جائیں۔ اس شفاعت کبریٰ سے انھیں سہارا ملے گا اور یہ جنت میں بھیج دیئے جائیں گے۔ کچھ علماء کا خیال یہ ہے کہ اصحابِ اعراف بھی انہی میں شامل ہوں گے۔ اسی دوران حضرت رسالت مآب ﷺ بار بار جنت میں تشریف لے جائیں گے اور بار بار محشر میں

حاضری ہوگی۔ اپنے خدام سے بھی خاص شفقت کا معاملہ فرمائیں گے۔ اور حضرت انس، حضرت بلال، حضرت کعب رضی اللہ عنہم وغیرہ خاص عنایات کا مورد ٹھہریں گے۔ پھر آخر کار جہنم میں کچھ ایسے مومن رہ جائیں گے جنہوں نے صرف کلمہ ہی پڑھا ہوگا اوران کے نامہ عمل میں کوئی نیکی نہیں ہوگی۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ان کی سفارش کریں گے اور حکم ہوگا کہ انھیں جہنم سے نکالیں اور جنت میں لے جائیں۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چار مرتبہ یہ معاملہ ہوگا کہ آپ کی شفاعت سے ایسے جہنم میں پڑے لوگ جنت میں بھیج دیئے جائیں گے اور آخر پر آپ عرض کریں گے اے پروردگار تمام اہل ایمان جنت میں چلے گئے بس وہ رہ گئے جو قرآن کریم کی رو سے جنت میں نہیں جاسکتے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ یہ فرمائیں گے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے سفارش کر لی، فرشتوں نے سفارش کرلی، شہداء نے سفارش کر لی اور تمام سفارش کرنے والوں کی سفارش کے بعد اب میں اور میرے گنہگار بندے رہ گئے اور اللہ تعالیٰ بے شمار گنہگاروں کو جہنم سے نکالے گا اوران کے دل میں ایمان اتنا کمزور ہوگا کہ بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو ان کے ایمان کی خبر نہیں ہوگی اور بالآخر یہ کمزور ایمان والے لوگ بھی جنت میں چلے جائیں گے۔

اَللّٰهُمَّ شَفِّعْ فِيَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم وَ أَدْخِلْنِي فِي شَفَاعَتِهِ وَ اجْعَلْنِي مِمَّنْ تَنَالُهُ شَفَاعَتُهُ بِرَحْمَتِكَ وَ بِكَرَمِكَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْن.
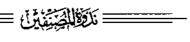
عملی منافق اور اعتقادی منافق ــــــ بدتر کون؟

فرمایا یہ بھی جاننا چاہیے کہ منافقت دو قسم کی ہے۔ ایک منافقت تو یہ ہے کہ آدمی اپنی زبان سے اُس عقیدے کا اظہار کرے جو درحقیقت اس کے دل میں نہ ہو مثلاً وہ زبان سے تو اللہ تعالیٰ کے ہونے کا اقرار کرے لیکن اس کے دل میں یہ ہو کہ یہ کائنات تو خود بخود ایک لگے بندھے نظام کے تحت چل رہی ہے اور اللہ تعالیٰ ہے ہی نہیں۔ اب کیا کریں چونکہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئے یا ان کے وطن میں رہتے ہیں اس لیے زبان سے اللہ تعالیٰ کا اقرار، یہ جھک مارنی پڑتی ہے۔ (معاذاللّٰہ) وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ ہے ہی نہیں۔ اس نفاق کو اعتقادی نفاق یا اعتقادی منافقت کہتے ہیں کہ دل میں کچھ اور زبان پر کچھ۔ عقیدے کا دوغلا پن۔ ایسے شخص کے مرنے پر اگرچہ لاکھوں مسلمان اس کا جنازہ پڑھ دیں اور پوری دنیا بھی اس کی مغفرت کی دعا کرے تو اس منافق کی بخشش نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے کہ اس کے دل میں عقیدہ کیا تھا اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافروں میں شمار ہوگا اور کافر تو پھر صاف صاف اپنے عقیدۂ کفر کا اظہار کر دیتا ہے اور کسی کو بھی دھوکہ نہیں دیتا، اس کے تو دو قصور ہیں ایک تو دل میں کفر اور دوسرے لوگوں کو دھوکہ دیا کہ دل میں عقیدہ کچھ اور تھا اور ظاہر میں کسی اور عقیدے کا اقرار کیا تو یہ تو کافر بھی ہوا اور منافق بھی اس لیے ایسے منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں رکھے جائیں گے اور ان کا عذاب کافروں سے بھی شدید ہوگا۔
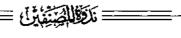
دوسری قسم کی منافقت اعتقادی نہیں، عملی ہے یعنی وہ شخص جو اپنے عقیدے میں تو بالکل درست ہے جیسے زبان سے ضروریاتِ دین مثلاً توحید، رسالت، ختم نبوت، آخرت، تقدیر وغیرہ کو مانتا ہے ایسے ہی دل سے بھی مانتا ہے لیکن عمل میں کمزور ہے۔ وعدہ شکنی کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، گالیاں بکتا ہے، نماز اور روزے کا تو پابند ہے لیکن دھوکہ دیتا ہے تو ایسا شخص عملی منافق ہے اور ایسے منافق کو فاسق بھی کہا جاتا ہے کہ یہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت میں چاہے تو اسے معاف فرمادے یا اس کی نازیبا حرکتوں کی تلافی فرمادے اور اگر چاہے تو عذاب دے۔ یہ عملی منافق اس اعتقادی منافق سے بہتر ہے کہ یہ تو فاسق ہے اور وہ اعتقادی منافق اللہ تعالیٰ کے نزدیک کافر ہے۔

جنات کے وجود کا انکار گمراہی ہے.
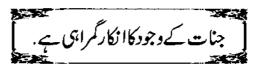
فرمایا جنات کا وجود ماننا ضروری ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہ عقیدہ ہے کہ جنات کا وجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کا تذکرہ فرمایا ہے اور جس مخلوق کو جن کہا ہے وہ انسانوں کے علاوہ ایک دوسری مخلوق ہے جو کہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ سے صحیح احادیث میں بہت سی ایسی روایات آئی ہیں جو جنات کے وجود کی دلیل ہیں اور اُمت کا اس پر اجماع بھی ہے۔ اس لیے جنات کے وجود ہی کا انکار گمراہی ہے۔
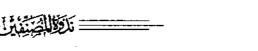
دورِ نبوی ﷺ کی تین خواتین ـــ جو بہت نمایاں نظر آتی ہیں.

فرمایا حضرت رسالت مآب ﷺ کی حیات طیبہ میں تین خواتین کے نام بہت نمایاں نظر آتے ہیں۔

① اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا.

② اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا.

③ صاحبزادی صاحبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا.

علماء اہل السنۃ والجماعۃ میں اس بات پر اختلاف ہے کہ ان تینوں محترمات خواتین رضی اللہ عنہن میں سب سے اعلیٰ اور افضل کون ہیں؟ کچھ علماء کرام کا خیال یہ ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سب سے افضل ہیں کیونکہ امت کو جتنا نفع انکے علم سے پہنچا ہے اور علمِ حدیث میں جتنی روایات ان کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ باقی دو خواتین کے علم سے اُمت کو نہ تو اتنا نفع پہنچا ہے اور نہ ہی علم حدیث میں ان کی اتنی روایات ہیں۔ پھر حضرت رسالت مآب ﷺ کی دنیا و آخرت میں وہ اہلیہ محترمہ ہیں اور حضرت جبریل امین علیہ السلام نے انھیں سلام پیش کیا تھا، اس لیے وہ سب سے افضل ہیں۔

کچھ علماء نے فرمایا کہ اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سب سے افضل ہیں کیونکہ اسلام کے ابتدائی دور میں جتنا انہوں نے حضرت رسالت مآب ﷺ کا ساتھ دیا ہے اور جتنی اس دور میں ان کی قربانیاں ہیں ایسی قربانی کا موقع بھی کسی اور کو نہیں ملا اور نہ ہی کسی اور خاتون کی ایسی قربانیاں ہیں اور پھر صحیح احادیث کے مطابق

حضرت جبریل امین علیہ السلام نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سلام پیش کیا تھا تو صحیح احادیث ہی کے مطابق حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو اللہ تعالیٰ نے سلام بھجوایا تھا۔

پھر یہ دونوں خواتین صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا سے اس لیے افضل قرار پاتی ہیں کہ وہ قیامت میں اپنے شوہر امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوں گی اور یہ دونوں خواتین اپنے شوہر حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہوں گی۔

کچھ علماء اہل السنۃ والجماعۃ کا خیال یہ ہے کہ ان تینوں خواتین میں سب سے افضل حضرت صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا ہیں کیونکہ ان کے والد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ ان کے جسم کا ٹکڑا ہیں جب کہ دونوں امہات المومنین رضی اللہ عنہما کو یہ شرف حاصل نہیں ہے۔ پھر ان کے بعد انہی کی والدہ محترمہ اُم المومنین حضرت خدیجہ اور پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن ہیں۔

اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بر بنائے علم سب سے افضل قرار پاتی ہیں۔ اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سب سے پہلی زوجہ محترمہ اور سب سے زیادہ اسلام کے لیے قربانی دینے کے اعتبار سے سب سے افضل قرار پاتی ہیں اور حضرت صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا اپنے نسب کے اعتبار سے سب سے افضل قرار پاتی ہیں کہ وہ فاطمہ بنت محمد سلام اللہ علیہا و علی ابیہا ہیں حتیٰ کہ ان کا یہ نسب تو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب سے بھی برتر ہے کہ صاحبزادی صاحبہ تو فاطمہ بنت محمد ہیں اور ان کے والد گرامی محمد بن عبداللہ ہیں۔ صلوٰت اللہ و سلامہ علیہم.

صحیح ترین عقیدہ یہ ہے کہ کوئی بھی ترتیب مان لی جائے اور کسی بھی خاتون کو پہلے یا

دوسرے یا تیسرے درجے پر رکھ لیا جائے، علماء اہل السنۃ والجماعۃ نے ہر قول کو اختیار کیا ہے اور ہر ایک کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں۔ عقیدے کے اعتبار سے ہر ترتیب درست ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں۔ کائنات میں سب سے اعلیٰ نسب حضرت صاحبزادی صاحبہ کا ہے کہ وہ فاطمہ بنت محمد سلام اللہ علیہم ہیں۔ اور ان تینوں خواتین میں اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو سلام بھجوایا ہے تو وہ حضرت ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کو، اور حضرت اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی گیارہ خصوصیات تو ایسی ہیں کہ وہ تن تنہا ہیں دنیا کی کوئی خاتون ان کے، ان محاسن میں ان کی شریک نہیں ہے۔

① صحیح روایات کے مطابق حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ شادی سے پہلے خواب میں پیش کی گئیں اور خوشخبری دی گئی کہ مستقبل میں یہ آپ کی ہونے والی اہلیہ محترمہ ہیں۔

② حضرت اُم المومنین ازواج مطہرات میں اکیلی ایسی خاتون تھیں جو بوقت نکاح کنواری تھیں وگرنہ ان کے علاوہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ایک اہلیہ محترمہ یا تو بیوہ ہو چکی تھیں اور یا پھر انھیں طلاق ہو چکنے کے بعد آپ کی زوجیت میں آنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

③ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال انہی کی گود میں ہوا تھا۔

④ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات قدسیہ کے آخری ایام آپ ہی کے حجرے میں گذارنا پسند فرمائے تھے اور باقی تمام ازواج مطہرات کی رضامندی سے انہی کے گھر کو یہ سعادت نصیب ہوئی تھی۔

⑤ حضرت اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کے حجرے کو یہ شرف نصیب ہوا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تا بہ قیامت وہیں محو استراحت ہیں۔

⑥ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی تو اس وقت جو حضرات یا اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن وغیرہ موجود ہوتی تھیں ذرا فاصلے پر بیٹھ جاتی تھیں لیکن یہ شرف صرف اور صرف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہے کہ وہ لحاف میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ لیٹی ہوتی تھیں، وحی نازل ہوتی تھی اور آپ کا حجرہ فرشتوں سے بھر جاتا تھا۔

⑦ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے، اوران کی علاوہ کوئی نہ تھا اور انہی کے یہ صاحبزادی تھیں اور انہی کو شرف زوجیت حاصل ہوا۔

⑧ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف یہی اہلیہ محترمہ ہیں جن پر الزام تراشی کی گئی تو ان کی پاک دامنی کی گواہی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں دی۔

⑨ اللہ تعالیٰ نے پاکدامنی کی گواہی کے علاوہ ان کی مغفرت اور انھیں جنت کے انعامات (رزق کریم) دینے کی بشارت سنائی۔

⑩ علم طب میں وہ تمام امہات المومنین سے علم میں فائق و برتر تھیں۔ مختلف بیماریوں میں وہ علاج تجویز فرمایا کرتی تھیں اور یہ بات اتنی کثرت سے پیش آئی کہ لوگوں کو دریافت کرنا پڑا کہ انہوں نے طب کہاں سے پڑھا ہے؟

⑪ اُمہات المومنین میں جن کے علم سے اللہ تعالیٰ نے اُمت کو سب سے زیادہ نفع پہنچایا، وہ یہی ہستی ہے۔
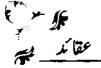
ایک سوال اور اس کا جواب.

فرمایا ایک شخص نے کسی کو چھیڑنے کی غرض سے پوچھا کہ تمہارا کیا عقیدہ ہے؟ وہ چار (علی، فاطمہ، حسن، حسین رضی اللہ عنہم) جنھیں ان کے والد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر میں داخل فرمالیا اور ان کا پانچواں اللہ تھا کیا ان سے بھی بڑھ کر کوئی افضل ہستی کائنات میں ہے؟

دوسرے نے جواب دیا کہ تمھارا کیا عقیدہ ہے؟ وہ دو جب غار میں تھے اور پہلے نے دوسرے سے کہا غم نہ کیجیے اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے تو جن کا تیسرا خود اللہ ہو کیا دنیا میں ان سے بڑھ کر بھی کوئی افضل ہے؟

روضۂ مبارک پر دعا کی درخواست.....!
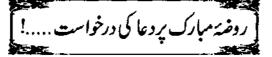
فرمایا امام جزری محمد بن محمد بن علی رحمۃ اللہ علیہ نے دعا کے موضوع پر ایک کتاب ''الحصن الحصین'' مرتب کی ہے اور یہ ایسی جامع کتاب ہے کہ مختلف علماء کرام نے اپنے اپنے دور میں اس کی شروح بھی تحریر فرمائی ہیں۔ حضرت ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ''الحرز الثمین'' کے نام سے اس کی ایک شرح لکھی ہے جو کہ چھپ کر اہل علم میں قبول عام حاصل کر چکی ہے اس کی پہلی جلد میں جہاں یہ بحث آئی ہے کہ کن کن مقامات پر دعا قبول ہوتی ہے (اماکن الاجابۃ) وہاں پر حضرت ملا علی القاری حنفی رحمۃ اللہ علیہ نے اس عقیدے کی تصریح کی ہے کہ جو شخص بھی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے
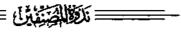
مرقد منور پر حاضر ہو کر کوئی دعا مانگتا ہے (یعنی حضرت رسالت مآب ﷺ سے عرض کرتا ہے کہ آپ میرے لیے فلاں دعا فرمادیں یا شفاعت کی درخواست کرتا ہے وغیرہ وغیرہ) تو حضرت رسالت مآب ﷺ، اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس دعا کو وہ خود سنتے ہیں اور جو شخص بھی ان پر سلام یا درود پیش کرتا ہے تو اس صلاۃ وسلام کو وہ خود سنتے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَیْہِ، اَللّٰھُمَّ اَبْلِغْہُ مِنَّا السَّلَامَ وَارْدُدْ عَلَیْنَا مِنْہُ السَّلَامَ.

توحید الٰہی کے چار مراتب

فرمایا: ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے توحید اور شرک پر بہت عمدہ بحث تحریر فرمائی ہے۔ اس تحریر کو غور سے پڑھا جائے اور پھر اسے ''تقویۃ الایمان'' اور ''عبقات'' سے ملا کر دیکھا جائے تو یہ سمجھنے میں چنداں دشواری نہ ہوگی کہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وہی کچھ تحریر فرمایا ہے، جو کہ ان کے قابل صد احترام دادا حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے، فرق صرف اجمال اور تفصیل کا ہے۔ بنیاد ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں رکھ دی گئی تھی ''تقویۃ الایمان'' اور ''عبقات'' تو اس کی عمارت ہے۔ ''تقویۃ الایمان'' کی عبارت سلیس اور عام فہم ہے اور ''عبقات'' کی عبارت اجمالی، مغلق اور خاص فہم ہے۔

توحید الٰہی کے چار مراتب ہیں اور پہلے دو مرتبے آپس میں ایک دوسرے کو مستلزم ہیں اور آخری دو مرتبے باہمی التزام کے ساتھ ہیں۔ پہلے دونوں مراتب بھی ایک دوسرے سے ایسے پیوست ہیں کہ ان دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا اور تیسرے اور

چوتھے مرتبے کی حالت بھی یہی ہے۔توحید الٰہی کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ ایک ایسی ذات مقدسہ کا اقرار جس کا وجود ضروری ہو اور اس کو نہ ماننا ناممکن ہو پھر اس کا وجود ذاتی ہو یعنی اسے کسی نے نہ بنایا ہو وہ اپنے وجود اور اس کی بقا کے لیے کسی اور کا محتاج نہ ہو۔ ایسی ہستی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے کہ اس کے وجود کو مانے بناں کوئی چارۂ کار نہیں اگر اس کو نہ مانا جائے تو کائنات کا پورا نظام برباد ہو جائے گا اور اب بھی جو لوگ اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے، نہ اس سے ڈرتے ہیں اور نہ اس کے سامنے جوابدہی کا احساس ہے، دیکھیے تو وہ اس دنیا کو کیسے برباد کر رہے ہیں اور انسانیت ان کے ظلم کی چکی میں کیسے پس رہی ہے۔ پھر اس کی ذات پاک خود سے ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں اگر وہ کسی بھی کام میں کسی کا محتاج ہو تو پھر وہ خدا کیونکر ہو؟ سو خلاصہ یہ ہوا کہ ایسی ہستی جس کا وجود ضروری اور خود بخود ہو اس کو ماننا۔ ایسی ہستی صرف اور صرف باری تعالیٰ ہی کی ہے۔ اہل علم اسی مرتبے کو توحید ذات کہتے ہیں۔ پھر دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ تمام جوہر اور عرض اس کی تخلیق ہیں اور اس تخلیق میں کوئی بھی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ جوہر سے ہماری مراد یہ ہے کہ وہ چیز جو اپنے وجود کے لیے کسی ایسی چیز کی محتاج نہ ہو جو اسے موجود کرے۔ جیسے کپڑا، کتاب، میز، کرسی وغیرہ اور عرض یہ ہے کہ وہ اپنے وجود کے لیے کسی سہارے کا محتاج ہو جیسے رنگ ہیں کہ سرخ رنگ، جو خود کیا ہے جب تک وہ کسی جوہر (کپڑا، لکڑی وغیرہ) پر قائم نہ ہو وہ اپنے وجود کا اظہار نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی مقدار مثلاً ایک کلو تو ایک کلو دودھ سبزی وغیرہ کچھ تو ہونا چاہیے ورنہ ایک کلو بذات خود کچھ نہیں۔

سو وہ ہستی جو تمام جواہر اور اعراض کو تخلیق کرنے والی ہے، اسے ماننا اور یہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اسے اہل علم کی زبان میں توحید خلق کہتے ہیں تو توحید ذات اور توحید خلق یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں ایک کو مانے تو دوسرے کو مانے بنا چارہ نہیں اور چونکہ دنیا میں عام طور پر مشرکین توحید ذات اور توحید خلق کے قائل تھے اور ہیں اس لیے قرآن کریم توحید کے ان دو مراتب سے کم بحث کرتا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے وجود یعنی توحید ذات اور دوسرے مرتبے توحید خلق کے بعد تیسرا مرتبہ توحید تدبیر کا ہے یعنی یہ کہ اس کائنات کی تخلیق کے بعد اس کا نفع اور نقصان، مادے میں تصرف کرنا، دنیا بھر کے انتظامات ہر ایک کی تربیت اور رزق دینا وغیرہ جملہ امور اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی کے تصرف میں ہیں اور کوئی نبی معصوم، ولی کامل، فرشتے اور جنات، الغرض اس کائنات میں کوئی بھی ذات باری تعالیٰ کا شریک نہیں ہے اسے ہی توحید ربوبیت یا توحید تدبیر بھی کہتے ہیں اور عقیدۂ توحید میں یہ سب سے اہم مرتبہ ہے۔ دنیا بھر کے مشرکین اسی مرتبے میں آکر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وہ سب سے پہلے یہ عقیدہ بگاڑتے ہیں کہ توحید تدبیر یا توحید ربوبیت میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک ہے اور اسی غلط عقیدے کے بعد حضرات انبیاء کرام، اولیاء اللہ، آئمہ اہل بیت رضی اللہ عنہم، بتوں، سورج، چاند، ستاروں، فرشتوں اور جنات اور خدا معلوم کس کس کی عبادت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ایک مومن اور موحد کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ کائنات کا مدبر ومنتظم بھی صرف اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہی ہے۔

جب توحید تدبیر کا عقیدہ درست یا غلط ہوتا ہے تو پھر توحید یا شرک کا چوتھا درجہ آجاتا ہے

جسے اہل علم توحید الوہیت کا نام دیتے ہیں۔یعنی جس ذات کے متعلق توحید تدبیر یا توحید ربوبیت کا عقیدہ ہے، اسی کی ، اس نظریے کے تحت عبادت کرنا ، اور اس کا نام ہے توحید الوہیت یعنی جو ہمیں پالتا ہے اور جو ہمارے نفع ونقصان کا مال ہے (توحید تدبیر) ہم اسی کی عبادت کریں گے (توحید الوہیت) انسان اسی مقام پر پہنچ کر مومن یا کافر بنتا ہے۔مومن کا عقیدہ یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی رب اور نفع ، نقصان کا مالک ہے اس لیے صرف اسی کی عبادت کروں گا اور مشرک کہتا ہے کہ فلاں ہستی یا فلاں چیز چونکہ میری رب اور نفع ونقصان کی مالک ہے لہٰذا میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی بھی عبادت کروں گا تو یہ فرق ہے مومن اور مشرک کے درمیان اور اب واضح ہوگیا ہوگا کہ تیسرا مرتبہ (توحید تدبیر یا توحید ربوبیت) اور چوتھا مرتبہ (توحید الوہیت) یعنی ربوبیت اور معبودیت یا الوہیت یہ دونوں مراتب کیسے ایک دوسرے سے پیوست ہیں۔

رسالت یا عقل

فرمایا قرآن متعدد مقامات پر اس بات کا اثبات کرتا ہے کہ حجت الٰہی ارسالِ رسل ہی کے بعد قائم ہوتی ہے، مجرد عقل انسانی کافی نہیں۔ اس موضوع پر حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمہ اللہ نے اپنے مکتوبات شریف میں کئی مقامات پر بہت عمدہ بحث تحریر فرمائی ہے۔

تفسیر

القرآن الکریم

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾

(پ:۲۹،سورۃ القیامۃ،آیت:۱۷تا۱۹)

(اے نبی ﷺ) اس (قرآن حکیم) کو

① یاد کرا دینا (پہلی ذمہ داری)

اور

② اس (قرآن حکیم) کو پڑھوا دینا (دوسری ذمہ داری)

یہ تو ہمارا ہی ذمہ ہے۔

اس لیے جب ہم اسے (حضرت جبریل امین علیہ السلام کے واسطے سے) پڑھ رہے ہوں، تو آپ اس وحی کو غور سے سنتے رہیے اور (یہ بھی یاد رہے کہ)

③ اس (قرآن حکیم) کو سمجھا دینا (اس کی تفسیر بیان کرا دینا) بھی ہماری ہی (تیسری) ذمہ داری ہے۔
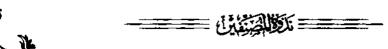
علامہ زمخشری کی تفسیر ''کشاف'' سے شدید بے زاری کی وجہ.

فرمایا علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف کو ایک زمانے میں بہت ذوق وشوق سے پڑھا اور بہت بادل نخواستہ مکمل کیا۔ پہلی مرتبہ اس تفسیر سے شدید بیزاری تو سورۂ توبہ کا مطالعہ کرتے ہوئے پیش آئی۔ اس سورۂ مبارکہ کی جب آیت نمبر: ۴۳ کی تفسیر پڑھی تو جی اچاٹ ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے:

عَفَا اللّٰهُ عَنۡكَ اللہ تعالیٰ آپ سے درگذر فرمائے۔

اور اصل واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ تبوک کا دور بہت کٹھن دور تھا۔ موسم گرما اپنے شباب پر تھا اور مدینہ منورہ میں کھجوروں کے پیڑ لدے کھڑے تھے۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قربانی دی اور ان تمام اموال کو چھوڑ کر جہاد فی سبیل اللہ کے لیے نکل پڑے۔ منافقین جہاد سے جی چراتے تھے۔ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے اور جھوٹے بہانے گھڑ کر درخواست پیش کرتے کہ انھیں مدینہ منورہ ہی میں رہنے کی اجازت دے دی جائے۔ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے طبعی غلبۂ رحمت کی بناء پر اجازت مرحمت فرما دیتے، تو اس اجازت دینے پر اللہ تعالیٰ نے محبت بھرا اعتاب فرمایا کہ اللہ تعالیٰ درگذر فرمائے (لیکن) آپ نے انھیں اجازت دی ہی کیوں؟ اللہ تعالیٰ نے عفو کو شکایت پر مقدم فرمایا۔ زیادہ سے زیادہ بھی اس بات کو بڑھایا جائے تو کیا ہے؟ یہی کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو جو مدینہ منورہ میں رہ جانے کی اجازت دی، وہ خطاء اجتہادی تھی۔ اور اللہ تعالیٰ نے کبھی بھی حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی خطائے اجتہادی
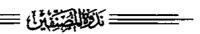
پر قائم نہیں رہنے دیا کیونکہ اگر انھیں اپنی خطائے اجتہادی پر قائم رہنے دیا جاتا تو ان کے اپنے حق میں تو اگر چہ یہ خطاء، خطائے اجتہادی ہوتی لیکن امت کے لیے تو سنت بن جاتی۔ اس لیے اس مقام پر بھی آگاہ فرمادیا اور نہایت لطیف بات یہ بھی ہوئی کہ عفو کو شکایت پر مقدم فرمایا۔

لیکن زمخشری نے یہ ظلم کیا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کو خطا کار قرار دیتے ہوئے یہ الفاظ لکھے:

أَخطأتَ وَ بِئسَ مَا قُلتَ   آپ نے خطا کی اور جو اجازت دینے کے الفاظ کہے تو بہت برے الفاظ کہے۔

أَستَغفِرُاللّٰہَ العَظِیمَ . یہ عبارت پڑھ کر بہت دھچکا لگا کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ کو خطا کار قرار دینا، کتنا بڑا ظلم ہے۔ پھر بھی اسے پڑھنا پڑا، دل پر پتھر رکھ کر اسے پڑھا اور جب سورۂ تکویر کی آیت نمبر ۱۹ پر پہنچے تو از حد حیا دامن گیر ہوئی کہ زمخشری نے اس مقام پر حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کو، حضرت رسالت پناہ ﷺ سے افضل قرار دیا۔ طبیعت بہت مکدر ہوئی اور بقیہ تفسیر بہت عجلت میں صفحات پلٹا کر مکمل کی۔

تعظیم وتقدس نبوی ﷺ اور علامہ زمخشری!
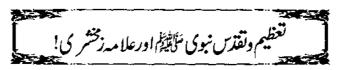
فرمایا زمخشری نے سورۂ تحریم کے آغاز میں حضرت رسالت پناہ ﷺ کے متعلق جو نازیبا کلمات استعمال کیے ہیں یا بے سروپا روایات کو نقل کیا ہے، انھیں پڑھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے دل میں تعظیم وتقدس نبوی ﷺ کا کیا عالم ہوگا۔

یہ تمام روایات ردی کی ٹوکری میں پھینک دیے جانے کے قابل ہیں۔ان تمام خرافات کے باوجود اکابر مفسرین نے اس تفسیر کے قابل قدر نکات سے استفادہ کیا ہے۔ زمخشری کے بعد آنے والے تمام قابل ذکر مفسرین میں سے شاید ہی کوئی ایسا مفسر ہو جو اس تفسیر سے بے نیاز رہ سکا ہو۔ اگر زمخشری ہمارے زمانے میں ہوتے تو قابل گردن زدنی اور ان کی تفسیر نذر آتش کر دی جاتی لیکن اسلاف کا یہ طرز نہیں رہا۔ انہوں نے حضرت رسالت پناہ ﷺ کی توہین اور اس تفسیر میں انحراف سے صرف نظر کر کے، جو کام کی بات نظر آئی، اسے نقل کر دیا۔

وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی. فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی کی لطیف تفسیر

(فرمایا) حُوَّةٌ عربی زبان میں ہر اس سیاہی کو کہتے ہیں، جو سبزی مائل ہو۔ اَحْوٰی اس گھاس کو بھی کہتے ہیں جو بوسیدہ ہو کر سیاہ پڑ جائے۔ ''الاحویٰ'' ''کالا بھجنگ''، ''کالا بھٹ''۔ اب اگر سورۃ الاعلیٰ کی ان دو آیات پر غور کیا جائے وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی ④ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی ⑤ اور وہ (اللہ) جس نے چارہ زمین سے نکالا ④ اور پھر اسے سیاہ کوڑا کر دیا ⑤ تو ایک ترجمہ تو یہی کیا گیا ہے کہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات نے چارے کو زمین سے نکالا اور پھر وہ چارہ بوسیدہ ہو کر پامال ہو کر سیاہ پڑ گیا تو گویا کہ چارے کا آغاز اور انجام بتا دیا گیا۔ لیکن ذرا غور کیا جائے تو یہی لفظ اَحْوٰی اس سیاہی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، جو سیاہی، سرخی یا سبزی مائل ہوتی ہے۔ اور یہ چارے یا گھاس میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب فصل سر سبز و شاداب

ہوتی ہے اور اس میں نمو کا جوش اسے سبز رنگ سے نکال کر سرخ یا سیاہ رنگ کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو ان آیات میں ''غثاء'' (چارہ) کی جو صفت ''احوی'' (سیاہ) آئی ہے، یہ بمعنی سیاہ نہیں بلکہ بمعنی ''سرسبز و شاداب آئے گی اور ان دونوں آیات کا ترجمہ یوں کیا جائے گا'' اور وہ (اللہ) جس نے چارہ زمین سے نکالا اور پھر اسے سرسبز و شاداب کر دیا'' ذوقِ سلیم اس ترجمے کو ترجیح دیتا ہے کہ سبزے کو پامال کر دینا یا اسے کوڑا بنا دینے کی نسبت اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف کرنے سے بہتر ہے کہ ہم اس ذات مقدس کی طرف سرسبزی و شادابی کی نسبت کریں۔ کلامِ باری تعالیٰ کے نظم میں بھی یہ ترجمہ زیادہ سجتا ہے۔ بعض مفسرین نے ان آیات کریمہ کی تفسیر یوں بھی کی ہے وَالَّذِیْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی. اَحْوٰی فَجَعَلَهٗ غُثَآءً (وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جس نے زمین سے چارہ اگایا، سرسبز و شاداب کیا اور پھر اسے کوڑا بنا دیا۔)

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ کی تفسیر مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی

فرمایا یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (اسے ہر دن ایک نیا کام ہے) تو اللہ تعالیٰ کو ہر روز اپنے بندوں کے گناہ معاف کرنے ہیں۔ ان کی دعاؤں کو سننا اور التجاؤں کو قبول کرنا ہے۔ اقوام کی عزت و ذلت کے فیصلے کرنے ہیں۔ ہر دن نئے کام سے مراد یہ کام ہیں۔ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں اس آیت کی ایک اور بہت عمدہ تفسیر بیان کی ہے کہ اس ذات پاک کو ہر روز جو کام کرنے ہیں ان میں سے ایک معمول کا کام روزانہ لشکر یا فوج کی روانگی ہے۔ ایک فوج روزانہ وہ

مردوں سے عورتوں میں منتقل کرتا ہے۔ تاکہ نسل انسانی بڑھے۔ دوسری فوج روزانہ خواتین سے دنیا میں بھیجتا ہے اور بچے جنم لیتے ہیں اور تیسری فوج دنیا سے قبروں میں بھیجتا ہے تاکہ ہر شخص ان اعمال کی جزاء کو دیکھے جو اس نے اس دنیا میں کیے ہیں۔

کوئی مے خانے کا محروم بھی مرحوم رہے گا

فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورۂ حدید (پ:۲۷، آیت:۱۰) میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دو قسموں میں منقسم کیا ہے۔

① وہ حضرات جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے انفاق اور جہاد کیا۔

② وہ حضرات جنہوں نے فتح مکہ کے بعد مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔

پھر ان دونوں میں فرق کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا کہ یہ دونوں گروہ برابر نہیں ہیں۔ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے مالی اور جسمانی قربانیاں دی ہیں، یقیناً ان کا مقام اور مرتبہ ان سے بڑھ کر ہے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد اپنا مال اور اپنی جان راہ خدا میں کھپائی ہے۔ لیکن کیا ان دونوں میں اتنا فرق پڑ جائے گا کہ فتح مکہ کے بعد والے حضرات کوئی اجر اور رتبہ نہیں پائیں گے؟ اس اُٹھتے ہوئے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا گیا کہ نہیں نہیں ایسے نہیں ہے، اگرچہ فتح مکہ سے قبل مال و جان کی بازی لگانے والے "اعظم درجة" ہیں لیکن فتح مکہ سے پہلے والے ہوں یا بعد والے ہر ایک کے ساتھ "وعدۂ حسنیٰ" ہے۔ دونوں گروہوں کو بشارت دے دی گئی کہ

کوئی مے خانے کا محروم بھی مرحوم رہے گا①

① اصل مصرع تو یہ ہے کوئی مے خانے کا محروم بھی محروم نہیں ہے
لیکن یہاں پر چونکہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دو گروہوں کے تقابل کا معاملہ ہے اس لیے قصداً مصرع میں تغیر پیدا کیا گیا۔

اور آیت کے آخر پر فرمایا وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (اے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ خوب باخبر ہے ان اعمال سے جو تم کرتے ہو۔) اس آیت میں جو فعل "تعملون" آیا ہے، یہ صیغہ مضارع کا ہے اور مضارع چونکہ حال اور مستقبل دونوں معانی میں آتا ہے اس لیے عام طور پر مترجمین اور مفسرین اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں "جو عمل تم کرتے ہو" یعنی مضارع کا ترجمہ "حال" سے کرتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ اگر اس فعل مضارع کا ترجمہ مستقبل سے کیا جائے کہ "اے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ تعالیٰ خوب باخبر ہے ان اعمال سے جو تم کرو گے" تو اس ترجمے پر اشکال کیا ہے؟ کیا یہ ترجمہ لغت یا کتاب وسنت کی کسی نص قطعی سے ٹکراتا ہے؟ جب نہیں ٹکراتا تو اس کی تفسیر یہ ہوئی کہ فرمایا گیا کہ اے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دیکھو جیسے پہلے بھی ہم نے تمھارے دو درجے بنائے ہیں اور جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل مال وجان سے اسلام کے پودے کو سینچا ہے اور جنھوں نے فتح مکہ کے بعد قربانیاں دی ہیں انھیں برابر نہیں کیا تو اب آئندہ مستقبل میں بھی تم میں سے وہ لوگ جو آزمائش میں سرخرو ہوئے اور وہ لوگ جو اجتہادی خطا کریں گے سب برابر نہیں ہوں گے۔

جنگ جمل میں جو کچھ ہوگا، صفین میں جو شہید ہوں گے، یزید کی نامزدگی اور بیعت کا جو معاملہ ہوگا، وغیرہ وغیرہ یہ جتنے بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہوں گے، اللہ تعالیٰ باوجود ان سب کی اجتہادی خطاؤں کے ان کے ساتھ وعدۂ حسنیٰ کر رہا ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ آئندہ زمانۂ مستقبل میں ان سے کیا کیا خطائیں سرزد ہوں گی۔ اس کے باوجود چونکہ صحابیت کے مقام پر فائز ہیں اس لیے ہمارا ان کے ساتھ یہ وعدہ ہے کہ ہم انھیں "وعدۂ حسنیٰ" کے
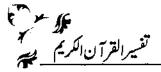
مطابق مقام رضا سے نوازیں گے۔

اس لیے اس آیت کے ترجمے پر غور کر کے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مقام اور رتبہ بھی سمجھ لینا چاہیے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تاویل الاحادیث'' سے مفسرین نے استفادہ نہیں کیا.
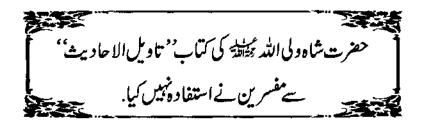
فرمایا ماضی قریب کے تقریباً ڈھائی سو سال میں چند ایسی تفاسیر لکھی گئیں جن سے آج سارا عالم اسلام فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ پاک و ہند میں بھی اسی اثنا میں تیس سے کم تفاسیر قید کتابت میں آئیں لیکن ان تمام تفاسیر میں کسی ایک مفسر نے بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''تاویل الاحادیث'' سے فائدہ اُٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ حالانکہ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے جو قصص قرآن کریم میں آئے ہیں ان کی بابت بعض بہت پتے کی باتیں اس رسالے میں بیان کی گئی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی طبعی ذہانت اور ذوق لطیف سے ایسے نکات بیان کرتے ہیں جن کے متعلق یہ کہنا دشوار ہے کہ انھوں نے اپنے سے پہلوں کی باتیں نقل کی ہیں۔ اس دور میں جو بھی تفسیر پر کام کرنا چاہے، اسے چاہیے کہ اس رسالے کا مطالعہ ضرور کرے۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحقیق اور مقدمے کے ساتھ اس رسالے کو شائع کیا تھا اور بحمدہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے ذخیرہ کتب میں موجود ہے۔

بعض صوفیاء کے عقیدے میں بگاڑ اور صاحبِ روح المعانی........!

فرمایا اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں بار بار اس عقیدے کی تلقین کرتا ہے کہ اپنی تکالیف اور مصائب کے حل کے لیے صرف اور صرف مجھ سے مدد مانگو۔ میں ہی ہوں جو تمھارے نفع اور نقصان کا مالک ہوں میرے علاوہ کسی کو بھی نہ تمہاری تکالیف اور ضروریات کا علم ہے اور نہ ہی کسی کے پاس ان کا حل ہے ہمیشہ مجھ سے مانگو۔

بہت سے صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کا مسلک یہ ہے کہ حضرات اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہوتے ہیں اس لیے ان سے مدد مانگنا اور اپنی مشکلات ومصائب میں ان کی طرف رجوع کرنا کہ آپ ہمارے مسائل کو حل کر دیں، یہ جائز ہے کیونکہ ہم ان سے نہیں مانگتے بلکہ وہ چونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کے مظہر ہیں تو درحقیقت ہم اللہ تعالیٰ ہی سے مانگ رہے ہوتے ہیں۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں سورۃ النحل کی تفسیر میں ایسے لوگوں کو بہت عمدہ جواب تحریر فرمایا ہے، ان کی تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ فرماتے ہیں اگر یہ اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہونے کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ ان سے مدد مانگی جائے اور استعانت واستغاثہ کیا جائے تو پھر انہی اولیاء اللہ کے لیے نماز بھی پڑھ لی جائے اور انہی کے نام کا روزہ بھی رکھ لیا جائے تو پھر کیا ممانعت ہے۔ اس لیے ہر شخص جو ہدایت کی دولت سے بہرہ مند ہے اس کے لیے امن اور سلامتی کی راہ یہی ہے کہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگے جو ہر عیب سے پاک، ہمیشہ زندہ
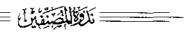
رہنے والا، ہر چیز اس کے قبضۂ قدرت میں اور وہی اپنے بندوں کی مصلحتوں سے باخبر ہے۔ بعض صوفیاء میں جو بگاڑ ہے میرے قلم میں طاقت اور زبان کو یارا نہیں کہ اسے بیان کرسکوں۔

قبضِ ارواح کی مختلف صورتیں.

فرمایا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کی روح اس کے جسم سے حضرت عزرائیل علیہ السلام ہی جدا کریں اور اس کی موت واقع ہو بلکہ اس کی کئی ایک صورتیں ہوتی ہیں۔ سورۃ الانعام میں جہاں یہ بیان فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے فرشتے، انسانوں کی روح کو جسم سے الگ کر لیتے ہیں اور کسی قسم کی کوئی کوتاہی نہیں کرتے اور پھر سب لوگ اپنے حقیقی مالک کے پاس لائے جائیں گے تو اس کی تفسیر میں قبضِ ارواح کی ایک صورت تو مفسرین نے یہ بیان کی ہے کہ قبضِ ارواح کبھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ خود فرماتے ہیں غالباً یہ وہ لوگ ہوتے ہوں گے جو کہ ہر نیکی میں سبقت لے جانے والے اور درجۂ اوّل کے اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد دوسرے شمار میں حضرت عزرائیل علیہ السلام ہیں اور یہ ان لوگوں کی ارواح کے لیے جو درجۂ دوم کے نیک لوگ ہوں گے۔ جو راسخ فی العلم ہوں اور ایسی اچھی سیرت کہ اپنے نفس کی کثافتوں سے انھیں تجرید حاصل ہوچکی ہوگی۔ پاک دل اور ہر قسم کی کدورت سے مبرّا، نفرتوں کی دنیا سے دور اور ان کو قلب سلیم کی دولت حاصل ہوچکی ہوگی۔ درجہ سوم ان لوگوں کا ہے جنھوں نے صالحیت کی زندگی گذاری، عمومی طور پر نیک رہے لیکن تزکیہ نفس کی

دولت سے حقیقی معنی میں بہریاب نہیں ہوئے۔ کچھ جسمانی گناہوں کے عوارض میں بھی تلویث رہی۔ سوایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے فرشتوں کو بھیجتا ہے اور یہی رحمت کے فرشتے انھیں سمیٹ لیتے ہیں۔ ان فرشتوں کے ساتھ ان کی نیکیاں بھی خوبصورت شکل کے لڑکوں کی صورت میں انھیں دکھائی جاتی ہیں اور یہ ایسے ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور بشارت کو بہت خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس بھیجا۔ ان لڑکوں نے ـــــ جو کہ درحقیقت فرشتے تھے ـــــ انھیں اور ان کی اہلیہ محترمہ کو خوشخبری سنائی کہ اس بڑھاپے کے باوجود اللہ تعالیٰ انھیں اولاد کی نعمت سے سرفراز فرمائے گا۔ تو موت کے وقت یہ نیکیاں خوبصورت لڑکوں کی شکل میں رحمت کے فرشتوں کے ساتھ آجاتی ہیں۔ مثلاً کوئی شخص لوگوں کو بہت کھانا کھلاتا تھا، کوئی پانی پلاتا تھا، کوئی مساجد تعمیر کرتا تھا، کوئی شادیاں کراتا تھا، کوئی شخص قرض داروں کا قرض ادا کر دیتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ الغرض جو شخص جو بھی نیکی کرتا تھا اس کی وہ نیکی اگر اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی ہوگی تو وہ اس وقت مجسم شکل میں سامنے آئے گی۔ چوتھی صورت ان لوگوں کی ہے جو ظالم تھے، ان کے اخلاق بگڑے ہوئے تھے، مال کی محبت نے انھیں اندھا کیا ہوا تھا اور حسد، کینہ، بغض، غیبت اور سوئے ظن سے ان کی روح سیاہ اور داغدار تھی۔ اب اللہ تعالیٰ کے عذاب کے فرشتے آئیں گے۔ اگر روح پر لالچ اور حرص کا غلبہ تھا تو اب یہ حرص بندروں کی صورت میں ان عذاب کے فرشتوں کے ساتھ آئے گی۔ اگر دوسروں پر ظلم کر کے اپنے مفادات کو ناجائز طریقے پر حاصل کرنے کا غلبہ تھا تو اب یہ بُرا جذبہ اور یہ غلط حرکت ان عذاب
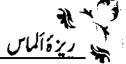
کے فرشتوں کے ساتھ مل کر کتوں کی صورت میں آئے گی۔ اگر جنس کا غلبہ تھا اور اس کا غلط استعمال تھا تو روح کو جسم سے الگ کرنے کے لیے عذاب کے فرشتے اور سور آئیں گے، اور جن لوگوں کی روحیں اجسام سے ایسے الگ کی جائیں گی، وہ سوچ سکتے ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟

حضرت ھبار بن اسود رضی اللہ عنہ کا نام معذبین میں شمار کرنا درست نہیں.

فرمایا: کفار مکہ ہجرت سے پہلے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کرتے تھے اس پر اللہ تعالیٰ نے وہ آیات نازل فرمائیں جو کہ سورۃ الحجر کے آخر پر ہیں اور آپ کو تسلی دی گئی کہ رنجیدہ نہ ہوں اللہ تعالیٰ کافی ہے کہ انھیں سزا دے۔ جو لوگ ان حرکتوں کے مرتکب ہو رہے تھے مفسرین کرام رحمہم اللہ نے ان کے نام بھی تحریر فرمائے ہیں اور معاملہ اس حد تک تو درست ہے لیکن انہوں نے اس کے بعد کس کافر کو کیا سزا ملی، یہ تفصیلات بھی بیان کی ہیں اور ان میں ایک نام ھبار بن الاسود کا بھی آ گیا ہے کہ انھیں بھی قدرت کی طرف سزا ملی تھی، حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ ھبار بن الاسود ممکن ہے ان لوگوں میں سے تو ہوں، جو ایسی نازیبا حرکت کرتے تھے لیکن انھیں کوئی سزا نہیں ملی بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ہدایت دی اور وہ مسلمان ہو گئے اور اب ان کا شمار حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں ہوتا ہے۔ یہ جو بعض مفسرین نے اس مقام پر یہ غلطی کی ہے، اس کی تصحیح ضروری ہے۔

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد حضرت ابوالعاص رضی اللہ عنہ بدر میں کفار مکہ کے ہمراہ
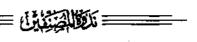
تھے اور شکست کے بعد قیدی بنے، حضرت رسالت مآب ﷺ نے انھیں اس شرط پر رہائی دی تھی کہ وہ مکہ مکرمہ پہنچ کر اپنی اہلیہ اور حضرت صاحبزادی صاحبہ زینب رضی اللہ عنہا کو ہجرت کی اجازت دیں گے اور وہ مدینہ طیبہ تشریف لے آئیں گی۔

انہوں نے اپنے وعدے کو نبھایا اور اگر چہ وہ اس وقت اُمید سے تھیں لیکن انھیں مدینہ منورہ روانہ کر دیا گیا۔

ھبار بن اسود ——— جو اس وقت مکہ مکرمہ کے اوباش لڑکوں میں سے تھے ——— انہوں نے جب یہ دیکھا کہ ایک تو بدر میں ہمیں شکست ہوگئی اور اوپر سے دن دیہاڑے ہمارے دشمنوں کی بیٹی یوں ہجرت کر رہی ہے تو آگے بڑھ کر اس اونٹ پر حملہ کیا اور صاحبزادی صاحبہ کو ایسی چوٹیں آئیں کہ اُن کا حمل ساقط ہو گیا۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کو اس حرکت پر بہت رنج ہوا اور اس ظلم کے خلاف آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حکم دیا کہ اگر ھبار کہیں قابو میں آ جائے تو اسے زندہ جلا دیا جائے غالبًا اس ظلم کی وجہ سے جو بچہ ضائع ہو گیا تھا یہ گویا اس کا بدلہ بھی تھا۔

پھر ایک مرتبہ آپ نے فرمایا ھبار کو زندہ نہ جلانا بلکہ اسے قتل کر دینا ہی کافی ہوگا۔ آگ کا عذاب تو بس اسی ذات کے شایان شان ہے، جو آگ کا بھی پروردگار ہے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ھبار کبھی بھی نہیں ملے، یہاں تک کہ مکہ مکرمہ فتح ہو گیا اور ھبار جان کے خوف سے روپوش ہو گئے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ جعرّانہ سے مدینہ منورہ تشریف لے جا رہے تھے کہ آپ کو یہ اطلاع دی گئی کہ ھبار بن الاسود کو مسلمانوں کے لشکر کے قریب دیکھا گیا ہے۔

آپ نے فرمایا میں نے بھی اسے دیکھا ہے اور اسی اثنا میں ھبار بن الاسود خود حاضر ہو گئے۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ اُٹھے تا کہ اس کا سر اُڑا دیں۔ لیکن حضرت رسالت مآب ﷺ نے انھیں بیٹھنے کا اشارہ فرمایا۔ ھبار سلام کر کے بیٹھ گئے اور کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد عرض کیا کہ میں آپ سے ڈر کر اپنے وطن سے بھاگ گیا تھا اور میرا ارادہ تو یہ تھا کہ عجمیوں میں جا کر کسی بادشاہ کے ہاں پناہ لے لوں گا۔ پھر میں غور کرتا رہا اور مجھے خیال آیا کہ آپ کی عادت تو اپنے دشمنوں کو معاف فرمانے کی ہے۔ پھر یہ خیال آیا کہ آپ ہمیشہ مجرموں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے رہے ہیں اور جو لوگ بھی آپ پر ظلم کرتے رہے ہیں آپ کی شہرت یہ ہے کہ آپ نے ہمیشہ انھیں بخش دیا ہے۔ اللہ کے رسول ہم شرک کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے اب ہمیں ہدایت دی ہے اور ہم تباہ و برباد ہو رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کو ہمارا وسیلہ نجات بنایا ہے۔ آپ میری جہالت کو معاف فرما دیں اور جو دُکھ میں نے آپ کو (صاحبزادی صاحبہ کے بارے میں) پہنچایا ہے اسے بھلا دیں۔ میں اپنی اس حرکت پر آج واقعی شرمندہ ہوں۔

حضرت رسالت مآب ﷺ تو صرف اقرار جرم پر بھی معاف فرما دیا کرتے تھے یہ تو ھبار نے بہت جملے عرض کر دیئے تھے۔ ارشاد فرمایا ھبار میں نے تمہاری تمام عمر کی غلطیاں معاف کیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ جو آپ کو قبولیت اسلام کی توفیق بخشی ہے، یہ اس کا بہت بڑا احسان ہے۔ اور دیکھو جب کوئی شخص اسلام قبول کر لیتا ہے تو پھر دور جاہلیت کی غلطیاں اللہ تعالیٰ ویسے بھی معاف فرما دیتا ہے۔

حضرت ھبار بن اسود رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں پر ابھی تک ان کے

اسلام اور معافی کی اطلاع نہیں پہنچی تھی، اس لیے لوگوں نے انھیں بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ اطلاع جب حضرت رسالت مآب ﷺ کو ہوئی تو آپ نے منع فرمایا اور لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ جو تمہیں بُرا کہے، اسے بُرا کہو۔ غالباً مراد یہ ہوگی کہ اب حضرت ھبار بن الاسود رضی اللہ عنہ تمہیں کچھ نہیں کہہ رہے اور میں بھی معاف کر چکا ہوں تو انہیں ملامت نہیں کرنا چاہیے۔

اس لیے مفسرین نے اس آیت کریمہ کے ضمن میں ان کا نام جو بغیر کسی ادب کے لیا ہے اور انھیں معذبین میں شمار کیا ہے، تو یہ درست نہیں ہے۔

کیا دنیا میں قرآن کریم کی دو لاکھ تفاسیر موجود ہیں یا لکھی گئی ہیں؟

فرمایا ایک بزرگ تھے ——— نور اللہ مرقدہ ——— ان کے ملفوظات پر مشتمل ایک کتاب چھپی، مطالعے کا موقع ملا۔ جامع ملفوظات نے ان بزرگ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ حضرت فرماتے تھے کہ دنیا میں قرآن کریم کی دو لاکھ تفاسیر موجود ہیں یا لکھی گئی ہیں۔

ان کا یہ ملفوظ پڑھ کر بہت حیرت ہوئی یا تو اس ملفوظ کی نسبت حضرت رحمہ اللہ کی طرف غلط ہے اور یا پھر ان پر کسی حسن ظن کا غلبہ ہوگا۔ امر واقع یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفاسیر پہلی صدی ہجری سے لے کر آج پندرہویں صدی ہجری تک دو لاکھ (200000) تو درکنار صرف بیس ہزار (20,000) بھی نہیں لکھی گئیں۔

بزرگوں سے عقیدت کی بنا پر ایسی بے سر و پا روایات بیان کرنا یا تحریر کرنا الگ بات ہے

اور تحقیق کی دنیا کسی اور چیز کا نام ہے۔ اگر حضرت نے ہی یہ فرمایا تھا تو کاش کہ کوئی گستاخ اس وقت عرض کرتا کہ حضرت والا تفاسیر کے نام لکھنا شروع کرتے ہیں اور دولاکھ نہیں صرف بیس ہزار تفاسیر کے نام لکھتے ہیں۔ تو اس ڈھول کا پول کھل جاتا۔ آج بھی کوئی شخص دنیا کی جتنی بھی زبانوں میں قرآن کریم کی تفاسیر لکھی گئی ہیں ان سب کے نام ہی لکھنا شروع کردے، خواہ وہ تفاسیر مطبوعہ ہوں یا قلمی تو بیس ہزار کی تعداد پوری نہیں کرسکے گا۔ فرض کرلیجئے کہ قرآن کریم جس سال مکمل ہوا تھا اس سال سے لے کر آج کے برس تک ہر سال صرف ایک تفسیر بھی لکھی گئی ہو تو فی صدی ایک سو تفاسیر کے حساب سے پندرہ سو تفاسیر تو ہونی چاہئیں اور حقیقت یہ ہے کہ اتنی تفاسیر بھی نہیں ہیں۔ مبالغے اور رنگ آمیزی کی روایات اور ہیں اور تحقیق کی دنیا الگ ہے۔ وہ تفاسیر جو واقعی تفاسیر کہلانے کے قابل ہیں اگر فی صدی بیس تفاسیر لکھی گئی ہوں تو آج تین سو تفاسیر تو موجود ہونی چاہئیں، خواہ وہ مطبوعہ ہوں یا قلمی اور اگر اتنی بھی ہوں تو بسا غنیمت ہے۔ جبکہ حقیقت اس سے بھی کم ہے۔ اس سے اندازہ کرلینا چاہیے کہ بزرگوں کے ملفوظات میں بھی کبھی غلط باتیں آجاتی ہیں۔ خود بزرگ ایسی بے سروپا اڑاتے ہیں اور ان کے معتقدین سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں اور بغیر کسی تحقیق کے ان کی ہر بات پر امناً و صدّقنا کہتے رہتے ہیں اور یا پھر بزرگ تو محقق ہوتے ہیں اور بے پَر کی نہیں اڑاتے لیکن جامع ملفوظات جو آب و رنگ چڑھاتے ہیں وہ قابل گرفت بن جاتا ہے۔
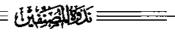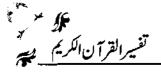
کیا واقعہ معراج میں حضرت رسالت مآب ﷺ کو رویت باری تعالیٰ کا شرف حاصل ہوا تھا؟

فرمایا قرآن کریم میں جو آیات واقعہ معراج کے متعلق ہیں، مفسرین نے ان کی تفسیر میں اس بات پر بحث کی ہے کہ شب معراج میں حضرت رسالت مآب ﷺ کو رویت باری تعالیٰ کا شرف حاصل ہوا تھا یا نہیں؟ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم آپ کے اس شرف سے مشرف ہونے کے قائل تھے اور کئی ایک مفسرین نے حضرت ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا موقف یہ بیان کیا ہے کہ وہ اس بات کی قائل نہیں تھیں۔ پھر انہوں نے یہ موقف بیان کرنے کے بعد بحث کو تشنہ چھوڑ دیا ہے اور قاری کا ذہن کچھ فیصلہ نہیں کر پاتا۔

اگرچہ یہ مسئلہ ایمانیات میں سے نہیں ہے لیکن حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو شب معراج میں دیدار خداوندی کے قائل ہیں، وہ تو صاف یہ بیان کرتے ہیں کہ انھیں اس عظیم انعام کی اطلاع خود حضرت رسالت مآب ﷺ نے دی ہے جبکہ حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کہیں بھی یہ نہیں فرماتیں کہ انہوں نے یہ انکار حضرت رسالت مآب ﷺ سے سنا ہے یا انہوں نے دریافت فرمایا اور جواب نفی میں ملا، بلکہ وہ تو قرآن کریم کی ایک آیت سے استدلال فرماتی ہیں کہ ایسے نہیں ہوسکتا۔ تو قاری کو چاہیے کہ مسئلے کی حقیقت جاننے کے لیے خود غور کرلے کہ ایک طرف تو صراحتاً صاف احادیث موجود ہیں اور حضرت رسالت مآب ﷺ فرماتے ہیں کہ انہوں نے شب معراج میں اللہ تعالیٰ
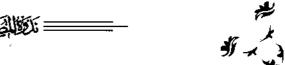
کو دیکھا ہے اور دوسری طرف حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا صرف قرآن کریم کی ایک آیت کی تفسیر کی رو سے اس بات کا انکار فرما رہی ہیں جبکہ ان کی اس تفسیر میں کیا کمی باقی ہے، صاحب روح المعانی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر بھی بحث کی ہے۔ اگر حضرت اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس دیدار خداوندی کے انکار کی کوئی ایک بھی صحیح حدیث ہوتی تو وہ ضرور ارشاد فرماتیں لیکن ایسے ہوا ہی نہیں اس لیے دیگر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک ہی اس معاملے میں مختار ہے۔

کسی کے جنتی یا جہنمی ہونے کی پیشینگوئیاں کرنے والے جاہل صوفیاء اور متعصب مولوی!

فرمایا ہمارے دور کے بہت سے صوفیاء اور جاہل، متعصب مولویوں کا حال یہ ہے کہ یہ اپنے مریدوں اور معتقدین کو یہ بشارتیں دیتے پھرتے ہیں کہ تم جنتی ہو یا فرماتے ہیں کہ اے فلاں میں تو تمہیں اپنے ساتھ جنت میں لے جاؤں گا۔ جو مرید یا آسامی مالدار ہوتی ہے یہ بشارتیں عموماً انھیں ہی ملتی ہیں اور اپنے مخالفین تو کیا ذرہ برابر کوئی ان کی راہ سے ہٹ جائے یا ان کی خدمت میں کمی کر دے تو ارشاد ہوتا ہے کہ یہ تو باطنی مرتد ہے، یہ تو مسلوب الایمان ہے۔ ارے اس کی کیا بات کرتے ہو وہ تو جہنمی ہے۔ ارے ہمارے حضرت نے اسے جہنم میں جلتے دیکھا ہے اور ارے فلاں کو حضرت نے جنت کی بشارت دی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بشارتیں دینے اور سننے اور خوش ہونے والے کاش کہ سورۂ توبہ کی اس آیت کو ہی سمجھ لیتے جس میں اللہ تعالیٰ نے مدینہ منورہ

میں بسنے والے منافقین کے متعلق حضرت رسالت مآب ﷺ کو خبر دی کہ آپ ان منافقین سے واقف نہیں ہیں، ہم انہیں جانتے ہیں۔ جب حضرت رسالت مآب ﷺ کو مدینہ طیبہ میں رہنے والے منافقین تک کا علم نہیں تھا تو ان مشائخ اور علماء کو کیسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں جنتی ہے اور فلاں جہنمی ہے۔ ان کی حیثیت کیا ہے کہ کسی بھی شخص کے مسلوب الایمان، جنتی یا جہنمی ہونے کے فتوے صادر کر سکیں؟ انھیں چاہیے کہ اپنی خیر منائیں اور اپنا فکر کریں کہ اللہ تعالیٰ کی کسی کے ساتھ کوئی رشتہ داری نہیں ہے کہ صرف نظر فرمائے گا۔ قادر مطلق اور غفور و جبار ہے اس پر کسی کا کیا اجارہ ہے؟ ایسی بشارتیں اور ڈراس قطعیت سے سنانا کہیں مہنگا نہ پڑ جائے۔ مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے اس آیت کریمہ کی تشریح میں مشہور تابعی حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر نقل کی ہے اور کیا خوب تفسیر ہے کہ حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ لوگوں کا حال اتنا گر گیا ہے کہ جعلی اور بناوٹی باتیں لوگوں سے کرتے ہیں کہ فلاں جنت میں جائے گا اور فلاں جہنم میں۔ ایسی باتیں کرنے والوں سے آپ اگر جا کر پوچھیں کہ جناب والا آپ اپنے بارے میں قطعی رائے دیں کہ کیا آپ بھی جنتی ہیں؟ تو یہ یہی کہے گا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ سو مجھے میری زندگی کی قسم تم جو لوگوں کے اعمال کی بنسبت خود اپنے اعمال سے زیادہ واقف ہو (اپنے بارے میں تو فیصلہ کر نہیں سکتے اور لوگوں کے فیصلے کرتے پھرتے ہو) تم نے اپنے لیے ایسے جھوٹے دعوے گھڑے ہیں کہ ایسی بات تو حضرات انبیاء علیہم السلام نے کبھی نہیں کی۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے لوگوں سے یہ فرمایا کہ جو کرتوت تم کرتے ہو مجھے کیا معلوم؟ اور حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ لوگو میں تم پر

کوئی نگران تو نہیں ہوں (کہ مجھے تمہارے اعمال کی خبر ہو) اور یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سیدنا حضرت محمد ﷺ سے فرمایا کہ مدینہ منورہ میں جو منافق ہیں آپ انھیں نہیں جانتے، ہم جانتے ہیں۔ تو یہ آیات اور ایسی بہت سی دیگر آیات اس شخص کے ردّ کے لیے بہت قوی دلیل ہیں، جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اسے کشف سے لوگوں کے حالات کا علم ہوتا ہے اور اس شخص کا بھی ردّ ہے جو محنت کر کے جب اپنے دل کو صاف کرے اور اپنے نفس کو دنیا کے مشاغل سے فارغ کرے تو وہ لوگوں کو غیب کی خبریں بتانے کا دعویٰ کرے (اور لوگوں کے جنتی اور جہنمی ہونے کی پیشین گوئیاں کرتا پھرے) اور بعض صوفی اور مولوی تو یوں لوگوں کو غیب کی باتیں بتانے اور دعوے کرنے میں سخت لاپرواہ واقع ہوئے ہیں۔

اس لیے انسان کو چاہیے کہ لوگوں سے زیادہ اپنی فکر کرے اور اپنی نجات کا سوچے۔ قطعیات کی خبر دینا حضرات انبیاء علیہم السلام کا خاصہ ہے کہ انھیں وحی کے ذریعے علم دیا جاتا ہے۔ باقی خوابوں اور کشف کی بناء پر لوگوں کو مسلوب الایمان، جنتی اور جہنمی قرار دیتے دیتے یہ نہ ہو کہ جاہل صوفی اور غیر مہذب مولوی شرک فی الرسالہ کا ارتکاب کر بیٹھے۔

کیا صالح بندوں کو جنت میں رویت باری تعالیٰ نصیب ہوگی؟

فرمایا اللہ تعالیٰ نے سورۂ یونس عَلَیْہِ وَ عَلٰی نَبِیِّنَا الصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ میں یہ خوشخبری دی ہے کہ وہ اپنے صالح بندوں کو جنت سے بھی زیادہ اور اس سے بھی بڑھ کر ایک انعام عنایت فرمائے گا۔ اب جنت سے بھی بڑھ کر جو انعام ہوگا وہ اہل السنۃ والجماعۃ کے

متفقہ عقیدے کے مطابق اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی زیارت، اس پاک ذات کی رویت اور باری تعالیٰ کو دیکھنے کی دولت ہے۔ اس آیت کریمہ کی تفسیر میں اہل السنۃ والجماعۃ کے تمام مفسرین نے اس عقیدے پر اتفاق کا اظہار کیا ہے بلکہ دعا بھی مانگی ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی زیارت کے انعام سے سرفراز فرمائے۔

معتزلہ اور روافض کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کبھی بھی زیارت نہیں ہوگی۔ علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ ان حضرات کے اس عقیدے پر بہت ناراض ہوئے ہیں۔ اور علامہ زمخشری صاحب کشاف جو معتزلی اور اس فرقے کے امام اور نمائندے مانے جاتے ہیں ان کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا یہ عقیدہ ''زعم فاسد'' ہے اور قیامت میں اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ انصاف کرے یعنی دبے الفاظ میں یہ کہا کہ وہ قیامت میں اللہ تعالیٰ کے فضل کی بجائے انصاف سے بہرہ ور ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ دعا نہیں بلکہ بددعا ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کے اس عقیدے کے تحفظ کے لیے وہ حساس ہیں اتنے کہ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ تک پر نقد کیا ہے اور لکھا ہے کہ انہوں نے اس آیت کی تفسیر میں جو یہ لکھ مارا ہے کہ ''قیل'' (یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوگی۔) تو یہ لفظ ان کی شان کے خلاف ہے۔ یعنی انہیں پورے یقین کے ساتھ لکھنا چاہیے تھا کہ قیامت میں رویت باری تعالیٰ ہوگی۔ مفسرین کرام رحمہم اللہ نے اس آیت کریمہ کے ضمن میں اس عقیدے کی خوب وضاحت اور حفاظت کی ہے۔
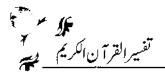
کیا میدان جہاد میں شہید ہونے والا اور اللہ کی راہ میں وفات پانے والا دونوں مجاہد، اَجر وثواب میں برابر ہیں؟

(فرمایا) ایک شخص جہاد کے لیے جاتا ہے اور شہید ہو جاتا ہے جبکہ دوسرا شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں نکلتا ہے مثلاً علم حاصل کرنے یا علم کو پھیلانے یا تجارت اور رزق حلال کمانے کی غرض سے یا اسلام کی سربلندی کے لیے یا دین کی تبلیغ کے لیے یا کسی بھی ایسے شعبے میں جس کا تعلق دین سے بنتا ہے اور پھر اسے اس راہ میں موت آ جاتی ہے تو کیا وہ شہید اور یہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں وفات پانے والا شخص، اجر وثواب میں دونوں برابر ہیں؟

سورۃ النساء کی ایک آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات اپنے اجر کے اعتبار سے برابر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مہاجر کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص بھی اپنے گھر سے ہجرت کی نیت سے نکلا اور پھر راستے میں اسے موت نے آ لیا تو (اس کی ہجرت اگرچہ بظاہر مکمل نہیں ہوئی، تو بھی) اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے ذمے رہا۔ سو مہاجر اور شہید اجر میں برابر ہی ہوں گے۔ ویسے بھی حضرت رسالت مآب ﷺ نے بھی تو فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارا گیا وہ بھی شہید ہے اور جسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں موت آ گئی وہ بھی شہید ہے۔

❀ ❀ ❀

قرآن کریم حفظ کرنا زیادہ ضروری ہے یا اس پر عمل کرنا؟

فرمایا: حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں قرآن کریم کا حفظ، تلاوت اور جن آیات پر عمل ممکن تھا، ان پر عمل، یہ دونوں کام ساتھ ساتھ ہوئے۔ وہ خود فرماتے تھے کہ ہم حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دس، دس آیات کا سبق لیتے تھے اور پھر غور وفکر کر کے ان آیات میں جو اعمال کرنے پر قدرت ہوتی تھی، ان پر عمل کر کے پھر حاضر ہوتے تھے اور مزید دس آیات کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس لیے ان حضرات میں علم اور اس کے بعد عمل ساتھ ساتھ تھا۔ اسی لیے تو حضرت سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے سورۃ البقرہ بارہ سال میں مکمل کی اور جب یہ سورۂ مبارکہ پوری ہوگئی تو انہوں نے اس خوشی میں ایک اونٹ ذبح کیا اور دوستوں کی دعوت کی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ حفظ قرآن کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ ہمیں قرآن کریم کے الفاظ یاد کرنا (حفظ) مشکل تھے لیکن (ایمان کی پختگی کی وجہ سے) قرآن کے احکامات پر عمل بہت آسان تھا اور پھر ہمارے بعد ایک زمانہ ایسا بھی آئے گا، جب لوگوں کے لیے قرآن یاد کرنا آسان ہوگا لیکن اس پر عمل کرنا دشوار ہو جائے گا۔

اگر وہ آج کا زمانہ (پندرھویں صدی) دیکھ لیتے تو جانتے کہ ان کی بات سو فی صد درست نکلی۔ بے شمار لوگ اپنے بچوں کو حفظ کراتے ہیں حتیٰ کہ سکول کی تعلیم چھڑوا کر حفظ کروا رہے ہیں۔ لیکن قرآن کریم پر عمل اور تو کوئی کیا کرتا خود یہ حافظ بھی نہیں کرتے۔ نمازیں ضائع کرتے ہیں، رمضانی حافظ بھی ہوگئے تو بہت احسان کیا۔ سارا
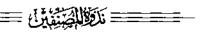
سال قرآن کریم کی تلاوت نہیں کرتے اور اکثر تو بھول ہی جاتے ہیں یا بھلا دیئے جاتے ہیں۔غنیمت ہے جو رمضان المبارک میں تراویح میں سنا دیں۔سو جب نہ نماز رہی نہ تلاوت رہی تو عمل کیا رہا؟عمل یہ کہ فحاشی اور عریانی میں پڑ جاتے ہیں،بچوں کو مارتے ہیں اور ظلم کرتے ہیں۔قرآن کریم کو جو بیچنے کی صورتیں اور جو فقہاء نے حرام لکھا ہے،ایسے مشاغل میں مبتلا ہیں۔شاید اسی دور کی پیشین گوئی سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے بھی کی تھی۔وہ فرماتے تھے کہ اس امت کے ابتدائی دور میں اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ وہ مکمل قرآن کریم کے حافظ نہ تھے صرف چند ایک سورتیں یاد ہوتی تھیں لیکن قرآن کریم کی ہدایات اور احکامات پر عمل میں وہ سب سے بڑھ کر تھے کہ ان جیسا دین پر عمل کرنے والا کوئی نہ تھا اور جب اس امت کا آخری دور آئے گا تو تم دیکھو گے کہ مسلمانوں کے بچے بھی قرآن کریم کو حفظ کریں گے۔ان کے اندھے بھی حافظ ہوں گے لیکن ان کے کرتوتوں کی وجہ سے قرآن پر عمل کرنے کی توفیق ان سے چھن جائے گی۔

کیا اب ایسا دور نہیں آ گیا؟ پھر حفاظ کرام اس زوال کو دور کرنے کے لیے اپنے اعمال کو صالح کیوں نہیں بناتے؟

حضرت خلف بن ہشام رحمۃ اللہ علیہ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور تبع تابعین میں سے تھے۔اپنے دور میں قرأت کے امام تھے اور فرماتے تھے کہ ہمارے دور میں قرآن کے ساتھ ایسے سلوک ہو رہا ہے جیسے کہ وہ پرائی اور مانگے کی چیز ہے(یعنی جیسے انسان مانگی ہوئی چیز کی حفاظت سے غفلت برتتا ہے،ہم قرآن کریم کے ساتھ ایسے سلوک کر رہے ہیں۔)اور ہم تک سچے لوگوں کی یہ روایات پہنچی ہیں کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو سورۂ بقرہ

کے حفظ میں دس برس سے زیادہ عرصہ بیت گیا تھا (کیونکہ قرآن کریم ان حضرات کے لیے قابل محبت، اپنی چیز تھی اس لیے وہ اس پر بہت غور وخوض کیا کرتے تھے تو زیادہ وقت اس میں صرف ہو جاتا تھا) اور پھر جب انہوں نے اس سورت کو یاد کر لیا تو ایسے خوش تھے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے ایک اونٹ ذبح کیا۔ اور اب یہ حال ہے کہ میرے سامنے بچے اپنی منزل سنانے بیٹھتے ہیں اور ایسی شاندار منزل سناتے ہیں کہ دس دس پارے ایک نشست میں حفظ سنا دیتے ہیں اور ایک حرف اور زیر زبر کی غلطی بھی نہیں کرتے لیکن ان حافظوں کا عمل کے بارے میں یہ حال ہے کہ گویا قرآن مانگے کی چیز ہے (اس میں جو احکامات اور مناہی آئی ہیں وہ گویا اس حافظ کے لیے نہیں کسی اور کے لیے ہیں حالانکہ تلاوت اور حفظ یہ خود کر رہا ہے)

علامہ شہاب الدین آلوسی رحمۃ اللہ علیہ اور رویت باری تعالیٰ

فرمایا اس آخری دور کے بے مثال مفسر علامہ سید شہاب الدین آلوسی رحمۃ اللہ علیہ صرف مفسر قرآن کریم ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ درجے کے صوفی بھی تھے۔ اپنی تفسیر ''روح المعانی'' میں انہوں نے تصوف پر بھی خوب تحریر فرمایا ہے، اکابر صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کی وکالت بھی خوب کی ہے اور متصوفین کا پردہ بھی چاک کیا ہے۔

رویت باری تعالیٰ کے سلسلے میں خود اپنے متعلق بیان کیا ہے کہ انھیں تین مرتبہ خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوئی اور یہ تیسری زیارت ۱۲۴۶ھ میں ہوئی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تجلیات کو مشرق کی سمت میں دیکھا اور باری تعالیٰ نے اپنا پاک کلام

ان پر القاء فرمایا جو کہ انھیں یاد نہیں رہا۔ ایک مرتبہ یہ بھی دیکھا کہ گویا وہ جنت میں بارگاہ خداوندی میں حاضر ہیں اور لؤلؤ و مرجان کا پردہ حائل ہے۔ ان پتھروں کے مختلف رنگ ہیں اور حکم دیا گیا کہ اس شخص کو مقام عیسوی اور مقام محمدی علیہما السلام کی سیر کرائی جائے۔ پھر سید شہاب الدین محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ کو ان مقامات کی سیر کرائی گئی لیکن وہاں پر انہوں نے کیا مشاہدہ کیا اس کا تذکرہ نہیں تحریر فرمایا صرف یہ لکھا کہ وہاں جو کچھ کہ میں نے دیکھا، دیکھا۔ اور پھر ان انعامات پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے۔

عقل جب وحی کے تابع ہو تو، پاک ہوتی ہے.

فرمایا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بار بار پاکیزہ رہنے کی تلقین کی ہے طہارت پر زور دیا ہے اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غسل، وضو اور تیمّم ہی طہارت ہے جب کہ طہارت اپنے بہت وسیع معنیٰ میں ہے۔ بلاشبہ جسم کی طہارت تو غسل، وضو اور تیمّم سے ہے لیکن روح اور مال سے کیسے صرف نظر کیا جا سکتا ہے۔ مال کی طہارت زکوٰۃ، صدقہ فطر اور جن جن کاموں پر جس قدر خرچ کرنا ضروری ہے، جب کوئی مالدار اِن اُمور میں اپنی ذمہ داری پوری کرے گا تو پھر اس کا مال پاک ہوگا۔ علم کی طہارت، جہالت سے نجات پانا ہے اللہ کی یاد (ذکر) کو غفلت ناپاک کرتی ہے اس لیے اس سے بچنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت پاک ہے، خالص دودھ ہے، گناہ اسے ناپاک کرتا ہے، خالص دودھ میں ناپاکی مل جاتی ہے اس لیے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ضروری ہے۔ عقل جب وحی کے تابع ہو تو پاک ہوتی ہے۔ دل شہوت سے خالی ہو تو پاک
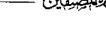
ہے۔نفس کی سب سے بڑی ناپا کی کفر ہے اور شریعت اسے پاک کرتی ہے اور جب غیر اللہ کا عدم اور وجود برابر ہو جائے تو پھر پا کیز گی کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

مشکلات کے حل کے لیے قرآنی وظیفہ

(فرمایا) زندگی میں جو بھی مشکلات پیش آئیں، ان میں چاہیے کہ وہ اوراد و وظائف جو کتاب و سنت اور صحیح احادیث میں وارد ہوئے ہیں، ان کو اپنا وظیفہ بنائے، مشائخ کرام رحمۃ اللہ علیہم اور اپنے اپنے سلسلے کے وظائف سر آنکھوں پر لیکن جو کلمات طیبات اللہ تعالیٰ نے یا حضرت رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمائے ہیں، ان کا تو کہنا ہی کیا، بھلا ان کے ہم وزن بھی کسی کے تجویز کردہ وظائف ہو سکتے ہیں؟ حدیث میں سورۂ توبہ کی آخری آیت کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس میں تو ایسی زبردست تاثیر ہے کہ کوئی شخص اگر اس وظیفے کو سات مرتبہ صبح اور سات مرتبہ شام کو پڑھ لے خواہ اس یقین سے پڑھے کہ اللہ تعالیٰ میری تمام مشکلات کو حل فرما دے گا اور یا پھر یقین نہ ہو اور محض اُوپری زبان سے پڑھ لے، تو بھی اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے گا۔ حدیث شریف کا یہ مفہوم ذہن میں رکھ کر کوئی اگر سات مرتبہ صبح اور سات مرتبہ شام کو یہ پڑھ لے۔

حَسْبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْم.

ترجمہ: وہ اللہ (تمام مشکلات میں مجھے) کافی ہے، جس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور عرش جیسی بڑی مخلوق کو
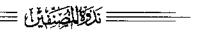
پالنے والا بھی وہی ہے۔

تو مشکل کیا ہے؟ حل مشکلات کے لیے جہاں اور ہزاروں جتن کرتا ہے، یہ ایک چھوٹا سا وظیفہ بھی پڑھ لے تو کیا جاتا ہے؟

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اور امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مقام و مرتبہ

فرمایا امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں جو حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو ضعیف لکھا ہے تو اس کو کون پوچھتا ہے؟ اس جملے کی وقعت ہی کیا ہے۔ آئمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم اس مقام سے بہت بلند و بالا ہیں کہ کوئی ان پر جرح کر کے یہ ثابت کرے کہ وہ متروک اور ضعیف تھے۔ اصول حدیث میں یہ بات طے شدہ ہے کہ ان آئمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم کے بارے میں جرح کو قبول ہی نہیں کیا جائے گا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان کہ ہمارے زمانے میں سوائے انصاف کے باقی ہر چیز کثرت سے ہے۔
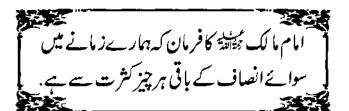
فرمایا حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی گئی اور اس موقع پر فرشتوں نے جن اشکالات کا اظہار کیا، جب ان اشکالات کی حقیقت واضح ہوگئی تو فرشتوں نے اپنی لاعلمی اور اللہ تعالیٰ ہی کے عالم الغیب ہونے کا برملا اظہار کیا، جو کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ
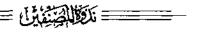
اپنے دور کے متعلق ارشاد فرماتے تھے کہ ہمارے زمانے میں سوائے انصاف کے باقی ہر چیز کثرت سے ہے۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ یہ شکایت کر رہے ہیں جب کہ زمانہ دوسری صدی ہجری کا تھا۔

پھر امام ابوعبداللہ انصاری قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کا حال بیان کرتے ہیں کہ دیکھو یہ تو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کی شکایت کر رہے ہیں۔ ہم آج اپنے زمانے کو کیا کہیں جس میں فساد مچ گیا ہے اور کمینوں کی کثرت ہوگئی ہے۔ علم، حکومتی عہدے حاصل کرنے کے لیے سیکھا جا رہا ہے۔ علم، شعور اور انسانیت کے لیے پڑھنا تو مٹ چکا۔ علم تو اس لیے حاصل کیا جا رہا ہے کہ دنیا میں خوب ٹھاٹھ اور ریاکاری سے رہیں۔ اپنے دور کے علماء سے مناظرے کر کے غالب رہیں اور وہ جھگڑے ہیں جن سے دل سخت ہو جائیں اور ایک دوسرے کے خلاف بغض پیدا ہو اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تقویٰ ختم ہو گیا اور اللہ تعالیٰ کی ہیبت دلوں سے نکل گئی۔

حضرت امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ دور ساتویں صدی ہجری کا ہے۔ ان کا انتقال ۶۷۱ھ میں ہوا ہے گویا کہ آج سے 763 برس قبل۔ پھر ان آٹھ صدیوں میں جو علم اُٹھا اور رخصت ہوا۔ غیر مسلم اقوام کی تعلیمات کا غلبہ اور تہذیب تبدیل ہوگئی ہے۔ شہروں کے شہر کتب خانوں سے خالی ہوگئے ہیں اور جب محض نام کے علماء رہ گئے ہیں اور علم سے کورے ہیں اور علم کی طلب ہی نہیں رہی تو پھر کتب خانے کیونکر بنیں؟ اگر وہ حضرات اُمت کا یہ حال دیکھ لیتے تو کیا ارشاد ہوتا۔
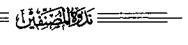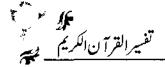
علم میں اضافے کی دعا مانگتے رہنا چاہیے۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے حضرت رسالت مآب ﷺ کو بعض اشیاء اور امور کے متعلق یہ حکم دیا کہ وہ ان میں اضافے کی دعا مانگتے رہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ ان میں سے ایک چیز ''علم'' ہے، جس کے متعلق حکم ہوا کہ اس میں اضافے کی دعا مانگتے رہیے اور دوسری چیز قیام اللیل یا تہجد ہے جس کے متعلق ارشاد ہوا کہ آپ اسے آدھی رات سے بھی کم کردیں یا بڑھالیں۔ لیکن یہاں آدھی رات سے زیادہ کو غالباً مستحسن تو قرار دیا لیکن اضافے کی دعا صرف علم ہی کے لیے ہوئی اور تہجد یا قیام اللیل میں نصف شب سے بھی زیادہ وقت کو پسند فرمایا۔ نہ اضافے کا حکم دیا نہ اس وقت کے اضافے کے لیے دعا مانگنے کو ارشاد فرمایا بلکہ وقت کی کمی یا اضافے کو اختیاری کردیا۔ علم میں البتہ اضافہ، مانگنے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اس سے علم کی فضیلت اور اہل علم کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جب اس آیت رَبِّ زِدْنِیْ عِلْماً (اے میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما) کو پڑھتے تھے تو تلاوت روک کر پھر یہ دعا مانگتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ زِدْنِیْ عِلْماً وَ اِیْمَاناً وَ یَقِیْناً.

(ترجمہ): اے اللہ میرے علم، ایمان اور یقین میں اضافہ فرما۔

❀ ❀ ❀

اللہ ذی المعارج کے ہاں قدر دانی اب بھی ویسی ہی ہے مگر......!
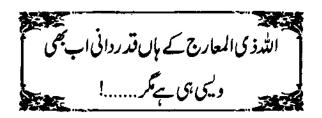
فرمایا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنی ایک صفت اور اپنا ایک نام بیان کیا ہے ''ذِی الْمَعَارِجِ'' (زینوں کا مالک، سیڑھیوں والا) اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان جس بھی اچھی منزل پر پہنچ چکا ہو، اس پر اکتفا اور قناعت نہ کرے بلکہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا رہے، کسی بھی ایک مقام پر رُکے نہیں بلکہ ہر لحہ، ہر دم، ہر ماہ و ہر سال عروج کا سفر اور عروج کی طلب بڑھتی رہنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ معارج (سیڑھیوں، زینوں) والا ہے تو انسان جتنی بھی ترقی اور قرب الٰہی کی منازل طے کرے گا ہر مقام، ہر زینے اور ہر سیڑھی پر اللہ تعالیٰ کو اپنا منتظر پائے گا وہ ہر ہر مقام اور عروج کی سیڑھی پر اس کا استقبال کرے گا۔ یہ جتنا آگے بڑھے گا، ذات اقدس اس مسافر کی ہر منزل پر قدر دانی کرے گی۔ مگر اس عروج کے لیے مرد چاہئیں وہ باہمت مرد جو سمندر کی گہرائی سے زیادہ اتھاہ ہیں، وہ مرد جن کی ہمت کے سامنے پہاڑ پاش پاش ہیں اور وہ مرد جن کے متعلق مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست
زین ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

گفتم کہ "یافت می نشود جستہ ایم ما"

گفت "آنکہ یافت می نشود، آنم آرزوست"

(ترجمہ مع مختصر تشریح) کل دو پہر شیخ چراغ ہاتھ پہ رکھ کر شہر میں ایک گم شدہ چیز تلاش کر رہے تھے اور یہ بھی فرمارہے تھے کہ میں شیطانوں اور درندوں میں رہ رہ کر ان سے تنگ آ گیا ہوں اور ایک انسان تلاش کر رہا ہوں کہ کسی انسان سے ملوں۔ یہ جو انسان نما جانور مجھے ملتے ہیں ان سے مل کر میرا دل بہت پریشان ہوتا ہے اور مجھے تو ایسے انسانوں کی تلاش ہے جیسے شیر خدا سیدنا علی رضی اللہ عنہ تھے اور جیسے ہم کہانیوں میں ایران کے پہلوان رستم جیسے بہادر انسانوں کے قصے پڑھتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ شیخ ہم بھی ایسے ہی انسان کی تلاش میں ہیں اور بہت ڈھونڈا لیکن اب انسان ناپید ہوئے اور نہیں ملا کرتے۔ شیخ فرمانے لگے "وہ جو تمھیں تلاش کے باوجود نہیں ملا، میں بھی اسی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔"

اسی لیے تو تابعین کہتے تھے کہ ہم حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو کوئی اکیلے جنت میں تھوڑا ہی جانے دیں گے۔ خوب معرکہ ہوگا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی جانیں گے کہ وہ اپنے بعد کیسے کیسے "مرد" چھوڑ کر گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِينَ ﴿۱۳﴾ وَقَلِيلٌ مِّنَ الْآخِرِينَ ﴿۱۴﴾ (سورۂ واقعہ)، (وہ جنت میں جانے والے ایک بڑا گروہ پہلے لوگوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) میں سے ہوگا اور کچھ تھوڑے لوگ، جو بعد کے زمانوں میں آئیں گے (انہی پہلے لوگوں کے ہمراہ

ہوں گے))اب بھی باہمت افراد کی تلاش ہے۔ اللہ ذی المعارج کے ہاں قدر دانی اب بھی ویسے ہی ہے لوگ بدلے ہیں ان کا پروردگار تو نہیں بدلا۔ وہ تو اب بھی عروج کو پسند کرتا ہے، بلاتا ہے لیکن سیڑھیاں چڑھنے کی ہمت کرنے والے افسوس کہ کم رہ گئے

نہ تھا اگر تو شریک محفل قصور میرا ہے یا کہ تیرا
میرا طریقہ نہیں کہ رکھ لوں، کسی کی خاطر مئے شبانہ

مسلسل ترقی اور ہمیشہ آگے بڑھنے کی کیسی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اس لیے مومن کا راستہ کبھی طے نہیں ہوتا، ہر ایک منزل کے بعد ایک نئی منزل اور ہر ایک ٹھکانے کے بعد ایک نیا ٹھکانہ یہی وہ جذبہ ہے جو مسافر پر جب طاری ہوتا ہے تو وہ زبان حال سے یہ نعرہ لگاتا ہے۔

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

جو لوگ مراقبہ ذات پر پہنچ کر سمجھتے ہیں کہ سالک کا سلوک طے ہوا وہ دھوکے میں ہیں۔ یہ مراقبہ ذات مقدسہ تو خود لامتنٰہی ہے۔ یہ کہیے کہ اسباق تمام ہوئے یہ مت کہیے کہ سلوک ختم ہوا وہ تو اب جاری ہے صوفی اسے زندگی میں شروع کرتا ہے پھر قبر میں بھی اس مراقبے کی منازل طے ہوتی رہتی ہیں پھر حشر، پھر جنت، پھر ذات مقدسہ چونکہ خود لامتناہی ہے اس لیے اس کے قرب کا سفر بھی لامتناہی ہے۔ یہ سلوک بھی کبھی بھلا مکمل ہونے والی راہ ہے؟ یہاں تو ہر صبح نئی پیاس ہے اور ہر شام نئی سیرابی ہے۔

یہی حال مومن کی دنیا کی ترقی کا بھی ہے وہ جس راہ پر بھی گامزن ہو ہر لمحہ آگے بڑھنا ہے، ہر لمحہ نئی سیڑھی پر قدم رکھنا ہے۔ ہر روز کی اپنی اور نئی ترقی ہے اور ہر شام کو وہ

نئی منزل پرانی ہے۔ مومن اپنے نفس سے بار بار یہ کہتا ہے۔

ع گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بننا چاہیے

فرمایا دنیا میں شرافت کے ساتھ زندگی گذارنا ہو تو ہر شخص جو اپنے فن کا ماہر ہے، اس فن میں اس کی بات مان کر چلنا چاہیے۔ پھر کبھی تو یہ صورت ہوتی ہے کہ اس علم وفن کے حاذق و ماہر سے ابتداء ہی سے اختلاف ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کا حل یہ ہے کہ ادب کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے کہ یہ ضروری ہے اپنے دلائل کو مرتب کر کے اختلاف رائے کو بلا جھجک بیان کر دینا چاہیے۔ اس موقع پر بڑے حضرات کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے چھوٹوں کی رائے اور دلائل کو خندہ پیشانی سے سنیں۔ برداشت کریں اور دلیل کا جواب دلیل سے دیں نہ یہ کہ محض اپنے بڑے ہونے کی دلیل کے بل بوتے پر دوسروں کی دلیل کو بے وزن قرار دیا جائے۔ پھر کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ کام شرع ہو جاتا ہے اور نت نئے تجربات پیش آتے ہیں تو ان نتائج کو اس علم وفن کے ماہر کے سامنے رکھتے رہنا چاہیے تا کہ ان کے تجربے سے فائدہ اُٹھایا جا سکے یا پھر نئی بات ان کے علم میں بھی آئے۔ لیکن کچھ ہو جائے، چھوٹا ہو یا بڑا کبھی بھی اپنی تعریف، اپنے منہ میاں مٹھو بننا، یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی بات ماننی چاہیے کہ اس نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے کہ بلا وجہ اپنی پاکیزگی کا ڈھنڈورا مت پیٹتے رہا کرو۔ اسلاف میں اس بات کا بہت اہتمام تھا کہ اس آیت کریمہ میں جو حکم آیا ہے اس کو منٗ وعنٗ مانا

جائے اور جب تک کوئی شدید ضرورت پیش نہ آئے اپنے متعلق تعریفی کلمات نہ کہے جائیں۔ وہ مٹے ہوئے لوگ اور ریا سے پاک ان کے اعمال تھے۔

امام علی بن عمر دار قطنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں علم حدیث کے امام تھے۔ امام اسفرائنی، حاکم نیشاپوری، ابونعیم اصفہانی، ابوالقاسم التنوخی اور قاضی ابوالطیب الطبری رحمۃ اللہ علیہم جیسے علماء اور محدثین تو ان کے شاگرد تھے۔ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ نے امام دارقطنی جیسا کوئی صاحب علم بزرگ دیکھا ہے، تو انہوں نے فرمایا، خود امام دارقطنی نے اپنے جیسا کوئی شخص نہیں دیکھا ہوگا تو بھلا میں کہاں سے دیکھ سکتا ہوں؟

امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد رجاء بن محمد فرماتے ہیں کہ میں نے امام دارقطنی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ نے دنیائے اسلام میں کوئی اپنے جیسا دوسرا شخص دیکھا ہے؟ تو انہوں نے قرآن کریم کی یہی آیت پڑھ دی کہ بلاوجہ اپنے تزکیے کا اظہار مت کرو۔ پھر جب میں اپنے سوال کے جواب پر اصرار کرتا رہا تو بس یہ فرمایا کہ علم حدیث پر اپنی کتابوں کے ذریعے جو میں نے کام کیا ہے، اب تک کسی سے نہیں ہو سکا۔ اس لیے اسلاف کا یہ رویہ ہم سب کے لیے قابل تقلید ہے۔

تفسیر قرآن کریم کے دو بنیادی اُصول

فرمایا تفسیر قرآن کریم میں یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ استفہام انکاری سے اللہ تعالیٰ کی مراد اثبات قطعی ہوتا ہے اور "بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا" (صبح وشام) سے مراد یہ وہ صبح وشام نہیں ہوتے، جو طلوع وغروب آفتاب سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ اس سے مراد "برابر"، "علی الدوام"، "ہمیشہ" ہوا کرتا ہے۔

حدیث مبارکہ

وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔

(پ:۲۸،سورۃ الحشر، آیت:۷)

① اور حضرت رسالت مآب ﷺ تمھیں جو کچھ (احکامات) دیں وہ لے لو (ان پر عمل کرو)

② اور جن کاموں سے وہ تمھیں منع کردیں، ان سے رُک جاؤ.

③ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو.
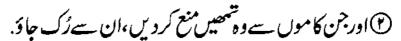
④ اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بڑا سخت ہے.
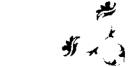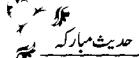
حضرت مولانا مفتی محمد سعید خان صاحب دامت برکاتہم العالیہ کا اجازت نامہ سلسلۂ حدیث مبارکہ۔

حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی رحمۃ اللہ علیہ (مدرس حدیث جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی) کو علوم حدیث میں جو تبحر حاصل تھا۔ وہ چنداں محتاج تعارف نہیں۔ جناب مفتی محمد سعید خان صاحب نے ان سے علمی استفادے کے لیے ۱۴۱۷ھ میں بیرون ملک ایک سفر سے واپسی پر کراچی میں رُکے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے اپنے وقت کے قابل اساتذہ اور مشائخ وقت رحمہم اللہ سے علم حدیث پڑھ چکے تھے لیکن حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق اور مزید علم حاصل کرنے کی طلب اس قیام کا باعث بنی اور حضرت مولانا عبدالرشید صاحب نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے دولت خانہ پر رہ کر ان سے ابن ماجہ سبقاً سبقاً پڑھی اور دیگر کتب احادیث کے مشکل مقامات بھی سمجھے۔ اس موقع پر حضرت مولانا نعمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں اپنے دست مبارک سے جو سند لکھ کر عنایت فرمائی اس کا عکس قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين سيدنا ومولانا محمد وعلى آله وأصحابه أجمعين وبعد فقد أجزت الشيخ العالم محمد سعيد خان بن محمد حنيف خان وفقه الله تعالى وإياه لما يحبه ويرضاه برواية جميع ما حوى هذا الثبت بذكر أسانيدها وأوصيه بتقوى الله تعالى في السر والعلن وأن لا ينساني من صالح دعواته في خلواته وجلواته وأن يسعى في بث العلم ونشره والله الموفق وصلى الله على نبينا محمد وسلم

كتبه الفقير إليه تعالى
محمد عبد الرشيد النعماني غفر الله له
ولوالديه وأحسن إليهما وإليه
يوم السبت ٢١ من جمادى الأولى ١٤١٦ھ

اہل مدینہ کوستانے والے کے لیے بددعا اوراس کی فوری قبولیت.

فرمایا حضرت رسالت مآب ﷺ کا ارشاد گرامی صحیح مسلم وغیرہ میں آیا ہے کہ جو شخص اہل مدینہ کوستانے کا ارادہ کرے اللہ تعالیٰ اسے ایسے ختم کردے جیسے نمک پانی میں گھل کر ختم ہوجاتا ہے۔ یہ بددعا ایسے بہت سے بدبختوں کے حق میں پوری ہوئی جنہوں نے اہل مدینہ کوستایا۔ خاص طور پر واقعہ حرہ میں کہ یہ چونکہ اہل مدینہ کے لیے نہایت کڑی آزمائش کے دن تھے اوران کے ساتھ جو کچھ بھی ہورہا تھا، یزید کے حکم سے ہورہا تھا اس لیے یزید بھی اس واقعے کے فورا بعد تقریباً پچھتر (75) دن میں مرگیا اور حضرت رسالت مآب ﷺ کی دعا کی قبولیت کا ایک اور معجزہ ظاہر ہوا۔

حضرت خضر علیہ السلام سے متعلق جمہور اُمت کا مسلک.
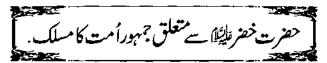
فرمایا حدیث کی کتاب ''مشارق الانوار'' کی ایک شرح ''مبارق الازہار'' کے نام سے عزالدین بن عبداللطیف بن عبدالعزیز المعروف بابن الملک المتوفی ۷۹۷ھ نے تحریر فرمائی ہے۔ اس میں جمہور امت کا مسلک یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کا انتقال نہیں ہوا بلکہ وہ زندہ ہیں۔

غیر محتاط افراد کے کلام اور لایعنی باتوں کے سننے سے گریز.

فرمایا انسان اپنا ہاتھ بجلی سے محفوظ رکھتا ہے کیونکہ یہ یقین ہے کہ بجلی کا کرنٹ نقصان
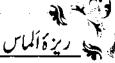
دے گا، اسی طرح بد منظر اشیاء کو بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا کہ طبیعت پر بُرا اثر پڑتا ہے ایسے ہی حضرت رسالت پناہ ﷺ نے کانوں کے متعلق بھی یہ فرمایا ہے کہ اپنے کانوں کو تکلیف دہ باتوں سے بچاؤ۔ اس لیے زندگی میں اگر کوئی مثبت کام کرنا ہو تو فضول گو، غیر محتاط افراد کے کلام اور لایعنی باتیں سننے سے ہمیشہ گریز کر کے اپنی صلاحیتوں کو مثبت کاموں میں استعمال کرنا چاہیے۔

صحیح بخاری کے اختتام پر پڑھنے کے لیے ایک خاص دعا

فرمایا مدارس میں جو بچے دورۂ حدیث میں صحیح بخاری کی قرأت کرتے ہیں یا دورۂ حدیث کے طالب علم ہوتے ہیں، انھیں چاہیے کہ صحیح بخاری کے سبق کے اختتام پر یہ دعا مانگ لیا کریں۔ ہاتھ اٹھانا تو دعا کے آداب میں سے ہے اگر حضرت شیخ الحدیث صاحب ہاتھ اٹھا کر دعا مانگیں تو ہاتھ اٹھا کر، وگرنہ بغیر ہاتھ اٹھائے یہ دعا مانگا کریں۔

اَللّٰهُمَّ اسْمِعْنَا خَيْرًا وَاطَّلِعْنَا خَيْرًا، وَارْزُقْنَا اللّٰهُمَّ الْعَافِيَةَ وَأَدِمْهَا عَلَيْنَا، وَاجْمَعْ اللّٰهُمَّ قُلُوْبَنَا عَلَى التَّقْوٰى وَوَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰى، رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا، رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا، رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَاطَاقَةَ لَنَا بِهٖ، وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْلَنَا، وَارْحَمْنَا، أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ.

(ترجمہ) اے اللہ ہمیں خیر کی خبر سنا اور ہمیں خیر ہی پر مطلع فرما اور اے اللہ ہمیں عافیت نصیب فرما اور ہمیں ہمیشہ ہمیشہ عافیت سے رکھ۔

اے اللہ ہمارے دلوں کو تقویٰ کے کاموں پر جمع فرمادے اور ہمیں ان اعمال کی توفیق دے جن سے تو راضی اور خوش ہو۔

اے ہمارے پروردگار ہم پر گرفت نہ فرما جب ہم بھول چوک جائیں، مالک ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالے تھے۔

اے پروردگار ہم سے وہ بوجھ نہ اُٹھوا، جس کو اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ نرمی برت، ہم سے درگذر فرما، ہم پر رحم کر، تو ہی ہمارا کارساز ہے، سو ہمیں کافروں پر غالب کر۔

دوسروں کو کھانا کھلانے کی فضیلت.

فرمایا دعوت کا ایک بہترین طریقہ یہ بھی ہے کہ جن کو کھانا کھلانا ہو ان کے لیے ایسا کھانا پکوایا جائے جس کو وہ خوشی سے کھالیں اس لیے کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی مسلمان کا دل کسی جائز چیز کو چاہتا ہو اور کوئی شخص اسے مہیا کردے تو اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادیتے ہیں اور ایک روایت میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مسلمان بھائی کو وہ کھانا کھلادے جس کی اسے خواہش ہو تو اللہ تعالیٰ دوزخ کی آگ اس پر حرام کردیتے ہیں ایسے ہی ارشاد گرامی ہے کہ جن کاموں کے کرنے سے رحمت الٰہی واجب ہوجاتی ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ غریب مسلمانوں کو کھانا کھلایا جائے ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے ان انسانوں پر فخر کا اظہار فرماتا ہے جو لوگ دوسروں کو کھانا کھلاتے ہیں کہ

دیکھو میرے بندے کتنے اچھے ہیں۔

سادات کرام کے ساتھ نیکی کا صلہ

(فرمایا) سادات کرام کے ساتھ نیکی کرتے رہنا چاہیے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص بھی حضرت عبدالمطلب کی اولاد کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا تو میرے لیے یہ ضروری ہے کہ جب قیامت میں، اس سے ملوں تو اس کے احسان کا بدلہ چکا دوں۔

موت کی آزمائش اور ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریح

(فرمایا) حضرت رسالت مآب ﷺ نے کئی ایک ادعیہ میں ''موت کی آزمائش'' سے پناہ مانگی ہے تو یہ موت کا فتنہ (آزمائش) ہے کیا؟ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے ''فتوحات مکیہ'' میں اس کی تشریح کی ہے کہ جب کسی میت پر موت کا وقت قریب آتا ہے تو شریر جنات اور شیاطین اس میت کے پاس مختلف شکلیں اور روپ دھار کر آتے ہیں۔ کبھی اس کے دوستوں کی شکل میں اور کبھی اس کے بھائیوں کے روپ میں، کبھی اس کے آباء واجداد کے حلیے میں اور کبھی اس کے فوت شدہ بزرگوں کی صورت میں اور پھر اس میت کو ایمان سے ورغلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ شخص اپنا ایمان سلامت لے کر اس دنیا سے نہ جائے۔ چنانچہ اسے کبھی تو عیسائی ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور کبھی یہودی ہونے کی، کبھی مجوسی ہونے کو کہتے ہیں اور کبھی یہ تلقین کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مبارکہ کو غیر مؤثر سمجھے۔ الغرض اسے کفر کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ یہ

ہے "فتنة الممات" (موت کی آزمائش) اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ خاتمہ بالخیر فرمائے۔

کیا "ہرقل" نے آبائی مشرکانہ مذہب چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرلی تھی؟

فرمایا حضرت رسالت مآب ﷺ نے جو گرامی نامہ "ہرقل" کو تحریر فرمایا ہے، اس میں اسے اہل کتاب میں شمار فرمایا ہے حالانکہ ہرقل اصلاً اہل کتاب میں سے نہیں تھا بلکہ اس نے اپنے آبائی مشرکانہ مذہب کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بھی اپنا مذہب تبدیل کر کے عیسائی یا یہودی ہو جائے گا اسے اس حدیث کے مطابق اہل کتاب ہی میں شمار کیا جائے گا۔ مثلاً ایک ہندو، عیسائی ہو جائے تو پہلے وہ مشرکین کے حکم میں تھا اس کا ذبیحہ درست نہیں تھا لیکن اب درست ہو جائے گا۔ کوئی ہندو، سکھ، مجوسی عورت پہلے اپنے مشرکانہ مذہب پر قائم تھی اس کا ذبیحہ اور مناکحت جائز نہ تھی اب عیسائی یا یہودی ہوگئی تو اہل کتاب کے حکم میں آ گئی اس کا ذبیحہ اور مناکحت جائز ٹھہری اور یا پھر یہ مانا جائے کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے عرف عام کے قاعدے کے مطابق ہرقل کو عیسائی شمار فرمایا۔ یہ بات علم شریف میں نہیں تھی کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کر کے عیسائی ہوا تھا۔

دُہرے اَجر کی بشارت کن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ہے؟

فرمایا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے جو حضرات پہلے یہودی یا عیسائی تھے اور پھر وہ
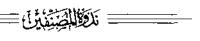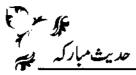
شرف صحابیت سے مشرف ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ

اُولٰئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ ۔

اللہ تعالیٰ انھیں دُہرا اَجر دے گا۔ (پ:۲۰، سورۂ قصص، آیت:۵۴)

تو اس دُہرے اَجر کی وجہ کیا ہے؟ حضرت رسالت مآب ﷺ نے فرمایا تین آدمیوں کے لیے دُہرا اَجر ہے۔

① اہل کتاب میں سے وہ شخص جو اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان لایا اور پھر مجھ پر بھی ایمان لایا۔ (دو انبیاء علیہم السلام کا امتی ہونے کی وجہ سے دُہرا اَجر)

② غلام جس نے اللہ تعالیٰ کے حقوق بھی پورے کیے اور اپنے آقا کے حقوق میں بھی کوتاہی نہیں کی۔ (دو طرح کی غلامی ہوئی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بھی دُہرا اَجر دیا)

③ وہ شخص جس کے پاس کوئی باندی تھی، اس نے اس کی اچھی تربیت کی اور اسے عمدہ تعلیم دلائی پھر اسے آزاد کر کے اس سے شادی بھی کر لی تو اس کے لیے بھی دُہرا اَجر ہے۔ (کیونکہ اس نے آزاد بھی کیا اور پھر بیوی بھی بنالیا اس لیے اسے دُہرا اَجر ملا)

قرآن کریم کی آیت سے اور اس صحیح حدیث کی رو سے معلوم ہوا کہ عیسائی اور یہودی کے لیے اسلام قبول کرنے کی صورت میں اسے تمام نیک اعمال پر دہرا اجر ملے گا۔ اس بشارت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنھوں نے عیسائیت یا یہودیت ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا اور غیر صحابہ، یعنی کسی بھی دور کے عیسائی یا یہودی سب برابر ہیں۔ محدثین اور مفسرین نے اس آیت کریمہ کے شان نزول پر بحث کی ہے کہ یہ دُہرے اَجر والی بشارت کی آیت کن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور پھر چار شخصیات کا نام لیا ہے۔
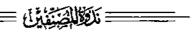
① حضرت عبداللہ بن سلاّم رضی اللہ عنہ ② حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ

③ حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ ④ حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہ

پہلے تین حضرات کا نام لینا تو درست ہے کیونکہ حضرت عبداللہ بن سلاّم رضی اللہ عنہ نے یہودیت کو ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا اور حضرت سلمان فارسی اور حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہما نے عیسائیت ترک کر کے اسلام قبول کیا تھا اس لیے ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی لیکن حضرت کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ کا نام لینا درست نہیں ہے کیونکہ جب یہ آیت نازل ہوئی ہے، حضرت کعب رحمۃ اللہ علیہ تو اس وقت موجود ہی نہ تھے، وہ تو حضرت امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں مسلمان ہوئے ہیں۔ وہ تابعی ہوئے نہ کہ صحابی۔ ہاں یہ ہے کہ وہ دہرے اجر کی اس بشارت میں یقیناً شامل ہیں کیونکہ اہل کتاب (یہودی) سے مسلمان ہوئے ہیں۔ اس بشارت میں تو قیامت تک آنے والا ہر اہل کتاب شامل ہے لیکن شان نزول سے اگر یہ مراد لی جائے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کون اس آیت کے نزول کا مصداق بنتے ہیں تو پھر حضرت کعب بن احبار رحمۃ اللہ علیہ یقیناً اس آیت کا مصداق نہیں بنتے کہ وہ تو تابعین میں سے ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین.

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حافظے کے لیے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم دعا کے اثرات.

فرمایا حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ شام تشریف لے گئے تھے۔ پھر انہوں نے وہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابیں وہاں عام مل جاتی تھیں۔ اور وہ ان کتابوں سے استفادہ بھی فرماتے تھے لیکن ان پر عبادت غالب آ گئی

تھی۔ بہت زیادہ عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ ہر تیسرے دن قرآن کریم مکمل کرلیا کرتے تھے۔ گویا کہ دس پارے روزانہ تلاوت فرماتے تھے اور ہمیشہ ایک دن کا ناغہ دے کرایک دن کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ تمام عمر اس عبادت کو نبھایا اور ایسی عبادت جوانی میں بھی بس وہی شخص کرسکتا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے عبادت کی توفیق بخشی ہو، بڑھاپے میں تو جسم کمزور پڑ جاتا ہے اور اس حالت میں ایسی عبادت تو اور بھی دشوار ہوجاتی ہے، تو ان پر علم کی بجائے عبادت کا غلبہ ہوگیا تھا۔ حضرت رسالت مآب ﷺ کی اجازت سے یہ اہل کتاب کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا کرتے تھے لیکن یہی بات ان سے محدثین کی قلت روایت کا سبب بھی بن گئی۔ تابعین عظام رحمۃ اللہ علیہم میں سے بہت سے آئمہ ایسے تھے جنہوں نے اسی وجہ سے ان سے حدیث کی روایت نہیں کی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے کثیر الروایۃ صحابی اگرچہ یہ اعتراف کرتے تھے کہ حدیث کی روایت میں یہ مجھ سے بڑھ گئے ہیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ سے یہ جو کچھ سنتے تھے لکھ لیتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود اب ہم اگر کتب حدیث کو دیکھیں تو جتنی روایات حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ملتی ہیں، ان سے نہیں ملتیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک فرما دیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے آٹھ سو تابعین نے روایت حدیث کی ہے اور یہ ان کی ایسی خصوصیت ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے، جو روایت حدیث میں ان کے ہم پلّہ ہو اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے تابعین کی روایت کردہ احادیث بہت ہی کم ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جیسے ان پر عبادت کا غلبہ ہوگیا تھا، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ پر علم کا غلبہ تھا۔ وہ اپنی

حیات طیبہ کے آخری دور تک روایت حدیث اور فتویٰ دینے میں مصروف رہے ہیں۔
ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ مصر، طائف اور شام میں جو رہے ہیں تو احادیث کی جستجو میں اگر چہ لوگ ان شہروں میں رہے ہیں لیکن جیسا مرجع خلائق مدینہ منورہ تھا، اتنے یہ شہر نہیں تھے اور مدینہ منورہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے چنانچہ ان کی روایات بہت زیادہ کتب احادیث میں آ گئیں۔ اور جو لوگ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی احادیث کی کثرت اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی احادیث کی قلت پر بحث کرتے ہیں شاید یہ بات بھول جاتے ہیں کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حافظے کے لیے جو دعا فرمائی تھی اس کا اثر بھی تو ظاہر ہونا تھا۔ کہاں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حافظے میں محفوظ احادیث اور کہاں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قید کتابت میں لایا ہوا، ذخیرۂ احادیث، تقابل ہی دشوار ہے۔

مرویات سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کی تعداد.
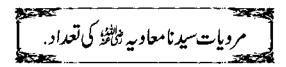
فرمایا محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے تصریح کی ہے کہ امیر شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احادیث روایت کی ہیں، ان کی تعداد ایک سو تریسٹھ (163) ہے۔ علم میں نہیں ہے کہ اب تک کسی نے ''مسند معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہما'' مرتب کی ہو اور پھر اس پر تحقیق، ترتیب، تنقیح اور تشریح بھی کی ہو، یہ کام کرنا چاہیے۔ لیکن جذباتی تقریروں اور نعرے لگانے سے فرصت ملے، تو یہ علمی کام ہونا!

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ذوق شعر و شاعری.
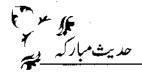
فرمایا اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بکثرت اشعار حفظ تھے۔ اپنی حیات طیبہ میں جب بھی انہوں نے تقریر کی ہے، اپنے کلام کی وضاحت اور استناد کے لیے اشعار سے ضرور استدلال فرمایا ہے۔ شعراء اپنے کلام پر ان کے نقد کو مستند مانتے تھے اور اپنی شاعری ان کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جو قصائد حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہے ہیں ان میں سے بھی کچھ حصہ برائے انتقاد، انہی کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ شعر و شاعری کی وجہ سے جو ذوق میں نکھار آتا ہے، اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس نعمت سے بھی حظ وافر ملا تھا۔ ان کے اوڑھنے، پہننے کے متعلق جو روایات آتی ہیں، ان سے بھی اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے۔ حضرت مسروق رحمۃ اللہ علیہ جو تابعین میں ایک خاص مقام رکھتے تھے انھوں نے اپنے بلوغ سے پہلے حضرت اُم المومنین رضی اللہ عنہا کی زیارت کی ہے، اس وقت آپ نے سرخ جوڑا زیب تن فرما رکھا تھا اور چونکہ انھیں زیارت کا شرف حاصل ہوا تھا اس لیے یہ جب بھی ان کی کوئی روایت بیان کرتے ہیں تو فرماتے ہیں "حدثتني الصديقة بنت الصديق" (حضرت صدیقہ بنت صدیق رضی اللہ عنہم نے مجھ سے یہ حدیث بیان کی۔)

چھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کثرت سے احادیث روایت کرنا.

فرمایا چھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شمار ان ہستیوں میں ہے، جنھوں نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

کی احادیث بکثرت روایت کی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے ان تمام حضرات کی عمریں بہت طویل ہوئیں ہر ایک کی عمر پچھتر (75) برس سے زائد ہی ہوئی۔ ان چھ حضرات نے بعض روایات تو وہ بیان کیں جو حضرت رسالت مآب ﷺ سے براہ راست سنی تھیں اور بہت سی روایات وہ بھی جو انہوں نے اپنے سے عمر میں بڑے، اکابر صحابہ کرام، خلفائے راشدین، اصحاب بدر اور عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم سے بھی سنی تھیں۔ ان چھ میں پہلی تو حضرت اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں۔ اپنے شوہر نامدار، حضرت رسالت پناہ ﷺ کی وفات پر ان کی عمر ۱۸ برس تھی پھر ان کا اپنا انتقال ۵۸ھ میں ہوا تو کل عمر (76=58+18) چھہتر (76) برس ہوئی۔ دوسری ہستی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ۵۹ھ میں ہوا اور عمر میں یہ حضرت ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دو برس زیادہ تھے تو اس اعتبار سے ان کی عمر 78 برس ہوئی۔ تیسری ہستی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی ہے۔ ہجرت کے وقت ان کی عمر گیارہ برس تھی۔ بدر اور اُحد کے میدان میں اپنے والد امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی معیت میں حاضر ہوئے ہیں لیکن حضرت رسالت مآب ﷺ نے بہت شفقت فرمائی اور ان کی کم سنی دیکھ کر انھیں لوٹا دیا۔ پھر یہ پہلی مرتبہ غزوۂ خندق میں شریک ہوئے ہیں اور ان کی عمر پندرہ برس سے زائد ہو چکی تھی پھر ان کا انتقال واقعہ کربلا کے بھی بعد عبدالملک بن مروان کے دور میں ہوا ہے۔ جبکہ ان کی عمر چھیاسی (86) برس ہو گئی تھی۔ چوتھی ہستی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، ان کی عمر تو سو برس سے بھی کچھ زیادہ ہی ہوئی۔ پانچویں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما ہیں ان کی عمر چورانوے (94) برس ہوئی اور مدینہ منورہ میں یہ غالباً آخری صحابی ہیں، جن کے انتقال کے بعد وہ پاک
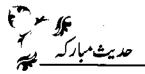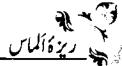
شہران پاکیزہ ہستیوں کے وجود سے خالی ہوگیا اور چھٹی ہستی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ہے ان کی عمر نسبتاً کم ہوئی کہ ستر برس میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ تو ان طویل عمروں میں ان حضرات نے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کی صحبتوں سے خوب فائدہ اٹھایا اور بکثرت روایات بیان کیں اس لیے ان چھ حضرات کو جو "مُکثِرِین" (حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کثرت سے بیان کرنے والے) کہا جاتا ہے تو چنداں تعجب نہیں۔

نمازِ عصر کی حفاظت اور اسے باجماعت ادا کرنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے.

فرمایا نمازِ عصر اس اُمت سے پہلے کی اُمتوں پر بھی فرض تھی لیکن انھوں نے اس کی پابندی نہیں کی اور بہت نقصان اٹھایا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے نمازِ عصر کی حفاظت اور اسے باجماعت پڑھنے کی بار بار تلقین فرمائی کہ یہ امت خسارے میں نہ چلی جائے اسی لیے یہ ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص نے سورج طلوع ہونے سے پہلے والی نماز (فجر) اور سورج ڈوبنے سے پہلے والی نماز (عصر) کی پابندی کی، اسے دوزخ میں نہیں جھونکا جائے گا اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے نمازِ عصر کو باقاعدگی سے ادا کرنے کی عادت بنالی، اسے عصر کی نماز کا ثواب دوگنا دیا جائے گا۔
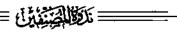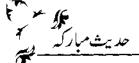
اگر ادلّہ قویہ کی بنیاد پر اسلاف کے علمی تسامحات سے
اختلاف کیا جائے تو یہ معیوب نہیں ہے۔

(فرمایا) مدینہ منورہ میں جب یہ سوال اٹھا کہ لوگوں کو نماز کے لیے کیسے جمع کیا جائے تو مختلف آراء سامنے آئیں۔ حضرت عَبْدُ اللّٰہِ بْنِ زَیْدِ بْنِ عَبْدِ رَبِّہٖ بْنِ ثَعْلَبَۃَ الْأَنْصَارِي رضی اللہ عنہ کو خواب میں اذان کی تلقین کی گئی اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خواب کی تصدیق فرمائی اور امت میں اذان کا آغاز اس دن سے ہوا۔ امام بخاری اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہما کا خیال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے صرف یہی ایک حدیث منقول ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے معیار پر صرف یہی ایک حدیث پوری اترتی ہے تو یہ بات درست مانی جاسکتی ہے ورنہ اَمرِ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے تو اس ایک حدیث کے علاوہ بھی متعدد روایات ملتی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی غلط فہمی کے ازالے کے لیے "مسند عبداللّٰه بن زيد بن عبد ربه بن ثعلبة الأنصاري" تحریر فرمائی اور اس میں اس حدیث اذان سمیت آٹھ احادیث ذکر کی ہیں کہ حضرت الامام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے تسامح پر متنبہ فرمادیں۔ ویسے حضرت حافظ رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے بھی محدثین نے حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی احادیث اپنی اپنی مسانید وغیرہ میں جمع کی ہیں مثلاً حمیدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں، ان کی پانچ احادیث روایت کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے اسلاف کے کام میں اگر علمی تسامحات پائے جاتے ہوں اور کوئی طالب علم ادلّہ قویہ کی بنیاد پر ان سے علمی اختلاف، ادب کے دائرے میں رہ کر

کرے تو یہ حضرات صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین اور سلف صالحین رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے طریقے کے مطابق ہے۔ جو اہل علم اپنے سلف صالحین کی اس راہ کو چھوڑ کر خواہ مخواہ اپنے مزعومہ اکابر کی غلطیوں کی تاویلات و توجیہات کرتے رہتے اور انھیں معصوم ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں وہ بیک وقت دو غلطیوں کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔

① اپنے اکابر کو معصوم جاننا حالانکہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مختار مسلک یہ کہ حضرت رسالت مآب ﷺ ہی آخری معصوم تھے۔ عصمت لوازمات ختم نبوت میں سے ہے۔

② علمی خیانت کہ حق بات سامنے آ جانے کے باوجود باطل کو ترجیح دینا یا سکوت کے جرم کا ارتکاب کرنا۔

اکابرین اُمت اور سلف صالحین رحمۃ اللہ علیہم کا ادب مطلوب ہے نہ کہ عبادت۔

امام عبداللہ بن وہب بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف کردہ ''موطا'' ——!

فرمایا امام عبداللہ بن وہب بن مسلم رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۵ھ میں مصر میں پیدا ہوئے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے عمر میں اکتیس (۳۱) برس چھوٹے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی ''موطا'' تالیف کی تھی۔ حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے تذکرے میں تحریر فرمایا ہے وَصَنَّفَ مُوَطَّأً کَبِیْرًا (اور امام عبداللہ بن وہب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑی مؤطا تصنیف فرمائی تھی) لیکن اب اس ''موطا کبیر'' کا وجود نہیں ملتا۔

عقل جب وحی کے تابع ہوتو یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔
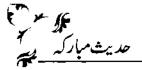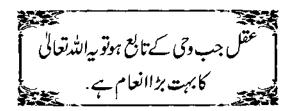
(فرمایا) عقل جب وحی کے تابع ہوتو پھر یہ عقل سلیم ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ انسان کو چاہیے کہ ہمیشہ ایسی عقل سے کام لیتا رہے، بر بنائے عقل، وحی کی خلاف ورزی نہ کرے۔ حضرت عروۃ قشیری رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے عقل دی، وہ یقیناً کامیاب ہوا، پھر دو مرتبہ میرے لیے دعا فرمائی اور دو کپڑے منگا کر مجھے پہنائے۔

بُخاری کے راوی ابن ابی فدیک رحمۃ اللہ علیہ سے مراد محمد بن اسمٰعیل یا محمد بن ابراہیم؟ ——— اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ
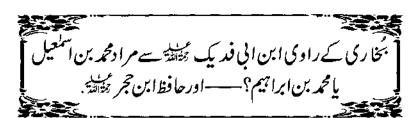
(فرمایا) حضرت امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ابی فدیک رحمۃ اللہ علیہ سے کتاب العلم میں جو روایت نقل کی ہے تو اس مسند میں ابن ابی فدیک رحمۃ اللہ علیہ سے مراد محمد بن اسمٰعیل بن مسلم ہیں نہ کہ محمد بن ابراہیم بن دینار۔ کیونکہ محمد بن ابراہیم بن دینار کی کنیت ابو عبد اللہ ہے اور ابن ابی فدیک کی کنیت ابو اسمٰعیل ہے۔ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ابن ابی فدیک کے معاملے میں عجیب بات یہ کی ہے کہ فتح الباری میں انھیں لیثی تحریر فرمایا ہے اور اسماء الرجال پر اپنی دونوں کتابوں تہذیب اور تقریب میں انھیں دیلی قرار دیا ہے۔

مورخین کے تحریر کردہ واقعات ضروری نہیں کہ سچائی پر ہی مبنی ہوں.

(فرمایا) مورخین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے دور کے واقعات تحریر کر دیتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان کا لکھا ہوا سب کچھ سچائی ہی پر مبنی ہو بلکہ وہ ایسی جھوٹی روایات و حکایات بھی قلمبند کر دیتے ہیں جن کی تردید خود ان کے معاصرین کر دیتے ہیں۔ محتاط مورخین کم ہیں اور پھر جو واقعہ تحریر فرمانا ہے، اس کے اسباب وعلل اور اس کے نتائج کی تنقیح کرنے والے تو اور بھی کم ہیں۔ اس لیے تاریخ پر اعتبار بہت گہری سمجھ کا متقاضی ہے۔ مستشرقین، اسلام پر جو اعتراض کرتے ہیں، ان میں سے بہت کم مستشرق ایسے ہیں جو اسلام کو صحیح معنی میں پڑھ کر اعتراض کرتے ہیں، اکثر ایسے ہیں کہ وہ صرف تاریخ کو پڑھتے ہیں اور عقیدے، تفسیر یا حدیث یا فقہ کو انھوں نے پڑھا نہیں ہوتا اور تاریخی روایات ہی کی بنا پر اسلام پر مختلف جھوٹے، افسانے اور قصے بنیاد بنا کر اسلام کو مطعون کرتے ہیں۔ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کتابت حدیث سے روک دیا تھا۔ اب یہ ایک روایت ہے۔ یہ روایت درست ہے یا نہیں؟ یہ تو ایک الگ بحث ہے لیکن مستشرقین اس روایت سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ دیکھو حدیث اتنا ناقابل اعتبار علم ہے کہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے اس کی کتابت تک سے روک دیا تھا، وہ جانتے تھے کہ مسلمان علم حدیث میں مشغول ہو جائیں گے اور

قرآن کریم کی تعلیمات سے غفلت اختیار کریں گے۔اس لیے انہوں نے منع کر دیا اور حدیث مسلمانوں کے دین کو نقصان پہنچا رہی ہے، لہٰذا علم حدیث نا قابل اعتبار ہے۔اسی بے ہودہ بات کو منکرین حدیث نے اڑایا اور لوگ سمجھتے ہیں کہ انکار حدیث ان منکرین کی ذاتی محنت و مطالعے کا نتیجہ ہے حالانکہ یہ تو صرف ناقل ہیں ان میں اتنا علمی عمق کہاں کہ یہ کتب حدیث تو درکنار ان مستشرقین معترضین ہی کی کتابوں کو براہ راست پڑھ سکیں۔جیسے ہمارے دور میں اہل حدیث حضرات کے بعض بچے بھی اٹھتے ہیں اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ پر اعتراض کررہے ہوتے ہیں اور بتانا یہ چاہتے ہیں کہ میری تحقیق یہ ہے۔حالانکہ ان کی اپنی تحقیق تو کیا خاک ہوتی انھیں تو کتابوں کے نام کا صحیح تلفظ تک نہیں آتا۔جس کسی سے سن لیا، تحقیق کے نام پر اس کی تقلید کر لی اور یہ الگ بات ہے کہ تقلید پر ہمیشہ نکیر کیے رہے۔سو یہ مستشرقین تاریخ کی کتابوں سے ایک بات اٹھاتے ہیں اور پھر اس کچی بنا پر جھونپڑا بنا کر یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ لو! تاج محل کھڑا ہو گیا۔امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اگر حدیث لکھنے سے منع فرمایا تھا تو ایک دور عہد نبوی میں بھی تو ایسا گذرا ہے کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے فرمودات تحریر کرنے سے منع فرما دیا تھا۔انہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تورات پڑھنے پر عتاب کا سامنا کرنا پڑا تھا اور وہ بھی تو دور آیا تھا کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم رات رات بھر بنی اسرائیل کی باتیں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔وقت اور مخاطب کے اعتبار سے بھی تو حکم بدلتے ہیں شہری اور دیہاتی کے احکامات بھی تو بدلتے

ہیں، علاقہ بدل جائے تو بھی تو حکم بدل جاتا ہے۔ اس لیے امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہ حکم کیوں دیا ہوگا اس کے اسباب اور یہ نتیجہ نکالنا کہ علم حدیث دین میں حجیت ہی سے محروم ہے، دونوں باتوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

پھر یہ اعتراض کچھ نیا بھی نہیں ہے۔ مستشرقین کو تو آج یہ راہ سوجھی ہے، روافض کو تو ہمیشہ سے یہ اعتراض رہا ہے۔ ابن ابی العباس حنبلی جس نے رفض اختیار کیا اور روافض کے شیخ سکاکینی جو مدینہ منورہ میں رہتے تھے، مدت مدید تک ان کی صحبت میں رہا۔ اس نے بھی یہی اعتراض کیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ احادیث ونصوص میں جو اختلاف روایات ہے ان سب کی اصل وجہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہوں نے اپنے دور میں تدوین حدیث پر پابندی لگا دی۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تو چاہا کہ احادیث لکھیں لیکن عمر رضی اللہ عنہ نے لکھنے نہ دیں اور اگر وہ احادیث کی کتابیں لکھ جاتے تو ان کی تحریرات امت تک ایسے ہی متواتر پہنچتیں جیسے کہ صحیح بخاری امت تک پہنچی ہے۔ امت کے درمیان اور حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان صرف ایک صحابی رضی اللہ عنہ ہی کا واسطہ رہ جاتا اور کتابیں ہم تک پہنچ جاتیں تو تمام احادیث متواتر ہوجاتیں۔ باوجودیکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جانتے تھے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت حدیث کی اجازت دی ہے پھر بھی انھوں نے اجازت نہیں دی اور افتراق امت جیسے عظیم گناہ کے مرتکب ہوئے۔ (معاذ اللہ)

حافظ ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات میں ابن ابی العباس حنبلی کی خوب خبر لی ہے اور اس کے اعتراض کا جواب بھی دیا ہے کہ اختلاف امت (جو کہ رحمت ہے)

کا سبب تواتر وعدم تواتر احادیث نہیں بلکہ ناقلین اور آئمہ کے درمیان جو فہم تفاوت ہے، وہ اصل میں مختلف ہے۔ اور یہ تفاوت حتیٰ کہ ان احادیث میں بھی ہے جو کہ متواتر ہیں۔ اگر تمام احادیث متواتر بھی ہوجاتیں تو اختلاف فہم کیسے ختم ہوتا؟ اور یہی سمجھنے کا اختلاف، امت کے لیے رحمت بنا۔ اس ابن ابی العباس حنبلی کو کئی مرتبہ توہین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر سزا بھی دی گئی اور جلاوطن بھی کردیا گیا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ یہ آخری عمر میں مدینہ منورہ پہنچ کر روضۂ اطہر پر ہی رہ پڑا تھا اور وہیں اس کی موت ہوئی۔ ان مستشرقین کے اعتراضات اور دسائس کی خبر، حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب لی ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، چھپ گیا، اس کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔

دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخنث اور ان سے متعلق اہم تفصیلات.
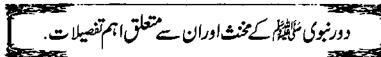
فرمایا احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں مخنث (ہیجڑے) خود حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں اور عام مسلمانوں کے گھروں میں جایا کرتے تھے اور کوئی انھیں منع نہیں کرتا تھا۔ مدینہ منورہ میں ـــــ یاد تو یہ پڑتا ہے ـــــ کہ صرف پانچ ہیجڑے ہوا کرتے تھے۔

① أنَّةٌ ② بهم ③ ماتع ④ هوان ⑤ هيت يا هنت (أبم هو هيبے)

ممکن ہے اور بھی ہوں لیکن ابھی تو یہی یاد پڑتا ہے۔ ان ہیجڑوں میں بھی کوئی ایسی خاص بے حیائی نہیں پائی جاتی تھی۔ صرف یہ تھا کہ مرد ہونے کے باوجود عورتوں

کی طرح چم وخم اور مٹک چٹک کر باتیں کرتے تھے، ہاتھ، پاؤں سب پر مہندی لگاتے تھے، خضاب کا استعمال کرتے تھے، اور بچیوں کی طرح گڑیوں سے کھیلتے تھے۔ یہ خواتین سے مشابہت تھی۔ ایک بات یہ ہے کہ کوئی انسان پیدا ہی اس طرح ہو تو نہ تو اس میں اس شخص کا کوئی قصور ہے اور نہ اس پر کوئی الزام ہے کہ وہ ہیجڑہ کیوں ہے؟ بس وہ پیدائشی طور پر ایسا ہی ہے۔ اسلام کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اس ہیجڑے کو محض اس کی طرز تخلیق پر ادنیٰ سی بھی ملامت کرے اور ایک یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے مرد بنایا ہے، اب وہ جان بوجھ کر عورتوں کی طرح ناز وانداز اختیار کرتا ہے، ایسی چال چلتا ہے، ایسے کپڑے پہنتا ہے کہ گویا وہ کوئی عورت ہے تو شریعت ان افعال کو سخت ناپسند کرتی ہے۔ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے شدید غصے کا شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے مرد ہونے کو ناپسند کرتے ہیں اور عورتوں سے مشابہت اختیار کرتے ہیں۔ ایسے مرد خواہ کسی فحاشی کا ارتکاب کریں یا نہ کریں، دونوں صورتیں غلط ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے ان ہیجڑوں میں سے ایک لڑکے کو دیکھا اور اس کے ہاتھ پاؤں سب میں مہندی رچی بسی تھی تو آپ نے تعجب کا اظہار فرماتے ہوئے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ اسے کیا ہوا ہے؟ تو عرض کیا گیا کہ یہ عورتوں کی طرح بنتا، سنورتا ہے۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ انھیں مدینہ منورہ میں رہنے کی اجازت نہیں، انھیں نقیع بھیج دیا جائے۔

نقیع اس چراگاہ کا نام تھا جو مدینہ منورہ سے تقریباً بیس (۲۰) میل کے فاصلے پر

تھی اور حضرت رسالت مآب ﷺ اس علاقے میں صدقہ وزکوٰۃ کے جانوروں کو چرنے کے لیے بھیج دیا کرتے تھے اور آپ کے بعد امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں نقیع کو سرکاری چراگاہ کا درجہ دے دیا تھا۔

سو یہ ہیجڑے نقیع بھیج دیے گئے تھے۔ یہ بھی عرض کیا گیا کہ ایسے مردوں کو (فحاشی پھیلانے کے جرم میں) قتل کر دیا جائے تو حضرت رسالت مآب ﷺ نے یہ کہہ کر منع فرما دیا کہ مجھے نماز پڑھنے والوں کو قتل کرنے سے منع کر دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز انسان کو بعض حالات میں قتل سے بچاتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ نبوی میں ہیجڑوں کی بھی یہ ہمت نہیں تھی کہ نماز چھوڑ دیں۔

ایک اور واقعہ یہ بھی پیش آ گیا تھا کہ غزوۂ طائف کے دوران حضرت اُم المومنین اُم سلمہ رضی اللہ عنہا اپنے خیمے میں تشریف فرما تھیں کہ ''ماتع'' ہیجڑہ ان کی خدمت حاضر ہوا۔ اسی اثنا میں حضرت رسالت مآب ﷺ بھی تشریف لائے تو ''ماتع'' حضرت اُم المومنین رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبداللہ بن ابی اُمیہ رضی اللہ عنہ (یہ اسی سال محاصرۂ طائف میں شہید ہو گئے تھے) سے کہہ رہا تھا (اور ایک روایت میں یہ آتا ہے کہ ان کی یہ گفتگو حضرت خالد بن ولید مخزومی رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوئی تھی لیکن غالباً ان کی یہ گفتگو حضرت عبداللہ بن ابی اُمیہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوئی ہوگی کیونکہ ماتع ان کا خدمت گذار بھی تھا۔ زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے) کہ کل اگر طائف فتح ہو جائے تو میں تمھیں غیلان کی بیٹی بادیہ دکھاؤں گا۔ یہ وہی غیلان ہیں جنھوں نے اسلام قبول کیا تو ان کی دس بیویاں تھیں۔ حضرت رسالت مآب ﷺ
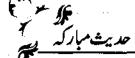
نے فرمایا کہ ان دس میں سے صرف چار کا انتخاب کرلو۔ بنو ثقیف کے سردار تھے اور امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے آخر پر ان کا انتقال ہوا ہے۔ ان کی یہ بیٹی بادیہ بھی اپنے والد کے ہمراہ ہی مسلمان ہوگئی تھیں۔ پھر ان کی شادی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے ہوگئی تھی۔ احادیث کی مختلف کتابوں میں طہارت کے ابواب میں یہ جو روایات آتی ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عورتوں کے ایام کے بارے میں استفسار فرمایا تو درحقیقت انہوں نے اپنی انہی اہلیہ محترمہ کی وجہ سے دریافت فرمایا تھا۔ حضرت بادیہ رضی اللہ عنہا تھیں بھی بہت خوبصورت، اتنی کہ حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ اگر بادیہ قیدیوں میں آئیں تو آپ اسے مجھے عنایت فرماویں ثقیف قبیلے میں بادیہ جیسی چندے ماہتاب کوئی لڑکی ہے ہی نہیں۔ لیکن یہ اپنے والد کے ہمراہ مسلمان ہوگئیں۔ پھر ماتع بولے کیا غضب کی لڑکی ہے آتی ہے تو چار بٹیں پڑتی ہیں اور پلٹتی ہے تو آٹھ۔ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ گفتگو سن لی اور فرمایا کہ افوہ! یہ ہیجڑے عورتوں کی ایسی باتوں کو جانتے ہیں! مجھے تو یہ خیال نہیں تھا کہ ان لوگوں میں بھی جنسی میلان پایا جاتا ہے۔ دیکھو آج کے بعد خبردار کوئی ہیجڑا مسلمانوں کے گھر میں داخل ہو۔ اور اس واقعہ کے بعد اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن نے ان ہیجڑوں سے بھی پردہ کرنا شروع کردیا تھا۔

ایک اور واقعہ یہ بھی پیش آیا تھا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ
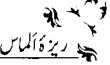
میں شادی کرنے کی غرض سے ایک لڑکی کو پیغام بھجوایا اور یہ بھی فرمایا کہ کوئی ایسا شخص ہو جو مجھے اس لڑکی کے متعلق بتا سکے (کہ وہ رنگ و روپ میں کیسی ہیں؟)

تو ماتع نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے یہ چار اور آٹھ بٹوں کا جملہ کہا تھا اور اسے حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا تھا اور بُرا منایا کہ اگر پردہ نشین خواتین کی اس طرح منظر کشی کی جائے گی تو پھر پردے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اور یہ ماتع اُم المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کے گھر آتے تھے اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ خیال بھی آیا کہ یہ لوگ خواتین کو ایسی گہری نظر سے بھی دیکھتے ہیں تو آپ نے انھیں مسلمانوں کے گھروں میں داخلے سے منع فرما دیا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو مدینہ منورہ سے بھی باہر بھیج دیا تھا تا کہ معاشرے میں بے حیائی رواج نہ پائے اور یہ شہروں سے دور سرکاری کام یا نوکری کرتے رہیں۔

کچھ محدثین کرام رحمہم اللہ کا خیال ہے کہ یہ جو ماتع ہے اسی کا نام ھنب ہے یعنی ایک ہی شخص کے یہ دو نام ہیں اور کچھ کا خیال یہ ہے کہ ھنب اور ھیت ایک ہی شخص کے دو نام ہیں اور محدثین کرام رحمہم اللہ سے تصحیف ہو گئی ہے۔ اس لیے ماتع، ھیت اور ھنب میں فرق دشوار ہے۔ اس ماتع کو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نقیع بھیج دیا تھا۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ بیداء بھیج دیا تھا جہاں پر کوئی آبادی نہیں تھی۔ یہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تنگدستی کی شکایت کی تو آپ نے انھیں اجازت دی کہ وہ ہر جمعہ کو بھیک مانگنے مدینہ منورہ

آیا کریں اور صرف اتنی اشیاء لیں جو آئندہ جمعہ تک کے لیے انھیں کافی ہوں اور پھر واپس چلے جائیں۔ چنانچہ وہ ہر جمعہ کو آتے رہے اور اپنی ضروریات زندگی لے کر واپس جاتے رہے۔ یہ اجازت بروز جمعہ اس لیے دی گئی ہوگی کہ جمعہ میں اجتماع ہوتا ہے اور ہر طرح کے لوگ اکھٹے ہوتے ہیں اس لیے خیرات ملنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جن کے معاشرے میں رہنے سے عام افراد کا مالی یا اخلاقی نقصان ہوتا ہو انھیں اگر شہر سے باہر الگ کر دیا جائے تو ان کو بغیر کسی معذوری اور صحت کے باوجود بھی، خیرات دی جاسکتی ہے۔ ان کا یہی عذر انھیں صدقہ لینے کا مستحق ٹھہراتا ہے کہ معاشرے میں ان کا وجود باعث نقصان ہے۔ بعض حالات میں قیدی بھی اسی رعایت کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

پھر جب خلیفۂ رسول اللہ ﷺ کا اپنا دور خلافت آیا تو آپ نے ماتع کو فدک بھیج دیا تھا۔

اَنَّۃ بھی مدینہ منورہ ہی میں رہتے تھے اور عورتوں جیسی حرکات تھیں۔ چونکہ یہ مسلمانوں کے گھروں میں آزادانہ آتے جاتے تھے اور کوئی روک ٹوک تو تھی نہیں اس لیے ہر گھر میں کتنے رشتے ہیں، یہ اس حقیقت سے واقف ہوتے تھے۔ اسی بنا پر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے چاہا کہ اپنے بھائی عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہم کی شادی کریں تو انہوں نے اَنَّــہ سے رشتہ دریافت کیا۔ انھیں اپنے اس بھائی سے محبت بھی بہت تھی اور چاہتی تھیں کہ بہت عمدہ رشتہ ملے۔ یہی ان کے وہ بھائی
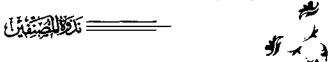
ہیں جن کا اچانک انتقال ہو گیا تھا اور حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا سفر پر تھیں۔ یہ ان کے لیے اچانک اور بہت شدید صدمہ تھا وہ اپنے اس بھائی کی قبر پر تشریف لے گئیں تھیں اور بہت درد انگیز اشعار بھی پڑھے تھے بہر حال آپ نے اَنَّـــہ سے فرمایا کہ ہمارے بھائی عبد الرحمٰن بن ابو بکر رضی اللہ عنہما کے لیے کوئی رشتہ بتاؤ۔ تو اَنَّہ نے وہی چار اور آٹھ بٹوں والا جملہ کہہ دیا تھا۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملے کو مناسب نہیں سمجھا اور فرمایا کہ اَنَّـــہ آپ حمراء الاسد کے علاقے میں چلے جائیں۔ یہ بھی ایک غیر آباد علاقہ تھا اور صرف ان کی رہائش کے لیے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں ایک گھر بھی عنایت فرمایا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو ایسے لوگ ہوں اگر حکومت انھیں عام آبادیوں سے الگ رہنے کے لیے مکانات دے اور لوگ انھیں صدقات و زکوٰۃ دیں تو یہ درست ہے۔

بچے کی پیدائش پر چند اہم کام.

فرمایا مختلف احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بچے کی پیدائش پر چند ایک کام ایسے ہیں جن سے فراغت ہو جانی چاہیے۔

① بچے کی پیدائش کے فوراً بعد اس کے جسم پر جو آلائش وغیرہ ہے اسے دھو دیا جائے یا پھر بچے کو غسل دیا جائے۔

② بچے کا نام تجویز کر دیا جائے۔ پہلے ہی دن نام رکھ دینا چاہیے۔
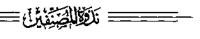
حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنے صاحبزادے ابراہیم کا نام پہلے ہی دن تجویز فرما دیا تھا اور گھر میں ولادت کی اطلاع جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دی تھی تو فرمایا تھا شبِ گذشتہ میرے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی ہے اور میں نے اس کا نام اپنے جدامجد حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام پر ''ابراہیم'' ہی تجویز کیا ہے۔ جن روایات میں یہ آیا ہے کہ بچے کا نام ساتویں دین رکھنا چاہیے ان روایات اور پہلے دن کی روایات کا تقابل کرتے ہوئے، امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ پہلے دن کی روایات ساتویں دن کی روایات سے زیادہ صحیح ہیں۔ اس لیے بچے کا نام پہلے دن ہی تجویز کر دینا بہتر ہے۔

③ ساتویں دن لڑکے کے ختنے کر دینے چاہیں۔ اگر ساتویں دن کے بعد بھی کر دیئے جائیں تو کوئی حرج نہیں، بہرحال لڑکے کے بالغ ہونے سے پہلے پہلے کر دینے چاہئیں اور اگر کوئی شخص بڑی عمر کا ہو اور اسلام قبول کرے اور اس کی بیوی اس کے ختنے کر سکے جیسے لیڈی ڈاکٹر ہو تو اسے اپنے شوہر کے ختنے کر دینے چاہئیں۔ اور اگر لڑکی ہو تو ساتویں دن اس کے کان چھید دینا بہتر ہے۔ ناک چھیدنے میں بھی کوئی حرج نہیں اور اگر کان ناک نہ بھی چھیدے جائیں تو کوئی حرج نہیں۔

④ بچہ ہو یا بچی دونوں کے سر کے بال ساتویں دن منڈا دینے چاہئیں۔ اگر ساتویں دن سے پہلے یہ رسم ادا ہو جائے تو بھی درست ہے لیکن ساتویں دن افضل ہے۔

⑤ بچے کا سر مونڈ دینے کے بعد کوئی خوشبودار چیز زعفران یا پاؤڈر وغیرہ بچے کے سر پر مل دینا چاہیے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نومولود بچوں کے سر مونڈ دینے کے بعد خوشبو لگانے کا حکم دیا کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں کافر اپنے
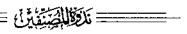
بچوں کی پیدائش پر بطور عقیقہ جانور ذبح کرتے تھے اور پھر اس کا خون روئی کے خشک پھویے میں خوب اچھی طرح جذب کر کے بچے کے سر پر اس طرح ملتے تھے کہ خون ایک لکیر کی صورت میں بہنے لگتا تھا۔ وہ یہ رسم کبھی تو بچے کے منڈے ہوئے سر پر کرتے تھے اور اس صورت میں خون کی لکیر واضح ہو جاتی تھی اور کبھی بچے کا سر مونڈنے سے پہلے کہ خون بالوں سے ٹپکتا تھا اور پھر وہ بچے کا سر دھوتے تھے اور بال منڈوا دیتے تھے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے اس رسم کو ختم کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ نومولود بچے کا سر منڈا کر اس پر عقیقے کے جانور کے خون کی بجائے خوشبو لگا دیا کرو۔

⑥　بچے کے سر سے جو بال اُتارے جائیں اتنے ہی وزن کی چاندی یا سونا یا پھر ان کی قیمت کے بقدر رقم بطور صدقہ راہ خدا میں خیرات کر دی جائے تا کہ بچہ محفوظ رہے اور اگر اس بچے کو کوئی بیماری وغیرہ لگ سکتی ہے تو اس صدقے کی وجہ سے وہ ٹل جائے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنے نواسے سیدنا حسن بن علی رضی اللہ عنہما کی پیدائش پر ان کی والدہ اور اپنی لخت جگر صاحبزادی صاحبہ رضی اللّٰہ عنہا و عن أبیہا سے فرمایا تھا کہ حسن کے سر کے بال اُتار دیں اور ان بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ بھی کرو۔ حضرت صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا فرماتی تھیں کہ میں نے ایسے ہی کیا جیسے مجھے انہوں نے حکم فرمایا تھا اور پھر جب میرا بیٹا حسین پیدا ہوا تو پھر اس کی ولادت پر بھی ایسے ہی کیا جیسے کہ حسن کے لیے کیا تھا۔ رضی اللّٰہ عنہم و عنّا.

⑦　بچے کی پیدائش کے ساتویں دن اس کا عقیقہ کیا جائے۔ عقیقہ کرنا کچھ فرض،

واجب تو ہے نہیں محض مستحب ہے کہ درحقیقت اولاد کی ولادت پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنا ہے اسی لیے مردہ بچے کا کوئی عقیقہ نہیں۔ جانور اس لیے بھی ذبح کیا جاتا ہے کہ بچے کی ولادت کی خوشی میں احباب واعزاء کی دعوت کی جائے اور اس لیے بھی کہ گوشت کا کچھ حصہ غرباء وفقراء کو صدقہ کر دیا جائے کہ بچہ تکالیف و بلایا سے محفوظ رہے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ کی تشریف آوری سے قبل بھی عربوں میں یہ رسم تھی۔ یہود مدینہ بھی اپنے بچوں کی طرف سے عقیقہ کیا کرتے تھے اور بیٹے کی طرف سے دو بکرے یا دنبے ذبح کرتے تھے اور لڑکی کی طرف سے کچھ بھی نہیں۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے اسے بُرا جانا کہ لڑکے کی طرف سے تو صدقہ ہو لیکن لڑکی کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس رسم کو تبدیل فرما کر حکم دیا کہ لڑکے کی طرف سے دو اور لڑکی کی طرف سے ایک جانور ذبح کیا جائے۔ پھر آپ نے اپنے بیٹے ابراہیم کی ولادت پر یا اس کے سات روز بعد بھی کوئی عقیقہ نہیں کیا اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عقیقہ سنت مؤکدہ بھی نہیں ہے وگرنہ آپ اپنے بیٹے کی طرف سے تو کم سے کم اس سنت کو ادا کرتے۔ یہ تو محض مستحب ہے۔ اور اسی لیے اپنے نواسوں کا عقیقہ کیا۔ بعض واعظین یہ جو روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے خود اپنا عقیقہ بھی کیا تو یہ محض جھوٹ ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے عقیقے میں حضرت رسالت مآب ﷺ نے ایک بکرا یا دنبہ ذبح کروایا تھا تو اس وقت مالی گنجائش اسی قدر تھی اور دو ذبح کرنے کی روایت بھی ملتی ہے۔ قاعدہ تو یہ ہے کہ لڑکے کی طرف سے اس کی پیدائش کے ساتویں دن دو بکرے یا دنبے

اورلڑکی کی طرف سے پیدائش کے ساتویں دن ایک دنبہ یا بکرا ذبح کیا جائے۔ یہ مستحب اور بہتر عمل ہے لیکن اس کے لیے قرض لینا یا کسی سے بھی سوال کر کے رقم حاصل کرنا یا رشتہ داروں پر بوجھ بننا بالکل جائز نہیں اور اس جانور کو ذبح کرنے کے بعد اس کی ہڈیاں توڑنے یا کاٹنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

غزوہ بدر میں اُمیہ بن خلف مارا گیا تھا یا اس کا بھائی اُبی بن خلف ــــ؟

فرمایا سیرت طیبہ کی کتابوں میں اہل سیر نے اس اختلاف کو نقل کیا ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی بدعا سے غزوۂ بدر میں کون مارا گیا تھا، اُمیہ بن خلف یا اس کا بھائی اُبی بن خلف؟ تحقیقی بات یہ ہے کہ قتل تو یہ دونوں بھائی ہوئے تھے لیکن غزوۂ بدر میں اُمیہ بن خلف مارا گیا تھا اور اُبی بن خلف غزوۂ اُحد میں مارا گیا تھا۔

مشرکین مکہ کے قائدین کیا اپنی اَنا اور ضد میں فرعون سے کم تھے؟

فرمایا اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرعون اور اس کے پیروکاروں کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگی رہی اور قیامت کے دن بھی لعنت ان کا پیچھا کرے گی۔ اس دنیا کی لعنت تو یہ ہوئی کہ قہر خداوندی ان پر نازل ہوا اور سب ڈوب مرے اور آخرت کی لعنت یہ ہے کہ آگ انھیں جلاتی

ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ انہوں نے اپنے دور کے نبی برحق سیدنا موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نصیحت کو نہ مانا اور اپنی تباہ کن روش پر اَڑے رہے۔ لیکن یہ کچھ سیدنا موسیٰ بن عمران علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کی خصوصیت نہ تھی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ایسے ہی متکبرین سے واسطہ پڑا تھا۔ یہ مشرکین مکہ کے قائدین اپنی اَنا اور ضد میں فرعون سے کیا کم تھے؟ اسی لیے جب یہ بدر میں جہنم واصل ہوئے تو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی لاشوں کو بدر کے کنوئیں میں پھینک دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ بدر کا یہ کنواں ویران تھا اور یہ لاشیں اس لیے ڈال دی گئیں کہ تعفن نہ پھیلے وگرنہ تو حربی کافر کی لاش کو دفن نہ بھی کیا جائے تو کون سی قباحت ہے؟ اور پھر جب ان ظالموں کی لاشیں گھسیٹ گھسیٹ کر کنوئیں میں پھینکنے کا عمل مکمل ہو گیا تو آپ نے وہی جملہ ارشاد فرمایا جو اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کے متبعین کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اور لعنت پڑی ان کنوئیں والوں پر۔ ان ملعونین میں سے اُمیہ بن خلف کو کنوئیں میں نہیں پھینکا جا سکا کیونکہ وہ حد سے زیادہ بھاری جسم کا تھا اور نہ ہی اس کی لاش گھسیٹی جا سکتی تھی۔ اس لیے اس کی لاش کے ایک ایک عضو کو کاٹ کر پھینک دیا گیا۔

کیا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی گرم پانی سے وضو یا غسل فرمایا تھا؟

فرمایا کتب حدیث میں اب تک یہ صراحت نہیں ملی کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

نے کبھی گرم پانی سے وضو یا غسل فرمایا ہو۔ حالانکہ مدینہ منورہ میں شدید سردی بھی پڑتی تھی اور لوگ موٹے کپڑے بھی پہنتے تھے تاکہ سردی کے اثرات سے جسم کو محفوظ رکھ سکیں۔ البتہ حضرت امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق بہت واضح طور پر روایات ملتی ہیں کہ آپ کے لیے ''قمقم'' میں پانی گرم کیا جاتا تھا اور آپ اس سے وضو یا غسل فرماتے تھے۔ عربی میں ''قمقم'' اس برتن کو کہا جاتا تھا جس کا منہ چھوٹا اور نیچے سے پیٹ یا پیندا بڑا ہوتا تھا۔ جیسے کہ ہمارے دور میں صراحی ہوتی ہے۔ اسے تانبے سے تیار کرتے تھے اور پھر کنڈوں میں رسی ڈال دی جاتی تھی اور جب پانی گرم کرنے سے یہ برتن بھی گرم ہو جاتا تھا تو ان رسیوں کی مدد سے اسے اُٹھا لیتے تھے۔ ایسے ہی ''قمقم'' چین سے آنے والے اس روغنی برتن کو بھی کہتے تھے جس میں پانی گرم کیا جاتا تھا اور وہ برتن مٹی ہی کا ہوتا تھا لیکن پانی گرم ہو جاتا تھا اور برتن ٹوٹتا نہیں تھا۔ ایسے گرم پانی سے لوگ وضو بھی کرتے تھے اور نہاتے بھی تھے۔

کسی کے خلافِ شریعت کام پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ردعمل کیا ہوتا تھا؟

فرمایا مختلف احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب کسی شخص کو کوئی ایسا کام کرتے ہوئے دیکھتے تھے جو ان کی نظر میں شریعت کے خلاف ہوتا تھا تو وہ اس کام کرنے والے کو یا تو منع کر دیتے تھے اور یا پھر ٹوک دیتے تھے اور یا پھر اس سے اس فعل کی وضاحت یا عذر دریافت کرتے تھے۔ پھر یہ ایک
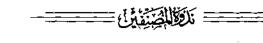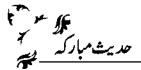
ایسا قاعدہ تھا کہ کوئی بھی، بڑے سے بڑا شخص بھی، اس سے مستثنیٰ نہیں تھا حتیٰ کہ خلافت راشدہ کے دور میں کوئی وزیر، امیر یہاں تک کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ بھی اس کلیے کے تحت آتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما عراق تشریف لے گئے، ان کے والد سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو وہاں کا گورنر مقرر کیا تھا تو انہوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے وضو میں اپنے موزوں پر مسح فرمایا ہے۔ غالباً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما یہ سمجھتے تھے کہ موزوں پر مسح کی رعایت صرف سفر کے لیے ہے اور جب کوئی شخص اپنے گھر پر ہو تو اسے مسح کی بجائے پاؤں کو دھونا چاہیے۔ اس لیے انھیں نہایت تعجب ہوا اور باوجودیکہ سعد رضی اللہ عنہ ان کے امیر تھے، انہوں نے اپنے اشکال کا اظہار فرمادیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے فرمایا عبداللہ اپنے والد سے پوچھ لینا۔ پھر ایک مرتبہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو سبھی حضرات اکٹھے تھے، تو فرمایا عبداللہ اب اپنے والد سے (موزوں پر مسح کرنے کا مسئلہ) پوچھ لو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت سعد رضی اللہ عنہ پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ڈانٹ دیا اور فرمایا دیکھو عبداللہ جب سعد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کوئی بات بیان کردیں تو پھر کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ گویا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی منقولات کی بھرپور توثیق فرمادی۔
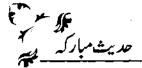
کتاب وسنت میں جہاں بھی سات اور ستر کا عدد آیا ہے
اس سے مراد کثرت اور مبالغہ بھی ہوسکتا ہے۔

فرمایا جن احادیث میں حضرت رسالت مآب ﷺ نے سات یا ستر کا عدد ارشاد فرمایا ہے وہاں پر یہ ضروری نہیں کہ سات اور ستر کا عدد ہی مراد ہو بلکہ بعض اوقات وہاں سات یا ستر سے مراد محض کثرت یا مبالغہ ہوا کرتا ہے۔ قرآن کریم میں بھی یہی اصول ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے جہاں سبعة ابحر (سات سمندر) کے الفاظ ارشاد فرمائے ہیں وہاں سات سمندر سے مراد پانی کی کثرت ہے نہ کہ عدد کے ساتھ گن کر سات سمندر۔ اور ایسے ہی حضرت رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ مومن ایک آنت سے کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں سے کھاتا ہے تو اس حدیث سے کیا ثابت ہوتا ہے؟ طبی نقطۂ نگاہ سے دیکھیں تو کافر اور مومن دونوں کی جسمانی ساخت بالکل یکساں ہے پھر کافر کی سات آنتیں کہاں ہیں؟ مراد درحقیقت یہ ہے کہ مومن کم کھاتا ہے اور کافر زیادہ (سات آنتوں سے) کھاتا ہے۔ صاحب ایمان شخص کو کھانے پینے سے زیادہ دلچسپی نہیں ہوتی وہ تو دنیا سے بے رغبت ہوتا ہے جبکہ کافر کو بالعموم کھانے پینے سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے کیونکہ اسے نہ آخرت کا خوف اور نہ حرام حلال کی تمیز اس لیے وہ کھاتا ہے تو بے دریغ کھاتا چلا جاتا ہے اس لیے سات آنتوں سے مراد کثرت وغفلت کا کھانا ہے نہ کہ کافر ومومن کی جسمانی ساخت کا کوئی فرق۔ اس لیے کتاب وسنت میں

جہاں بھی سات یا ستر کا عدد آئے تو اس سے معدود کا سات یا ستر ہونا ضروری نہیں، اس کے لیے کوئی مضبوط دلیل یا قرینہ چاہیے، وگرنہ مراد کثرت اور مبالغہ ہے۔

ویسے کافر کے سات آنتوں سے کھانے کے بارے میں حنفیہ میں سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت عمدہ توجیہہ تحریر فرمائی ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ایک کافر آیا تھا اور اس نے بہت زیادہ دودھ پیا تھا تو آپ نے اس خاص کافر ہی کے بارے میں ارشاد فرمایا تھا کہ یہ سات آنتوں سے دودھ پیتا ہے یعنی کثرت سے پیتا ہے اور بس۔ یہ بات ہر ایک کافر کے بارے میں کہی ہی نہیں گئی کیونکہ ہم خود معاشرے میں یہ دیکھتے ہیں کہ بہت سے مومن زیادہ کھاتے ہیں اور بہت سے کافر کم کھاتے ہیں تو پھر یہ حدیث کیسے درست ہوگی؟ اس لیے یہ کہا جائے گا کہ کافر و مومن کے کھانے میں یہ کوئی کلیہ قاعدہ نہیں بلکہ ایک امر واقعہ کا اظہار تھا کہ اس کافر نے بہت زیادہ (سات آنتوں سے) دودھ پیا تھا۔

فتح الباری اور علم حدیث میں فقہ کا امتزاج.

(فرمایا) جن حضرات کا یہ خیال ہے کہ حضرت حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ''صحیح بخاری'' کی شرح ''فتح الباری'' میں دیگر کتب احادیث سے محض احادیث نقل ہی کی ہیں اور تفقہ فی الحدیث پر کلام نہیں فرمایا، ایسے لگتا ہے کہ انہوں نے بھی محض ''فتح الباری'' کی دور سے زیارت ہی کی ہے، بنظر عمیق اس کا مطالعہ نہیں فرمایا وگرنہ اتنی بڑی تہمت کیسے ممکن تھی؟

''فتح الباری'' متعدد مرتبہ چھپ چکی ہے۔ اب دنیا کے گوشے گوشے میں پائی جاتی ہے۔ جن حضرات کا یہ دعویٰ ہے کہ تفقہ فی الحدیث پر کلام نہیں کیا گیا انھیں چاہیے کہ ''فتح الباری'' کی کوئی سی بھی جلد لے لیں اور صرف اس کا مطالعہ کریں تو اس دعوے کی قلعی کھل جائے گی۔ انصاف شرط ہے۔ یہ ایک کھلا ہوا چیلنج ہے کہ کوئی بھی شخص ''فتح الباری'' کا مطالعہ کرے اور پھر کسی بھی جلد کا مطالعہ کرے تو اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ سچائی کہاں ہے؟ محض اپنے حنفی ہونے کے تعصب میں اور حضرت حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کے شافعی المسلک ہونے کے ''جرم'' میں انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دینا کسی کے لیے بھی کب روا ہے؟

حضرت حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کا حال تو یہ ہے کہ صحیح بخاری کی جس بھی حدیث کے متعلق وہ یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ اس پر فقہی، اخلاقی، تاریخی یا فنی حیثیت سے کلام فرمائیں تو ان احادیث کی شرح کے آخر پر اور کبھی درمیان میں ضرور کچھ نہ کچھ تحریر فرماتے ہیں۔

حنفیت تعصب کی تعلیم تو نہیں دیتی وہ تو یہ سکھاتی ہے کہ ہر شخص کی حقیقی شخصیت کا اعتراف کیا جائے اور ہر شخص کو اس کا جائز حق ملنا چاہیے۔ اب ہمارے دور میں علم کا ذوق اتنا گر گیا ہے کہ جو اپنے کو زمرۂ علماء میں شمار کرتے ہیں، وہ صرف ''فتح الباری'' کا مکمل مطالعہ ہی اس انداز سے کرلیں کہ حضرت حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تشریحات اور ان کے مدعا کو سمجھ لیں، تو یہ بھی ان کے لیے کافی ہے اگرچہ الحمد للہ مستثنیات اب بھی پائی جاتی ہیں۔

سیرت النبی
صلی اللہ علیہ وسلم
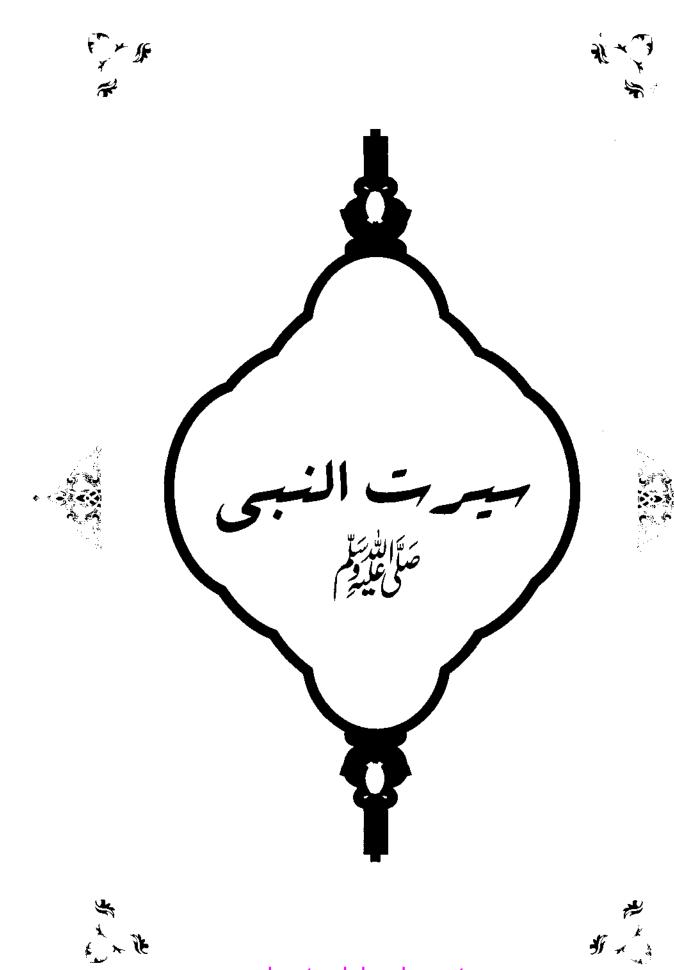
يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔

(پ:۹، سورۃ الاعراف، آیت:۱۵۷)

وہ (حضرت رسالت پناہ ﷺ تو اس شان کے نبی ہیں کہ) انھیں (تمام انسانوں کو) نیکی کے کاموں کا حکم دیتے ہیں اور انھیں بُرے کاموں سے منع کرتے ہیں اور انھیں صاف ستھری چیزیں جائز بتاتے ہیں اور ان کو ناپاک چیزیں، حرام بتاتے ہیں اور انسانیت پر جو بوجھ لدے ہوئے تھے، ان سے وہ (بوجھ) اتارتے ہیں اور وہ ان زنجیروں کو کاٹتے ہیں، جن (زنجیروں) میں (انسان) جکڑے ہوئے تھے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ مشرکین و کفار کو دعوت الی اللہ کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

(فرمایا) سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ مشرکین و کفار کو دعوت الی اللہ کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، ہر قیمت پر یہ مطلوب تھا کہ منکرین کو اسلام سے روشناس کرایا جائے اور ان کے دل جیتے جائیں۔

۶ھ میں صلح حدیبیہ ہوئی اور اس میں یہ شرط طے تھی کہ آپ ایک سال کے بعد مکہ مکرمہ تشریف لائیں گے۔ خانہ خدا میں حاضری دیں گے اور تین دن کے اندر اندر عمرہ کی ادائیگی کے بعد مدینہ منورہ واپس ہو جائیں گے۔ حسب معاہدہ آپ ذی القعدہ ۷ھ میں عمرۃ القضاء کے لیے تشریف لائے اور اسی اثنا میں آپ کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آپ کو پیغام بھجوایا کہ ان کی سالی حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا اپنے شوہر ابو رہم بن عبد العزیٰ کی موت کی وجہ سے بیوہ ہو چکی ہیں اور مناسب یہ ہے کہ آپ ان سے نکاح کر لیں۔ ادھر سے جواب ہاں میں دیا گیا اور حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنے چچا زاد حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بات پکی کرنے کے لیے بھجوایا۔ بات ٹھہر گئی اور عمرے کے بعد آپ تین دن حسب معاہدہ مکہ مکرمہ میں رُکے۔ اسی دوران نکاح بھی ہوا اور تیسرے دن سہیل بن عمرو، جو کہ صلح حدیبیہ میں اہل مکہ کے وفد کے سربراہ تھے کچھ افراد کے ہمراہ حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ معاہدے کے مطابق آج آخری تیسرا دن ہے اور اس کا سورج ڈوبتے ہی مدت پوری ہو جائے گی اور آپ مکہ مکرمہ سے روانہ ہو جائیں۔

اب اس موقع پر آپ نے جو حکمت عملی اختیار کی وہ قابل غور ہے۔ آپ نے فرمایا دیکھئے ابھی تو میرا نکاح ہوا ہے اور رخصتی باقی ہے۔ آپ اتنی تو مہلت مزید دیں کہ میں اپنی شب زفاف مکہ مکرمہ میں گذاروں۔ اس کے بعد ولیمہ ہو جس میں کھانا پکایا جائے اور آپ سب حضرات کو اس دعوت ولیمہ میں مدعو کیا جائے۔ اہل مکہ نے کہا کہ ہمیں آپ کے ہاں کھانا کھانے کی کوئی ضرورت نہیں اور آپ بس تین دن کی شق کو پورا کر دیں۔ حضرت رسالت پناہ ﷺ اگرچہ تشریف لے گئے، راستے میں ''سرف'' کے مقام پر رُکے اور اسی حالت سفر میں ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی ہوئی اور انھیں آپ کے خیمے میں اتارا گیا اور مشرکین مکہ کا رویہ یقیناً غیر مناسب تھا لیکن آپ نے انھیں دعوت ولیمہ اور اپنی خوشی میں شریک کرنے کا یہ موقع بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اپنے طرز عمل سے یہ سمجھا دیا کہ زندگی میں خوشی یا غم کیسا ہی نازک اور احتیاط کا وقت ہو اگر کافروں سے واسطہ پڑ جائے تو دعوت الی اللہ کے مواقع نہ صرف تلاش کرنے ہیں بلکہ اپنی بساط کی حد تک انھیں استعمال بھی کرنا ہے۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جو اسلام قبول کیا تھا، اس کی وجوہ میں سے ایک وجہ یہ نکاح بھی تھا۔

پانچ فرائض کی تعلیم دیجیے اور جنت کمائیے۔
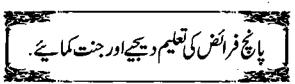
فرمایا حضرت رسالت پناہ ﷺ نے تعلیم کو عام کیا اور ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ لوگ علم کو عام کریں حتیٰ کہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دین و دنیا کا جو علم ضروری قرار دیا ہے، آدمی خود ان فرائض کو سیکھے اور پھر لوگوں کو اس کی تعلیم دے اور فرض کی تعداد خواہ ایک ہو یا دو
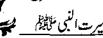
ہوں یا تین ہوں یا چار ہوں یا پانچ ہوں، جو شخص بھی ان فرائض کی تعلیم حاصل کرے یا پھیلائے وہ جنت میں جائے گا۔ سو ہر مسلمان مرد و عورت کو چاہیے کہ کم سے کم اپنی اولاد یا شاگردوں یا محلے والوں یا جو لوگ ان کے ادارے میں کام کرتے ہیں انھیں پانچ فرائض کی تعلیم دینے ہی کا اہتمام کر کے جنت کمائیں۔ مثلاً ایک فرض یہ ہے کہ اپنے سے بڑے خواہ والدین ہوں یا اساتذہ یا عام آدمی، جو بھی علم، عمل، عمر، عہدے اور رتبے میں بڑا ہے اس کی آواز سے بلند آواز میں نہ بولا جائے۔ دوسرا فرض یہ بھی ہے کہ جب کوئی شخص سویا ہوا ہو تو بلا وجہ اس کی نیند کو خراب کرنے والی کوئی حرکت نہ کی جائے۔ تیسرا فرض یہ بھی ہے کہ قرض واپس کرنے کی رقم جونہی آئے فوراً اس شخص کو شکریے کے ساتھ واپس کی جائے جس سے قرض لیا ہے، رات اور دن کا لحاظ کیے بغیر دوسرے کی رقم اسے ملنی چاہیے۔ چوتھا فرض یہ بھی ہے کہ اپنی اولاد یا کسی شخص کو بھی گالی نہ دی جائے۔ اولاد خواہ قصور وار ہی کیوں نہ ہو اور بیوی اور شوہر کیسی ہی زیادتی کیوں نہ کریں انھیں سمجھایا جائے یا ناراض ہو جائے تاکہ وہ اپنی اصلاح کریں یا کوئی اور طریقہ اختیار کر لیا جائے لیکن گالی ہرگز نہ دی جائے کہ کسی کو بھی گالی دینا کبیرہ گناہ ہے۔ پانچوں فرض یہ بھی ہے کہ انسان اپنے غصے کو اندھا دھند نافذ نہ کرے۔ ایسے بہت سے فرائض ہیں جنھیں ترک کر کے انسان گنہگار ہوتا رہتا ہے۔
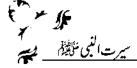
انسانوں کی خوبیوں اور اچھے اعمال پر ہی ہمیشہ نظر رہنی چاہیے۔

فرمایا سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ کی نظر مبارک انسانوں کی خوبیوں اور ان کے اچھے اعمال پر رہتی تھی اور نہ تو لوگوں کے سوءِظن کی خبر پر کان دھرتے تھے اور نہ ہی انسانی معائب پر کسی کو شرمندہ کرتے تھے۔ نگاہ تو ایسی گہری تھی کہ بسا اوقات لوحِ محفوظ کھل جاتا تھا اور کسی کی تقدیر کے احوال بھی بتا دیتے تھے لیکن دعوت کے میدان میں ایسے رحیم و کریم تھے کہ جب کوئی قبولیت دین کے لیے رغبت کا اظہار کرتا تھا تو گویا کہ وہ دن آپ کے لیے عید کا دن ہوتا تھا۔ مطالبہ ہوتا تھا کہ آپ تو تشریف لائے ہی ہیں آپ کے باقی دوست، اہل خانہ، شرکائے سفر، قبیلہ، کنبہ، باقی لوگ کہاں ہیں؟ عربوں کے قبیلے بنوسلیم سے ایک نوجوان قِدَدْ بن عمار سُلَیمی حاضر ہوا۔ اسلام قبول کیا اور حضرت رسالت مآب ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کی۔ وعدہ کیا کہ آئندہ حاضر خدمت ہوں گا تو اپنے ساتھ اپنے قبیلے کے ایک ہزار افراد کو پیش کروں گا۔ واپس گیا تو اپنے قبیلے کو تین حصوں میں تقسیم کیا، تین سو افراد پر عباس بن مرداس کو امیر مقرر کیا، تین سو مرد و عورت پر اخنس بن یزید کو اور آخری ثلث پر حیان بن حکم کو امارت دے کر منظّم کیا کہ ہم سب حضرت رسالت پناہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ سفر کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ یہ لڑکا قِدَدْ بیمار پڑ گیا۔ بخار جان لیوا ثابت ہوا اور اس نے قبیلے کو وصیت کی کہ دیکھو اس بارگاہ کی حاضری ضروری ہے اور انتقال
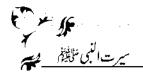
کر گیا ــــــ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ وَعَنَّا ــــــ حسب وصیت و وعدہ جب نو سو افراد اکھٹے، حضرت رسالت پناہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو لوگوں کو یہ گمان گذرا کہ کچھ ساز و سامان لینے حاضر ہوئے ہیں۔ فتح مکہ کا سال تھا اس لیے یہ گمان بعید از قیاس بھی نہ تھا لیکن حضرت رسالت مآب ﷺ کو یہ گمان کیوں نہ گذرا؟ وہ تو انسانوں کے قدر شناس اور ایسی سوچ سے بہت بلند و بالا تھے کہ منصب نبوت کے بالانشین تھے کیسے یہ گمان کرتے؟ ان نو سو افراد کو دیکھ کر پہلا سوال یہ فرمایا کہ کہاں گیا وہ تمھارا خوبصورت، گورا چٹا لڑکا، جو نہایت فصاحت سے بولتا تھا اور اپنے ایمان اور وعدے میں سچا تھا؟ عرض کیا گیا کہ اسے تو بخار نے آ لیا۔ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے اس کے لیے رحمت کی دعا فرمائی اور دریافت فرمایا کہ آپ کتنے افراد ہیں؟ جواب ملا نو سو، تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ سو مزید ہو کر، ہزار کب پورے ہو گے؟ انہوں نے اپنی مجبوری بتائی کہ قبیلے کے سو افراد کا زمینوں پر رہنا ضروری تھا۔ لیکن اسلام کی قبولیت تو زمینوں کی حفاظت سے زیادہ ضروری کام تھا اس لیے آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان سو کو بھی بلا لو، چنانچہ مقنع بن مالک بن امیہ کی قیادت میں مزید سو افراد آئے اور ایک ہزار آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَعَنِّيْ.

اب جن لوگوں کا خیال تھا کہ یہ افراد مال و دولت کے لیے حاضر ہوئے ہیں ان کا خیال درست نہ نکلا۔ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے اپنی شفقت، حسن ظن اور سلیقے سے اس میدان کو فتح کر لیا جو محض گمان و قیاس سے فتح نہیں کیا جا سکتا تھا۔
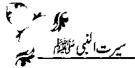
حضرت رسالت مآب ﷺ سے پہلے "محمد" نام کے چار افراد.

فرمایا: حضرت رسالت مآب ﷺ کی بعثت سے قبل ہی یہود و نصاریٰ آپ کی آمد کے منتظر تھے، وہ جانتے تھے کہ "محمد" نام کا ایک بچہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی حیثیت سے دنیا میں آئے گا۔ اوران کے اس علم سے باقی دنیائے عرب کو بھی علم تھا وگرنہ مشرکین مدینہ کو اس بات کی کیا خبر تھی؟ اور یہی وجہ تھی کہ مختلف لوگوں نے اپنے بچوں کے نام محمد رکھے تھے ان کا خیال تھا کہ شاید ان کے بچے اس منصب علیا پر فائز ہوں۔ حضرت رسالت مآب ﷺ سے قبل ① محمد بن عدی بن ربیعہ ② محمد بن احیحہ ③ محمد بن حمران ④ محمد بن خزاعی، کے نام ملتے ہیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے صاحبزادگان کے نام "محمد" اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی محبت رسول ﷺ کا جدا رنگ ——— !
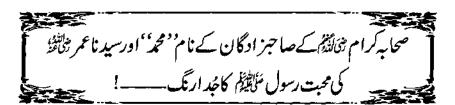
فرمایا: حضرت رسالت پناہ ﷺ کی ذات گرامی قدر تو کجا، ان کے اسم گرامی سے بھی ایسی محبت تھی کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے بیٹوں کا بھی یہی نام تجویز فرمایا تھا۔

① خلیفہ رسول اللہ ﷺ، سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کا نام محمد بن ابو بکر تجویز فرمایا اور ان کی کنیت ابوالقاسم تھی۔

② امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کا نام محمد بن علی رکھا اور ان کی کنیت بھی
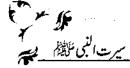
ابوالقاسم تھی۔

③ حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے بیٹے کا نام محمد رکھا، محمد بن سعد اور ان کی کنیت بھی ابوالقاسم تھی۔

④ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے بیٹے کا نام محمد رکھا ان کا لقب سجاد اور کنیت ابوالقاسم تھی۔

امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی محبت کا رنگ اور تھا۔ محبت کے ساتھ ادب کا بھی غلبہ تھا۔ اس لیے یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ لوگ اپنی اولادوں کے نام محمد رکھیں اور وجہ یہ بیان فرماتے تھے کہ جب تم اپنے بچے کو بُرے الفاظ میں ڈانٹو گے یا برا بھلا کہو گے تو اسم گرامی کا ادب اور لحاظ، ملحوظ خاطر نہ رکھا جا سکے گا، چنانچہ ان کے زمانے میں ایک صاحب کا نام عبدالحمید تھا اور انہوں نے اپنے بیٹے کا نام محمد رکھا تھا اور وہ اپنے بیٹے کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے انھیں بلایا اور فرمایا دیکھو یا تو کبھی بھی اپنے اس بیٹے کو گالی نہ دینا جس کا نام محمد ہے اور یا پھر میں جب تک زندہ ہوں اپنے بیٹے کو محمد کے نام سے مت بلانا۔ میں اس کا نام تبدیل کر کے عبدالرحمٰن رکھ رہا ہوں۔ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی ذات میں ادب اور محبت کا یہ اجتماع تھا کہ جس کا نام محمد ہو، اسے بُرا کہنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس لیے جو لوگ ایسی روایات بیان کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اولاد رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، وہ ان روایات کو نہیں پڑھتے کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ کے اسم گرامی "محمد" کی محبت اور ادب جس عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں ایسا تھا، وہ اس محمد ﷺ کی اولاد سے کیسی محبت کرتا ہوگا؟

دوسرا رنگ بھی دیکھیے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے سات بیٹوں کا نام محمد رکھا تھا۔ انھیں

محمد نام سے اتنا پیار تھا۔ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اس اسم گرامی کے ادب کی وجہ سے حکم بھجوایا کہ طلحہ اپنے بیٹوں کے نام تبدیل کرو۔ یہ ساتوں لڑکے حاضر ہوئے اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ نے غالباً یہ مسئلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حوالے کردیا کہ آپ خود ہی ان کے نام تجویز فرما دیں۔ ان ساتوں بھائیوں میں سب سے بڑے محمد بن طلحہ تھے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا نام بدلنا چاہا تو انہوں نے عرض کیا امیر المومنین آپ کو تو یاد ہوگا کہ جب میں پیدا ہوا تھا تو میرے والد طلحہ نے مجھے حضرت رسالت پناہ ﷺ کی گود میں ڈال دیا تھا۔ انہوں نے اپنا دست شفقت میرے سر پر پھیرا اور میرا نام خود ہی محمد تجویز فرمایا تھا۔ اب آپ خود دیکھ لیں، تو امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان ساتوں بھائیوں کو واپس بھیج دیا اور فرمایا بھئی جو نام حضرت رسالت پناہ ﷺ نے تجویز فرمایا ہو میری مجال نہیں کہ اسے تبدیل کردوں۔

حضرت کرز بن علقمہ خزاعی رضی اللہ عنہ اور ان کے قبیلے کی اہم خصوصیت.
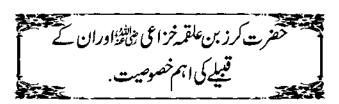
فرمایا سیرت طیبہ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اس حقیقت کو جانتے تھے کہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے بعد کوئی ایسی بڑی شخصیت اب آئی ہے، تو وہ حضرت رسالت پناہ ﷺ ہی کی ہے۔ حضرت کرز بن علقمہ خزاعی رضی اللہ عنہ اگرچہ مسلمان تو فتح مکہ کے موقع پر ہوئے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں بہت طویل عمر عنایت فرمائی تھی۔ حضرت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور تک حیات رہے اور اس دور میں مدینہ منورہ کا گورنر مروان بن حکم تھا اور مکہ مکرمہ میں وہ حدود حرم جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے متعین فرمائی تھیں اور وہاں پتھر

نصب کر دیئے تھے، ان کی تجدید کی ضرورت پیش آ گئی تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں ہی حکم دیا تھا کہ وہ حدود حرم کے پتھروں کی تجدید کریں۔ حضرت کرز رضی اللہ عنہ کا مشاہدہ بہت زبردست تھا۔ جس چیز کو دیکھ لیتے تھے، گویا کہ ان کے دماغ میں نقش ہو جاتی تھی۔ ان کا قبیلہ بہت "کُھرا باز" تھا اور عرب "کُھرے" کے سلسلے میں انہی سے رجوع کرتے تھے۔

"کُھرا" اردو زبان میں اس پکی جگہ کو کہتے ہیں جہاں بیٹھ کر کپڑے دھوئے جاتے ہیں یا کوئی نہاتا ہے یا پچھلے زمانوں میں پانی کے گھڑے رکھے جاتے تھے۔ اسی طرح یہ لفظ نشان، کھوج یا اتا پتا کے معنی بھی استعمال ہوتا ہے۔ کھرا باز یا کھوجی اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی انسان یا جانور کے پاؤں یا کُھر کے نشانات دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ یہ انسان یا جانور کہاں تک چل کر گیا ہے۔ ہمارے گاؤں یا دیہات میں جب چوری ہو جاتی ہے تو اس چور کے پاؤں کے نشانات یا کوئی جانور چوری ہو جائے تو اس کے کھروں کے نشانات کو دیکھ کر ایک کھرا باز یا کھوجی اصل مالکان کو لے کر چل پڑتا ہے اور ان پاؤں یا کھروں کو دیکھ کر چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ آخری پاؤں یا کھر تک پہنچ کر بتا دیتا ہے کہ چور یا جانور یہاں تک آیا ہے اور یا تو وہ مطلوبہ چیز یہیں ہے اور یا پھر یہاں کے لوگ اس چیز کے متعلق کچھ بتائیں کہ وہ کہاں ہے اور یا پھر یہ لوگ تاوان ادا کریں اور یا پھر آخری صورت یہ رہ جاتی ہے کہ اس کھرے کو اپنے گاؤں یا بستی سے نکالیں یعنی یہ بتائیں کہ یہ نشانات گاؤں کے کس حصے سے باہر نکل رہے ہیں۔ بنوخزاعہ کے لوگ مانے ہوئے کھوجی یا کھرا باز تھے اس لیے حضرت رسالت مآب ﷺ نے جب ہجرت فرمائی ہے تو مکہ مکرمہ میں شور مچ گیا کہ وہ اور ابوبکر کہاں چلے گئے؟ انھیں پکڑنا چاہیے۔ تلاش کے لیے

جو ذرائع استعمال کیے گئے ان میں سے ایک ذریعہ یہ بھی تھا چنانچہ انہی حضرت کرز بن علقمہ خزاعی رضی اللہ عنہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ یہ پاؤں کے نشانات دیکھ کر مکہ مکرمہ سے چلے اور غارِ ثور پر آ کر رُک گئے اور کفار مکہ کو کہا کہ یہ لوگ یہاں تک تو آئے ہیں اس کے بعد کھرا نہیں ملتا کہ یہ کہاں گئے؟ اور حضرت رسالت مآب ﷺ اور ان کے یار غار حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اسی غار کے اندر تھے۔ پاؤں اور کھروں کے نشانات کا مشاہدہ اس قبیلے کے لوگ تمام عمر کرتے رہتے تھے اس لیے یہ نقوش قدم کو خوب سمجھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت کرز بن علقمہ خزاعی رضی اللہ عنہ نے جب حضرت رسالت مآب ﷺ کا قدم مبارک دیکھا تو اہل مکہ کو کہا کہ دیکھو ابراہیم کے بعد یہ دنیا میں پہلا قدم ایسا دیکھ رہا ہوں جو اس قدم کے مشابہ ہے۔ مقام ابراہیم پر اُس پاؤں کو دیکھو اور پھر اس پاؤں کو دیکھو یہ تو دونوں یکساں ہیں۔ اس لیے اہل مکہ اور عرب اس حقیقت کو جانتے تھے کہ حضرت خلیل اللہ سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اصل وارث کون ہے اور اس جلیل القدر ہستی کے بعد اب پھر ایک ایسی ہستی نے وجود پایا ہے، جو اپنے جد امجد ہی کے نقش قدم پر ہے۔

؎ خامۂ او نقشِ صد امروز زیست — تا بیارد صبح فردائے بدست

شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت — تا چراغ یک محمد بر فروخت

صلی اللہ علیہم وسلم

شاہ حبشہ ''نجاشی'' سے متعلق اہم تحقیق

فرمایا سیرت طیبہ اور کتب احادیث دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم

ہیں اگر کوئی شخص ان دونوں علوم میں سے صرف ایک پر اکتفا کر کے دوسرے علم میں بھی مہارت حاصل کرنا چاہے گا، تو ٹھوکر کھائے گا۔ سیرت نگار کئی ایک ایسے حقائق سے بے خبر ہوتے ہیں جو احادیث میں بیان کیے گئے ہیں اور محدثین کبھی ان باریکیوں کو بیان نہیں کرتے، جو کہ سیرت نگار بیان کرتے ہیں۔ مثلاً مشرکین مکہ نے جب مسلمانوں کا جینا دوبھر کر دیا تو ہجرت حبشہ کی اجازت ملی۔ حبشہ کے بادشاہ نجاشی نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت آؤ بھگت کی کہ یہ مہاجرین تھے اور انھیں اپنے ملک میں بلا روک ٹوک ہر طرح سے رہنے کی اجازت دی۔ اہل مکہ نے اس بات کا سخت بُرا منایا اور ایک وفد اس نجاشی کی خدمت میں گیا تا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان مراعات سے محروم کروا دے لیکن ناکام ہوئے۔ اب اس ایک بادشاہ نجاشی کے انتقال کے بعد حبشہ کا دوسرا بادشاہ نجاشی بنا۔ نجاشی تو درحقیقت حبشہ کے تمام بادشاہوں کے لیے ایک لقب استعمال ہوتا تھا جبکہ ہر نجاشی کا نام مختلف ہوا کرتا تھا چنانچہ اب جو نجاشی بادشاہ ہوا تو اس کا نام اصحمۃ تھا۔ اس وقت تک یہاں مکہ مکرمہ سے ہجرت مدینہ ہو چکی تھی۔ صلح حدیبیہ بھی ہو چکی تھی اور ہجرت حبشہ پر کئی سال بیت چکے تھے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے جو گرامی نامہ تحریر فرمایا ہے، تو اس نجاشی کے نام تحریر فرمایا، اسے دعوت اسلام دی ہے جو انھوں نے قبول کی پھر ان کا انتقال ۹ھ میں ہوا تو حضرت رسالت پناہ ﷺ نے ان کا غائبانہ جنازہ پڑھا ہے اور چار تکبیرات کہی ہیں۔

سو یہ دو نجاشی الگ الگ ہیں۔ محدثین عموماً ان میں فرق نہیں کرتے اگر چہ امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ

نے کتاب الجہاد میں یہ فرق رکھا ہے اور اہل سیرت بھی اس میں فرق کرتے ہیں۔
جیسا کہ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''زاد المعاد'' میں اس کا لحاظ فرمایا ہے۔

شاہ مصر ''مقوقس'' کا بھیجا ہوا خچر، جو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دَور تک زندہ رہا.

فرمایا سیرت کی کتابوں میں شاہ مصر ''مقوقس'' کا تذکرہ ملتا ہے جس نے حضرت رسالت مآب ﷺ کے گرامی نامے کا جواب بھی پیش کیا تھا اور آپ کی سواری کے لیے ایک خچر بھی نذر گزرانا تھا۔ عربوں میں خچر کی سواری اعلیٰ درجے کی سواری سمجھی جاتی تھی اور وہاں کے خچر ہندوستانی خچروں سے قد و کاٹھ میں بڑے اور گھوڑوں سے چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس خچر کا نام ''دُلدُل'' تھا اور اس کی عمر بہت طویل ہوئی۔ سیدنا معاویہ امیر شام رضی اللہ عنہ کے دور تک بھی یہ ''دُلدُل'' زندہ تھا۔

گھروں میں سلام کرنے کی سنت مٹتی چلی جارہی ہے.

فرمایا سیرت طیبہ سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ انسان روزانہ صبح اُٹھے تو اپنے گھر والوں کو اور اہلیہ کو سلام کرے اور ان کے لیے دعا مانگے اور اگر بیویاں ہوں تو جس بیوی کے گھر آنے والی رات گذارنی ہو، یہ دن بھی اسی کے ساتھ گذارے لیکن اب چونکہ گھروں میں سلام کرنے کی سنت مٹتی چلی جارہی ہے اس لیے لوگ اپنی بیوی کو سلام کرنا تو اپنے وقار اور مرد کی شان کے منافی سمجھتے ہیں
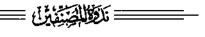
جب کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کا معمول یہ تھا کہ صبح کی نماز پڑھا کر اپنے مصلے پر ہی تشریف فرما ہوتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپ کے اردگرد حاضر خدمت رہتے تھے یہاں تک کہ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد آپ اپنی ایک ایک اہلیہ محترمہ کے حجرے میں تشریف لے جاتے تھے اور ہر ایک کو سلام بھی کرتے تھے اور انھیں دعا بھی دیتے تھے پھر جس ام المومنین رضی اللہ عنہا کی باری ہوتی تھی آپ اپنا دن بھی اسی گھر میں گذارتے تھے۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''زاد المعاد فی ہدی خیر العباد'' اور ان کے تسامحات.

فرمایا امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''زاد المعاد فی ہدی خیر العباد ﷺ'' تحریر فرما کر کتب سیرت میں نہایت خوبصورت اور اعلیٰ درجے کی علمی کتاب کا اضافہ فرمایا ہے اور شاید حقیقت یہ بھی ہے کہ سیرت اور حدیث کے امتزاج میں یہ کتاب اپنی مثال آپ ہے لیکن احادیث کی نقد و جرح اور نقل مذہب میں ان سے بہت تسامحات ہوئے ہیں ان کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہیے۔

مثلاً آپ پڑھیں گے کہ نماز میں قومہ کے اذکار میں وہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ بارگاہ الٰہی میں عرض کرتے تھے ''رَبَّنَا وَ لَكَ الْحَمْدُ'' اور کبھی یہ عرض کرتے تھے ''رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ'' اور کبھی یہ کہ ''اَللّٰهُمَّ وَ لَكَ الْحَمْدُ'' لیکن یہ روایات کہ آپ نے اس جملے میں اَللّٰهُمَّ اور ''واو'' کو جمع

فرمایا ہو، درست نہیں ہیں یعنی یہ کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے کبھی "اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَ لَکَ الْحَمْدُ" عرض کیا ہو، یہ جن روایات میں آیا ہے، وہ درست نہیں ہیں۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ سے اس مسئلے میں بہت بھول ہوئی ہے۔ یہ روایات تو صحیح اور مسلّم ہیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے "اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَ لَکَ الْحَمْدُ" پڑھا ہے۔ امام بخاری، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی رحمہم اللہ تمام محدثین نے ان روایات کی توثیق کی ہے۔ حنفیہ کا مختار مسلک بھی یہی ہے کہ قومہ میں "اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ" ہی کو پڑھنا چاہیے۔

اس لیے ان کا یہ تحریر فرمانا کہ جن روایات میں "اَللّٰھُمَّ" اور "واو" کا اضافہ ہے وہ روایات ہی درست نہیں ہیں، یہ ان کا تسامح ہے۔

نقل مذہب میں بھی ان کا تسامح دیکھیے کہ بحث یہ فرما رہے ہیں کہ نماز فجر کی دوسری رکعت کے قومے میں قنوت نازلہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ پھر فرماتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ فجر کی دوسری رکعت کے قومے میں قنوت نازلہ پڑھتے تھے۔ اور کوفہ والوں کا یہ رد ہے کہ وہ لوگ فجر میں قنوت نازلہ کا پڑھنا ـــــ خواہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں ـــــ مکروہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی احادیث کہ جن میں یہ تذکرہ آیا ہے کہ کسی بھی مصیبت یا شدید حالات میں حضرت رسالت مآب ﷺ نماز فجر میں قنوت نازلہ پڑھا کرتے تھے، ایسی احادیث منسوخ ہیں اور فجر میں قنوت نازلہ کا پڑھنا بدعت ہے۔

حضرت الامام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ سے شدید غلطی ہوئی ہے۔ اہل کوفہ سے اگر ان کی

مراد حنفی فقہاء ہیں ــــــ جیسا کہ لوگ عام طور پر ایسے ہی لکھتے اور سمجھتے ہیں ــــــ تو یہ حنفی فقہاء کرام رحمہم اللہ کا مسلک ہرگز نہیں ہے۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا یہ مذہب جانا، پھر اسے نقل کیا، یہ سب انہوں نے خطا کی۔ حنفی فقہاء قدیم زمانے میں بھی حتیٰ کہ حضرت امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ اور اب تک بھی جیسے کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ، سبھی اس بات کے قائل ہیں کہ جب بھی اُمت مسلمہ پر مصائب یا کوئی اجتماعی تکلیف آئے تو آئمہ مساجد کو چاہیے کہ نماز فجر میں قنوت نازلہ پڑھیں اور ہمارے نزدیک یہی سنت ہے۔

کسی ایک حنفی فقیہہ نے اسے بدعت نہیں کہا اور ضرورت پڑنے پر اس کے پڑھنے سے منع نہیں کیا تو یہ نقل مذہب میں خطا اور احناف کرام رحمہم اللہ سے بغیر تحقیق کے انتساب نہیں تو اور کیا ہے؟

فجر اور ظہر کی نماز میں طویل قرأت کی حکمتیں

فرمایا حضرت رسالت پناہ ﷺ فجر کی نماز میں طویل قرأت کیوں فرماتے تھے؟ اس سوال کے متعدد جوابات دیے گئے ہیں اور فجر میں طول قرأت کی حکمت بیان کی گئی ہے کہ صرف فجر ہی میں نہیں ظہر میں بھی تو آپ طویل قرأت فرماتے تھے، وہ کیوں؟ اور حکمت یہ بیان کی گئی ہے کہ عشاء سے لے کر فجر تک اور پھر فجر سے لے کر ظہر تک جو کئی گھنٹے وقت گذر جاتا ہے اور عبادت نہیں ہوتی یا ان دونوں وقفوں میں اللہ تعالیٰ نے کوئی عبادت فرض نہیں قرار دی تو اب اتنا لمبا

وقفہ بغیر کسی عبادت کے گذر گیا تو یہ ضروری ہوا کہ مراسمِ بندگی ادا کیے جائیں اور انھیں طول دیا جائے تاکہ ایک نوع کی جو غفلت یا مشاغل دنیوی میں انہماک یا قدرے طویل غیر حاضری ہوگئی اس کا تدارک ہوجائے۔

لیکن فجر کی طویل قرأت کی حکمت اس حدیث سے بھی واضح ہوتی ہے، جس میں حضرت اُم المومنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں سفر و حضر کی تمام نمازیں دو، دو رکعتیں ہوا کرتی تھیں پھر جب حضرت رسالت پناہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے اور قدرے اطمینان سے رہنا بسنا ہوا تو حضر کی رکعات مزید دو، دو بڑھا دی گئیں اور سفر کی نماز کو اسی حالت پر دو، دو رکعتیں رہنے دیا گیا (نتیجہ یہ کہ ظہر، عصر اور عشاء کے چار فرض ہوگئے) اور فجر کی نماز میں دو رکعتوں کو چار نہیں کیا گیا بلکہ قرأت طویل کردی گئی (جو کہ دو رکعتوں کا قائم مقام ہوگئی) اور مغرب کی تین رکعتیں تو دن کے اختتام کی طاق نماز (وتر) ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ فجر کی قرأت خاصی طویل ہونی چاہیے۔ اتنی کہ وہ مزید دو رکعتوں کے وقت کے برابر ہوجائے اور ایسی طویل ہو کہ یہ یاد رہے کہ اگرچہ دو رکعتوں کا اضافہ نہیں کیا گیا یعنی نماز کی رکعتوں کی تعداد کو تو حسب حال قائم رہنے دیا گیا لیکن معیار (کوالٹی) کو بڑھا دیا گیا تاکہ بندگی میں زیادہ وقت صرف ہو۔ اس لیے جو لوگ فجر کی نماز طویل نہیں پڑھتے وہ اس حکمت کو ختم کردیتے ہیں اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان حکمتوں کو سمجھتے تھے اس لیے فجر کی
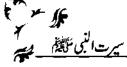
نماز میں سورۂ یوسف اور سورۃ النحل جیسی طویل سورتوں کی تلاوت فرماتے تھے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ ٹیک لگا کر کھانا کھانے کو ناپسند فرماتے تھے.

فرمایا حضرت رسالت مآب ﷺ ٹیک لگا کر کھانا کھانے کو ناپسند فرماتے تھے۔اس لیے شریعت کا حکم یہ ہے کہ انسان جب کھانا کھائے تو کسی قسم کی ٹیک نہ لے۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں سے کسی بھی ہاتھ کو زمین پر ٹکا کر دوسرے ہاتھ سے کھانا نہ کھائے۔بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ اپنا الٹا (بایاں) ہاتھ تو زمین پر ٹکا دیتے ہیں اور دائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے رہتے ہیں، یہ طرزِ عمل مکروہ ہے اس لیے ایسے بیٹھ کر کھانا، کھانا بھی درست نہیں۔بعض لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اپنے جسم کا ایک پہلو تو زمین پر ٹیک دیتے ہیں اور دوسرے پہلو کا سہارا لے کر کھانا کھاتے ہیں یہ بھی صحیح نہیں۔کھانا کھاتے ہوئے، انسان جب زمین پر بیٹھا ہو تو جسم کے دونوں اطراف کو برابر رکھنا چاہیے ایسے ہی زمین پر گدا بچھا کر خوب اطمینان سے چوکڑی مار کر بیٹھنا اور کھانا، کھانا بھی درست نہیں۔ایسے ہی دیوار یا کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کھانا، کھانا یا تکیے سے ٹیک لگا کر کھانا، کھانا بھی پسند نہیں کیا گیا کیونکہ یہ سب صورتیں سہارا لینے اور ٹیک لگانے (اتکاء) کی ہیں اور ٹیک لگا کر کھانا کھانے کی صورت میں تین خرابیاں ہیں۔ایک تو یہ ____ اور یہ حد درجہ بُری بات ہے ____ کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے خود کبھی بھی

ایسے کھانا نہیں کھایا اور کھانا تو درکنار اس ٹیک لگانے کو ہمیشہ منع فرمایا ہے۔ سو اس سے زیادہ بُری بات کیا ہوسکتی ہے کہ جس بات یا کام سے حضرت رسالت مآب ﷺ منع فرمائیں اور ان کا کوئی امتی اس کا ارتکاب کرے۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْھَا. ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ نے ایک بھنی ہوئی بکری حضرت رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں پیش کی اور آپ دوزانو بیٹھ کر اس بکری کا گوشت کھانے لگے۔ ایک دیہاتی آدمی آپ کو دیکھ رہا تھا تو اس نے دریافت کیا کہ آپ کھانا کھاتے وقت دوزانو کیوں تشریف فرما ہیں؟ تو آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک سنجیدہ اور باوقار بندہ بنایا ہے اور مجھے جبر کرنے والا یا ضدی انسان نہیں بنایا۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے عملی طور پر یہ تعلیم دی کہ انسان کو کھانا کھاتے ہوئے دوزانو ہو کر بیٹھنا چاہیے۔ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے کھانا کھانے کی نشست کا دوسرا انداز یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ کھانا کھانے والا اپنی دائیں ٹانگ کو کھڑا کرے اور بائیں ٹانگ کو موڑ کر اس پر بیٹھ جائے اور پھر دائیں ہاتھ سے کھانا کھائے اور اپنے بائیں ہاتھ کو زمین پر ٹیک کر دائیں ہاتھ سے کھانا، کھانا مکروہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے کبھی بھی ٹیک لگا کر کھانا نہیں کھایا۔ حضرت مجاہد تابعی رحمہ اللہ کی مرسل روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے ٹیک لگا کر کھانا کھالیا تو اللہ تعالیٰ سے ان الفاظ میں اس غیر اولیٰ طریقے کی معذرت کی کہ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ وَ رَسُوْلُكَ
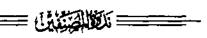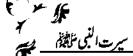
(اے اللہ میں آپ کا بندہ اور آپ کا رسول ہوں۔) یہ جو ایک مرتبہ ٹیک لگا کر کھا لینے کی روایت ہے، غالباً حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما تک پہنچی نہیں اس لیے انہوں نے فرمایا کہ آپ نے ٹیک لگا کر کبھی ایک مرتبہ بھی کھانا نہیں کھایا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی مرفوع اور حضرت عطا بن یسار رحمۃ اللہ علیہ کی مرسل روایت میں بھی یہ آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے ٹیک لگا کر کھانا کھالیا تو حضرت جبرئیل امین حاضر ہوئے اور ٹیک لگا کر کھانے سے، جب منع کر دیا تو پھر آپ نے کبھی اس طرح کھانا نہیں کھایا۔ ان تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیک لگا کر کھانا درست فعل نہیں اور اسی بنا پر فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ نے ٹیک لگا کر کھانے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ طریقہ متکبر لوگوں کا تھا اور ہے۔ وہ بجائے اس کے کہ رزق کو نعمت الٰہی سمجھ کر تواضع سے کھائیں اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں، متکبرانہ ہیئت بناتے ہیں اور عیش و تنعم کی زندگی کا اظہار کرتے ہیں۔ کبر اور اس کا اظہار بلاشبہ بدترین اخلاقی بیماریوں میں سے ایک ہے اس لیے شریعت جہاں ظاہری زندگی کے آداب سکھاتی ہے، باطنی کیفیات پر بھی نظر رکھتی ہے اور اگر باطن میں کبر اور ظاہر میں اس کا اظہار ٹیک لگا کر کھانے کی ہیئت سے ہوتا ہو تو اسلام اس پر قدغن لگاتا ہے کہ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسروں پر اپنی فوقیت جتلائے اور اپنا برتر ہونا ثابت کرے یہی وجہ ہے کہ بعض فقہاء جو ٹیک لگا کر کھانے کی رخصت دیتے ہیں تو وہ اس رخصت کو اس شرط کے ساتھ مشروط
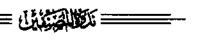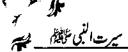
کر دیتے ہیں کہ کوئی شخص ٹیک لگا کر اس وقت کھا سکتا ہے جب اسے سو فی صد اطمینان ہو کہ وہ یہ فعل بَر بِنائے کِبر نہیں کر رہا۔

تیسری خرابی یہ ہے کہ ٹیک لگا کر کھانے سے انسان کو جو سکون اور اطمینان ملتا ہے اس کی وجہ سے انسان ضرورت سے دو چار لقمے زیادہ ہی کھا لیا کرتا ہے اور آہستہ آہستہ یہ عادت بن جاتی ہے اور انجام کار جسم میں چربی کی مقدار زیادہ ہو جاتی ہے۔ جسم موٹاپے کا شکار ہو جاتا ہے اور پیٹ باہر نکل آتا ہے۔ اس کوتاہی کا مشاہدہ کرنا ہو تو آپ کسی بھی مسلک اور فرقے کے مذہبی رہنماؤں کو دیکھیے کہ وہ کیسے لحیم شحیم ہوتے ہیں توندیں باہر کو نکلی ہوئیں اور ایسے چلتے پھرتے ہیں کہ گویا گوشت کا پہاڑ ہیں۔ آپ انھیں جب بھی کھانا کھاتے ہوئے دیکھیں گے تو انہوں نے ٹیک لگا رکھی ہوگی، کبھی تکیہ لگا کر کھائیں گے کبھی بستر پر بیٹھ کر کھانا کھائیں گے اور کبھی بائیں ہاتھ کو زمین پر ٹیک کر دائیں ہاتھ سے کھاتے ہوئے ملیں گے۔ اس پر مستزاد ان کی مرغن غذائیں اور پھر اس سے جو خمار پیدا ہوتا ہے اور گہری نیند آتی ہے یہ سب اسباب و عوامل مل کر پیٹ کی چربی اور موٹاپے میں اضافے کا باعث بنتے ہیں اور یہی وہ جسمانی ساخت ہے جو اللہ تعالیٰ، اس کے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین عظام رحمہم اللہ کو سخت ناپسند ہے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایسے عالم دین کو پسند نہیں کرتا جو بہت موٹا تازہ ہو اور حنفی فقہاء رحمہم اللہ کے امام، جلیل القدر تابعی حضرت ابرہیم نخعی رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و تابعین رحمہم اللہ ہمیشہ ٹیک لگا کر کھانے کو ناپسند کرتے
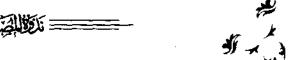
تھے اور اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں ان کی توندیں نہ نکل آئیں۔

اگر یہ لوگ کتب احادیث اور سیرت طیبہ میں ''کتاب الاطعمۃ'' کی شروح وحواشی کا مطالعہ کرتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ ان کی ظاہری ہیئت اور جسم کا بھدا پن کیسا شریعت کے مخالف ہے۔

سیرت طیبہ ہمارے باطن ہی کو نہیں ظاہر کو بھی مہذب بناتی ہے۔

احادیث مبارکہ کو سوچ سمجھ کر بیان کرنا چاہیے.

فرمایا انسان کو ہمیشہ سمجھداری سے کام لینا چاہیے۔ احادیث کو سوچ سمجھ کر بیان کرنا چاہیے۔ ہر حدیث نہ تو بیان کرنے کے قابل ہے اور نہ ہی ہر شخص اس کا اہل ہے کہ حدیث کو سمجھ سکے۔ پھر موقع بھی دیکھنا چاہیے، غلط موقع یا غلط شخص کو صحیح حدیث بتا دینا فتنے اور فساد کا موجب بھی بن سکتا ہے۔ بے وقوف آدمی تو یہ سمجھ کر خوش ہو رہا ہے کہ میں نے حدیث سنا دی اور اس کا حدیث سنانا ہی فساد کی جڑ بن گیا۔ ہمارے دور میں بچے احادیث کو پڑھ لیتے ہیں۔ ذرا بھی مذہبی شعور پیدا ہوا اور بھاگے بخاری شریف پڑھنے اور تفسیر پڑھنے حالانکہ عمر اور علم کی پختگی پر جن علوم کا مطالعہ مفید ہوتا ہے، اب کچی عمر میں پڑھ لیا اور سمجھانے والے کوئی استاد بھی نہ ہوئے تو یہی تفسیر وحدیث اُمت کو برباد کرنے کا باعث بن جائیں گی۔ سچ فرمایا بڑے لوگوں نے:

سیکھ وا کو دیجیے جا کو سیکھ سہائے
سیکھ نہ دیجیے باندرا جو گھر بئے کا جائے

پھر دوسری بات یہ بھی ہوتی ہے کہ کبھی شرعی مسئلہ یا تفسیر یا حدیث بیان کرنے والا شخص نہایت متقی اور پرہیز گار ہوتا ہے۔ اس نے گناہ کی دنیا دیکھی ہی نہیں ہوتی اس لیے وہ سمجھتا ہے کہ ہر آدمی اس کی طرح نیک اور سادہ لوح ہوتا ہے۔ ظالم لوگ اس سے پوچھتے ہیں اور وہ صحیح جواب دیتا ہے۔ یہ ظالم اس کے صحیح جواب کو غلط مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیتے ہیں۔ زمانے کے اُتار چڑھاؤ کو نہ جاننے کے سبب کبھی کوئی صحابی رضی اللہ عنہ، تابعی یا فقیہ اور مفتی صحیح روایت یا فتویٰ صادر فرمادیتے ہیں اور ظالم حکمران اسی حدیث یا فتوے کی آڑ لے کر مذہب، مسلک اور اُمت کو برباد کر دیتے ہیں۔ نام دین، اسلام اور سنت کا اور کام شیطان کا، ظلم، قتل اور حقوق العباد کا ضیاع۔

عکل اور عرینہ عربوں کے دو قبیلے تھے۔ پہلے قبیلے سے چار اور دوسرے سے تین افراد اور مزید انہی کے ساتھ ایک اور آدمی یعنی کل آٹھ افراد حضرت رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے انہیں ایک چراگاہ میں بھیج دیا تاکہ وہ اُونٹوں کی خدمت اور نگرانی کرتے رہیں۔ یہ وہاں پہنچ کر مرتد ہوگئے، پھر جو صحابی رضی اللہ عنہ پہلے سے وہاں اس کام پر مامور تھے انہیں قتل کیا اور ڈاکہ بھی ڈالا کہ اُونٹوں کو لیکر بھاگ کھڑے ہوئے۔ گویا ارتداد، قتل اور ڈاکہ تینوں جرائم کے مرتکب ہوئے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ پر اس وقت حدود کے اِجرا کی آیات نازل نہیں ہوئی تھیں اور آپ نے اپنے اجتہاد اور صواب دید پر انہیں سخت سزائیں دیں۔ آنکھوں میں نیل کی سلائی پھیر دی گئی اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انہیں مرنے کے لیے پھینک دیا گیا۔ یہ غالباً سب سے زیادہ سخت سزا تھی جو حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں جاری فرمائی تھی۔

حجاج بن یوسف ایسا ظالم تھا کہ بہت سے تابعینِ عظام رحمہم اللہ اس کے کفر کا فتویٰ دیتے تھے، اس ظالم، نصیب مارے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے گستاخ کو یہ واقعہ کسی نے بتا دیا۔ اس نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو بلا کر پوچھا کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں زیادہ سے زیادہ سزا، جو کسی کو دی تھی وہ کیا تھی؟ سیدنا حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے یہی قبیلہ عکل اور عرینہ کا قصہ بیان کر دیا۔ وہ فوراً اُٹھا منبر پر جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا،

لوگو! کچھ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تو حضرت رسالت مآب ﷺ نے ان کی آنکھوں میں نیل کی سلائی پھروادی اور ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے تو آئندہ سے اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے تو کیا ہم بھی اس کو یہی سزا نہ دیں؟

اب یہ ظالم اس صحیح حدیث سے غلط فائدہ اٹھا رہا تھا کہ جو شخص بھی بنواُمیہ کے مظالم اور غیر شرعی حرکات پر اٹھے، احتجاج کرے یا زبان کھولے تو اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا جائے۔ اپنی غیر شرعی سزاؤں کے جواز میں یہ حدیث پیش کر رہا تھا۔ حالانکہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے یہ سزائیں اس وقت دی تھیں جب حدود کی آیات نازل نہیں ہوئیں تھیں۔ اب تو آیات نازل اور حدود نافذ ہو چکی تھیں اب کوئی بھی شخص یہ سزا کیونکر دے سکتا تھا؟ اور پھر ان مجرمین نے تو اِرتداد کیا تھا، ڈاکہ ڈالا تھا اور قتل کے مرتکب ہوئے تھے۔ کہاں یہ کبیرہ گناہ، حقوق العباد کی تلفی اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی، اور کہاں اُموی خلافت کے مظالم پر احتجاج۔ یہ ظالم حجاج بن یوسف ان گناہوں کا تقابل بنواُمیہ کے خلاف احتجاج سے کر رہا تھا جبکہ یہ احتجاج کوئی ایسا حرام کام تو کیا،

یہ تو ان مظلوم اور بے بس مسلمانوں کا شرعی حق تھا اور اُن سزاؤں کا حکم دینے والے حضرت رسالت پناہ، سید المعصومین وخاتم النبیین ﷺ تھے اور یہ ظالم اپنے احکامات کو ان کے احکامات پر قیاس کرر ہا تھا۔ اس حدیث کو سن کر وہ ظلم پر مزید جری ہوگیا۔

یہ تمام قصہ سید التابعین حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچا۔ حجاج بن یوسف کا سوال اور حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا جواب، انہوں نے سنا تو بے اختیار فرمایا کاش حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ یہ حدیث حجاج بن یوسف کے سامنے بیان نہ فرماتے۔

حجاج اپنے کبائر اور مظالم پر اس حدیث کا پردہ ڈالتا رہا اور سنت کا نام لے کر لوگوں کو ایسی سخت سزائیں اور قتل کرواتا رہا۔ اس کے یہی مظالم دیکھ کر خود حضرت سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ فرمانے لگے:

''مجھے زندگی میں کسی بات پر ایسی ندامت نہیں ہوئی جتنی ندامت اس فعل پر ہوئی کہ آخر کیوں میں نے حجاج بن یوسف کو یہ حدیث سنادی۔''

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ اور ان کی اہلیہ صاحبہ رضی اللہ عنہا
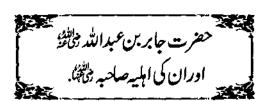
فرمایا حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کی وہ مشہور حدیث جس میں ان کی شادی اور حضرت رسالت مآب ﷺ کا ان سے استفسار کہ کسی کنواری لڑکی سے شادی کی یا بیوہ عورت سے؟ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا عرض کرنا کہ ایک بیوہ خاتون سے شادی کی ہے تو اس بیوہ خاتون کا نام سہلہ بنت مسعود بن اوس

بن مالک انصاریہ ـــــ رضی اللہ تعالیٰ عنا وعنہا ـــــ تھا۔

چھپکلی کی فطرت میں شر اور اسے مارنے کا حکم.

(فرمایا) سیرت طیبہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ چھپکلی کو مار دینے کا حکم ارشاد فرماتے تھے اور اس کی فطرت میں کیسا شر ہے، اس کی وضاحت کے لیے ارشاد فرماتے تھے کہ جب سیدنا ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آگ میں ڈالا گیا، تو اس کے قریب جتنے بھی جانور تھے ہر ایک کی کوشش تھی کی آگ بجھ جائے مگر یہ چھپکلی پھونکیں مار رہی تھی کہ آگ بھڑکے۔ پھر آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص اسے پہلے نشانے ہی پر مار دے اسے ایک سو (۱۰۰) نیکیاں ملیں گی اور جس شخص کا پہلا نشانہ چوک گیا اور پھر اس نے دوسری مرتبہ اس کا نشانہ لے کر اسے مارا اُسے ساٹھ (۶۰) نیکیاں ملیں گی۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمان مخلوق قرار دیا اور حضرت ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تو ایک نیزہ رکھا رہتا تھا، ان سے دریافت کیا گیا یہ نیزہ کس مقصد کے تحت رکھا گیا ہے؟ تو فرمانے لگیں ہم اس سے چھپکلیوں کو مارتے ہیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ تو چھپکلیوں کو فوراً مار دیتے تھے اور یہ بھی ارشاد فرماتے تھے کہ حضرت رسالت مآب رضی اللہ عنہ نے ہمیں انھیں مار دینے ہی کا حکم دیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ چھپکلی اللہ تعالیٰ کی نافرمان مخلوق ہے۔

کسی بھی مومن شخص کا جنازہ ضرور پڑھا اور پڑھایا جائے خواہ وہ کتنے ہی بڑے کبیرہ گناہ کا مرتکب کیوں نہ ہوا ہو۔
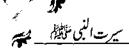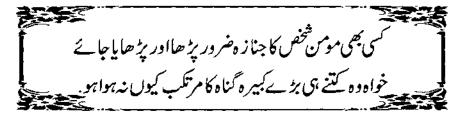
(فرمایا) حضرت رسالت مآب ﷺ کبھی کبھی اس شخص کا جنازہ نہیں پڑھاتے تھے جو کہ کسی کبیرہ گناہ میں مر گیا ہو۔ ایک صاحب نے خودکشی کر لی تھی تو حضرت رسالت مآب ﷺ نے اس کا جنازہ نہیں پڑھایا تھا۔ ایسے ہی کسی شخص نے غزوۂ خیبر میں مال غنیمت سے چوری کر لی تھی آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ کہہ کر نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا کہ تمھارے اس دوست نے مالِ غنیمت میں خیانت کی ہے اس لیے تم خود ہی اس شخص کا جنازہ پڑھ لو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب یہ سنا تو ان کے چہرے غم کے مارے اُتر گئے اور اندازہ ہو گیا کہ اسلام میں خیانت کتنا بڑا گناہ ہے۔ جن لوگوں پر بدکاری کی حد جاری ہوئی اور وہ مر گئے تو آپ نے کبھی تو کسی کا جنازہ پڑھا دیا اور کبھی انکار بھی فرمایا ہے۔

نماز جنازہ نہ پڑھانے کی حکمت کیا تھی؟ اس پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ یہ جنازے اس لیے نہ پڑھتے تھے اور نہ پڑھاتے تھے کہ لوگوں کو ان جرائم کے سنگین ہونے کا احساس ہو اور وہ اپنی اصلاح کریں۔ انھیں یہ خوف ہو کہ اگر ہم بھی کل کسی گناہ کبیرہ کے ارتکاب میں مر گئے تو حضرت رسالت پناہ ﷺ نہ تو ہمارے لیے کوئی دعائے مغفرت کریں گے اور نہ ہی وہ ہمارا جنازہ پڑھائیں گے۔ یہ سب کچھ، لوگوں کی تادیب اور اصلاح کے لیے کیا جاتا تھا اور لوگ اس سے
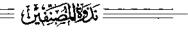
سبق سیکھتے تھے۔ یہ طرز عمل اس لیے نہیں تھا کہ کبیرہ گناہ کے مرتکب کی نماز جنازہ ہی جائز نہیں اسی لیے اُمت اس بات پر متفق ہے کہ کوئی بھی شخص جو مومن ہو اس کا جنازہ ضرور پڑھا اور پڑھایا جائے گا خواہ وہ کتنے ہی بڑے کبیرہ گناہ کا مرتکب کیوں نہ ہوا ہو۔

اب ہمارے دور کے حالات بہت بدل گئے ہیں۔ معاشرے میں شاید ہی کوئی شخص ملے جو ایک کبیرہ گناہ کیا، کئی ایک کبائر پر عمل پیرا نہ ہو پھر ایک آدھ مرتبہ کبیرہ گناہ تو کیا، مسلسل کئی کئی کبائر کا ارتکاب نہ کرتا ہو۔ صرف بدکاری اور شراب ہی تو کبیرہ گناہ نہیں حسد، جھوٹ، چغلی، حرام کا مال کھانا، تہمت، فلمیں اور کیا کیا خرافات ہیں۔ یہ تمام کبائر ہر ایک مسلمان یا منافق کر رہا ہے تو کیا ان کے جنازے نہیں پڑھنے چاہیں؟ اگر کسی جنازے کو اس لیے ترک کر دیں کہ نہیں پڑھائیں گے تو لوگوں کو عبرت حاصل ہوگی یہ بات بھی نہیں رہی۔ لوگ حیا اور شرم کو بالائے طاق رکھ چکے۔ آپ نہیں پڑھائیں گے تو کیا ہوا؟ دس اور علماء دین پڑھانے کو تیار اور نہ پڑھائیں تو کیا ہوا آسان جملہ مل گیا ہے ''اللہ بہت غفور ورحیم ہے''، ''اللہ بخش دے گا'' جس نے خود کبھی دل لگا کر عمر بھر نماز نہیں پڑھی اسے اس کی بھی کوئی پروا یا کوئی زیادہ فکر بھی نہیں ہے کہ اس کا جنازہ بھی ہوگا یا نہیں۔

اس لیے ان حالات میں بہتر یہ ہے کہ ہر ایک گنہگار کا جنازہ پڑھنا چاہیے۔ کوئی خودکشی کر کے مرتا ہے یا زیادہ شراب پینے سے موت واقع ہو جاتی ہے یا کوئی بھی کبیرہ گناہ کرتے ہوئے مر جاتا ہے تو اس کا جنازہ پڑھا دینا چاہیے اور وہ تو اس

بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کے لیے زیادہ دعائے مغفرت کی جائے کہ وہ شاید بر بنائے گناہ کبیرہ سزا کا بھی زیادہ مستحق ہوگا۔ اس لیے نہ صرف یہ کہ ان حالات میں اس کا جنازہ پڑھنا اور پڑھا دینا چاہیے بلکہ اور بھی زیادہ درد اور اخلاص سے اس کی مغفرت کی دعا مانگنا چاہیے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ عمر بھر اللہ تعالیٰ کو تنہائی میں یاد کرنے کا اہتمام فرماتے رہے.

(فرمایا) حضرت رسالت مآب ﷺ عمر بھر اللہ تعالیٰ کو تنہائی میں یاد کرنے کا اہتمام فرماتے رہے۔ خاندان میں آپ نے اپنے بچپن میں یہ دیکھا تھا کہ آپ کے دادا حضرت عبدالمطلب غار حراء میں تشریف لے جاتے تھے اور مکمل تنہائی کا کچھ وقت یا رمضان کے مہینے میں کچھ دن اور راتیں وہاں گذارتے تھے۔ طبعی رجحانات، خاندانی روایت اور وہ عظیم ذمہ داری جس کو آپ نے نبھانا تھا، قیامت تک آنے والے انسانوں کی آخرت کا فیصلہ اور "قول ثقیل" کا بوجھ برداشت کرنے کی طاقت و ہمت پیدا کرنے کے لیے یہ تنہائی کی عبادت بہت ضروری تھی۔ چنانچہ آپ بھی غار حرا میں تشریف لے جاتے تھے۔ ستو اور پانی ساتھ ہوتا تھا اور آپ تعلق مع اللہ کے جن مدارج میں تھے کسی کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ جان سکے۔ منصب نبوت اور منصبِ ختم نبوت پر فائز کیے گئے اور پھر ہجرت کے بعد آپ نے ماہ رمضان کے سب سے افضل حصے کو تنہائی اور تعلق مع اللہ کے لیے چن لیا
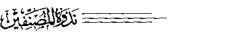
اور ہمیشہ آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے رہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کے استاد حضرت نافع رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے مسجد نبوی میں وہ جگہ دکھائی تھی جہاں حضرت رسالت مآب ﷺ اعتکاف میں بیٹھا کرتے تھے۔ اور یہ مقام مسجد نبوی میں اسطوانہ توبہ کے پیچھے تھا۔ نافع کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی جب اعتکاف کرتے تھے تو ان کا بستر اسطوانہ توبہ کے پیچھے بچھایا جاتا تھا۔ کیونکہ ان پر سنن نبویہ کا اتباع اور مقامات نبوی علیہ السلام کا تتبع نہایت غالب تھا اس لیے ان کا بستر بھی وہیں بچھایا جاتا تھا جہاں حضرت رسالت مآب ﷺ کا خیمہ برائے اعتکاف نصب کیا جاتا تھا۔

غزوۂ بدر ۱۷، رمضان المبارک میں ہوا اور فتح کے بعد آپ نے وہاں تین دن قیام فرمایا تھا۔ اس لیے جب مدینہ منورہ پہنچے تو رمضان المبارک کا آخری عشرہ شروع ہو چکا تھا اس لیے اس سال آپ نے اعتکاف نہیں فرمایا اور وفات کے سال آخری دو عشروں کا اعتکاف فرمایا تو آخری عشرے کا اعتکاف تو معمول تھا لیکن دوسرے عشرے کا اعتکاف یا تو یہ بدر کے سال سفر کی وجہ سے رہ جانے والے اعتکاف کی قضاء تھی اور یا پھر غزوۂ حنین کے سال میں بھی چونکہ آپ سفر میں تھے اور اس سفر میں بھی آپ کا اعتکاف رہ گیا تھا، تو اس سال کے سفر کی قضاء تھی اور یا پھر یہ فتح مکہ والے سال کی قضاء تھی کیونکہ فتح مکہ کے بعد جب آپ مدینہ منورہ واپس تشریف لائے ہیں تو اعتکاف کا وقت گذر چکا تھا۔ آپ کی حیات طیبہ میں تین رمضان ایسے گذرے ہیں کہ آپ سفر میں تھے اور اعتکاف کا
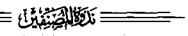
معمول نہیں نبھ سکا تھا۔ اور یا پھر ان تمام توجیہات کے علاوہ یہ کہا جائے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی حیات طیبہ کا یہ آخری سال تھا اور یہ بات آپ کو معلوم ہو چکی تھی اس لیے آپ نے بہت سے معمولات کو دو چند کر لیا تھا مثلاً آپ ہر رمضان میں ایک مرتبہ جبریل امین کو قرآن کریم سنایا کرتے تھے لیکن اس سال آپ نے دو مرتبہ قرآن کریم سنایا تھا۔ شہدائے اُحد کے مزارات پر ہمیشہ تشریف لے جاتے تھے لیکن اس مرتبہ ان کے حال پر بہت شفقتیں تھیں اور معمول سے زیادہ جانا ہوا تھا۔ ایسے ہی آپ ہر سال رمضان المبارک میں صرف آخری عشرے کا اعتکاف فرماتے تھے اور اس مرتبہ اس عبادت کو بھی دو چند کر دیا تھا۔

اعتکاف اگر کسی اُمتی سے قضاء ہو جائے تو اس کے ذمے تو کچھ نہیں لیکن حضرت رسالت مآب ﷺ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کسی عبادت کو شروع فرماتے تھے تو اس پر دوام بھی فرماتے تھے اور وہ عبادت اگرچہ نفل ہی کیوں نہ ہو، اس کی قضاء بھی ادا فرمایا کرتے تھے۔

پھر ایک مرتبہ یہ بھی ہوا کہ آپ نے لیلۃ القدر کو تلاش کرنے کی غرض سے رمضان المبارک کے پہلے عشرے کا اعتکاف فرمایا۔ پھر دوسرے عشرے کا اعتکاف بھی فرمایا اور ان دونوں عشروں میں آپ کو لیلۃ القدر نہیں ملی اور پھر آپ نے اسی غرض سے تیسرے عشرے کا اعتکاف بھی فرمایا اور حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ ارشاد فرمایا کہ لیلۃ القدر رمضان المبارک کے آخری عشرے کی طاق

راتوں میں تلاش کریں۔

ایک سال یہ ہوا کہ رمضان المبارک میں ۲۰ رمضان کی صبح آپ نے فجر کی نماز پڑھائی، اعتکاف کے لیے آپ کا خیمہ نصب کیا جا چکا تھا اور آپ نے دیکھا کہ مسجد میں آپ کی ازواج مطہرات، تین امہات المومنین حضرت عائشہ، حضرت حفصہ اور حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہن کے مزید تین خیمے نصب کر دیئے گئے ہیں تو آپ نے اسے پسند نہیں فرمایا کہ اس طرح تو مسجد نبوی نمازیوں کے لیے تنگ ہو جائے گی یا یہ کہ جب آپ کی یہ تینوں ازواج مطہرات آپ کے خیمے میں اکھٹی ہوں گی تو یہ تو گویا گھر جیسا ماحول بن جائے گا اور جس مقصد کے لیے اعتکاف ہوتا ہے اس میں خلل پڑے گا تو آپ نے اعتکاف ختم کر دیا اور پھر شوال کے پہلے عشرے میں اعتکاف فرمایا۔

حضرت رسالت مآب ﷺ جب شوال کے پہلے عشرے میں اعتکاف فرماتے تھے تو یقیناً یکم شوال کو تو روزہ نہیں رکھتے تھے کہ وہ دن عید الفطر کا ہے اور عید الفطر کے دن روزہ رکھنا درست نہیں ہے اور پھر آپ کا یہ اعتکاف نفل بھی ہوتا تھا کیونکہ آپ کی مستقل سنت اور معمول تو رمضان المبارک کے آخری عشرے کا اعتکاف تھا نہ کہ شوال کے پہلے عشرے کا، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نفلی اعتکاف کے لیے روزے کا ہونا ضروری یا شرط نہیں ہے۔ اور یہی احناف رحمہم اللہ کا مؤقف ہے کہ وہ ہر نفلی اعتکاف کے لیے روزے کو شرط قرار نہیں دیتے اور اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ کوئی شخص جب مسجد میں جائے اور داخل ہوتے وقت نفلی اعتکاف کی

نیت کر لے کہ میں جب تک مسجد میں ہوں اللہ تعالیٰ کی خوشی کے لیے اعتکاف کرتا ہوں تو اس کی یہ نیت درست اور اسے اعتکاف کا ثواب ملے گا خواہ وہ روزے سے نہ ہو کیونکہ حضرت رسالت مآب ﷺ کا یکم شوال کا نفلی اعتکاف تو یقیناً بغیر روزے کے ہوتا تھا اور بغیر شوال کے پہلے دن کے، نو (۹) دن آپ روزے رکھتے تھے یا نہیں اس سے متعلق اب تک کوئی روایت نظر سے نہیں گذری۔

مسجد نبوی میں آپ کے لیے خیمہ نصب کیا جاتا تھا اور آپ اپنے خیمے میں تنہا قیام فرماتے تھے۔ اپنے گھروں میں تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ آپ کی ازواج مطہرات آپ سے مختلف حالات عرض کرنے حاضر ہوتی تھیں اور آپ ان کی بات سن کر پھر انھیں مسجد کے دروازے تک رخصت کرنے کے لیے تشریف لاتے تھے یہ سب رات کو ہوتا تھا۔ آپ اپنی روزمرہ کی زندگی میں جب اپنی بیویوں کے پاس تشریف لے جاتے تھے تو آپ ان کا جسم اپنے جسد اطہر کے ساتھ ملا دیتے تھے، انھیں چومتے بھی تھے لیکن ہر مرتبہ یہ نہیں ہوتا تھا کہ آپ ان سے ازدواجی تعلقات بھی قائم کریں اور اعتکاف کی حالت میں آپ اتنا بھی نہیں کرتے تھے اور ازدواجی تعلقات تو کیا ان کی مبادی بھی مسجد میں نہیں ہوتی تھیں۔

اعتکاف جب شروع ہوا تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی حضرت رسالت مآب ﷺ کے ہمراہ اعتکاف کرتے تھے لیکن جب وہ مسجد سے انسانی ضروریات کے لیے باہر جاتے تھے تو رات کو اپنی بیویوں سے ازدواجی تعلقات کو قائم کر کے پاک ہو کر پھر مسجد میں اعتکاف کے لیے آ جاتے تھے۔ وہ اس جنسی ضرورت کو بھی انسانی
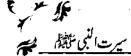
ضروریات میں سے ہی سمجھ کر ایسے کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات سے منع فرما دیا اور ارشاد ہوا کہ جب تم مسجدوں میں اعتکاف کر رہے ہو تو اس حالت میں اپنی بیویوں سے ازدواجی تعلقات مت قائم کرو۔

حضرت اُم المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اسی لیے فتویٰ دیتی تھیں کہ اعتکاف کی حالت میں کوئی شخص اپنی ضروریات کے علاوہ مسجد سے باہر نہیں جائے گا اور اگر وہ ایسے کرے گا تو اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ نہ مریض کی عیادت کے لیے جانے کی اجازت ہے اور نہ ہی نماز جنازہ میں شرکت کی۔ کوئی شخص اپنی بیوی سے تعلقات قائم کرنے کی غرض سے بھی نہیں جائے گا اور نہ ہی مسجد میں بوس وکنار ہوگا۔ استنجاء وغیرہ کے علاوہ مسجد سے نکلنے کی کسی بھی صورت میں کوئی اجازت نہیں ہے۔ یہی مؤقف فقہاء احناف رحمۃ اللہ علیہم کا ہے اور ان کے امام حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی فتویٰ تھا کہ اگر کوئی شخص اپنی حوائج ضروریہ کے علاوہ مسجد سے نکلے گا تو اس کا اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ ہمارے دور کے جاہل صوفیاء نے یہ جو اپنے پاس سے مسئلہ بنا لیا ہے کہ جب کوئی شخص بیت الخلاء میں جائے تو وہیں غسل بھی کر لے، یہ جہالت ہی کی بات ہے اس طرح سے اعتکاف باطل ہو جائے گا اور باقی اعتکاف سنت نہیں بلکہ نفل قرار پائے گا۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کے اہل خانہ جب حاضر ہوتے تھے تو آپ ان سے بہت خوشی سے مسجد ہی کے اندر باتیں بھی کرتے تھے۔ آپ کی ازواج مطہرات حاضر ہوتیں اور آپ سے مل کر بہت خوش ہوتیں۔ ایک مرتبہ آپ ان خواتین

میں تشریف فرما تھے اور جب اُم المومنین حضرت سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا واپس ہوئیں تو آپ نے فرمایا ذرا ٹھہریے کہ میں آپ کو رخصت کرنے کے لیے چلتا ہوں اور پھر جب باقی خواتین پلٹیں تو آپ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسجد کے دروازے تک انھیں رُخصت کرنے کے لیے تشریف لے گئے، ان کا مکان وہی تھا جو بعد ازاں حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کا مسکن بنا۔ کیونکہ اس وقت تک حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا کوئی مستقل گھر نہ تھا۔ حضرت رسالت مآب ﷺ کی تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے گھر مسجد نبوی ہی کے اردگرد تھے۔ یہ عشاء کے بعد کا وقت تھا اور آپ نے ان سب سے ملاقات اور گفت وشنید کے بعد رخصت کیا اور اُم المومنین اُم سلمۃ رضی اللہ عنہا کے گھر تک اُم المومنین صفیہ رضی اللہ عنہا کو رخصت کیا اور دیکھتے رہے یہاں تک کہ وہ گھر کے اندر چلی گئیں تو آپ کی نظر دو آدمیوں پر پڑی جو اس طرف سے مسجد حاضر ہو رہے تھے۔ ان دو افراد کے نام حضرت اسید بن حضیر اور حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہم بتائے جاتے ہیں لیکن یہ ثابت کرنا کہ ان دو کے یہی نام تھے، ذرا دشوار ہے۔ ان دونوں حضرات نے آپ کی خدمت میں سلام پیش کیا اور آگے چلے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے انھیں آواز دے کر بلایا اور جلدی سے ان کے پیچھے چل پڑے اور ارشاد فرمایا یہ میری اہلیہ صفیہ بنت حُیی ہیں۔ ان دونوں حضرات نے نہایت تعجب کا اظہار کیا اور عرض کیا اللہ کے رسول آپ کے متعلق تو ہمیشہ ہماری سوچ اچھی ہی رہتی ہے ہم تو آپ سے کسی ایسی ویسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا

مجھے ڈر لگا کہ کہیں شیطان تمھیں کسی غلط فہمی میں نہ ڈال دے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ نے یہ بات کمال کی ارشاد فرمائی کہ آپ جانتے تھے کہ یہ نہایت نازک مقام ہے ان لوگوں کا ایمان ہی کہیں خطرے میں نہ پڑ جائے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ سے بدگمانی سے ان کا ایمان چھن سکتا تھا۔ آپ کی شفقت تھی کہ آپ نے کسی بھی بدگمانی کی پیش بندی فرمادی۔

ان کے یہ اعتکاف، یہ تنہائیاں، ابتھال الی اللہ، آہ وزاری اور لگ لپٹ کر اپنے پروردگار سے مانگنا، یہ سب کچھ جہاں ان کی عنایت تھی، وہاں اُمت کے لیے ہی تو تھا۔ اللہ تعالیٰ انھیں تمام اُمت کی طرف سے وہ بہتر سے بہتر جزا دے جو اللہ تعالیٰ نے کسی بھی پیغمبر کو ان کی اُمت کی طرف سے اور کسی بھی رسول کو ان کی قوم کی طرف سے دی ہو۔ اللہ تعالیٰ کی دائمی رضا ان کے شامل حال ہو۔ اس کا بے پایاں وبے حدوحساب قرب حقیقی انھیں نصیب ہو۔ مقام محمود ان کا مقدر بنے اور اللہ تعالیٰ انھیں اپنے شایان شان ہر وہ مقام نصیب فرمائے جس کے متمنی وہ خود ہوں۔

ذرائع معاش کی تحقیق

فرمایا جب کوئی شخص دعوت کرتا ہے یا کوئی شخص کسی کو اپنا مال دیتا ہے کہ مشترکہ کاروبار کیا جائے یا کوئی کسی کے لیے تحفہ لاتا ہے یا کسی شخص سے قرض لینا ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ تحقیق کی جائے کہ دوسرا ان تمام معاملات میں جو پیسہ خرچ کر رہا ہے اس پیسے کی آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟

اگر کسی شخص کا پیشہ حرام ہو یا مشکوک ہو اور کوئی دوسرا شخص اس پیسے کو اس لیے قبول نہ کرے کہ یہ بات تقویٰ کے منافی ہے، تو یہ ایک الگ بات ہے لیکن فتویٰ اس بات پر نہیں دیا جا سکتا۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کو قرض مطلوب تھا اور آپ نے اپنی وفات سے پہلے اپنی ڈھال یہودیوں کے ہاں رہن رکھوا کر ان سے قرض لیا اور یہ تحقیق نہیں فرمائی کہ یہودی جو قرض مجھے دیں گے آیا ان کا یہ پیسہ حلال مال میں سے ہے یا کہاں سے ہے؟ حالانکہ یہودیوں کی رقم فاسد معاملات، شراب کے کاروبار وغیرہ ہی سے ہوتی تھی۔ یہودیوں سے ہمیشہ مسلمان، جزیہ اور مختلف ٹیکس وصول کرتے رہے ہیں لیکن کسی نے کبھی تحقیق نہیں کی کہ یہودیوں کا یہ سرمایہ کہاں سے آ رہا ہے جب کہ وہ "لحم الخنزیز" کا بیوپار بھی کرتے تھے۔

حضرت رسالت پناہ ﷺ کے خدام رضی اللہ عنہم

(فرمایا) جن خواتین و حضرات نے حضرت رسالت مآب ﷺ کی خدمت کی ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو ان کا بہت خیال رہتا تھا۔ ان کے حالات اور تعداد وغیرہ پر ایک بہترین کتاب امام سخاوی رحمۃ اللہ علیہ نے "الفخر المتوالي فیمن انتسب إلی النبي ﷺ من الخدم والموالي" کے نام سے تحریر فرمائی جو کہ اپنے ہاں کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

صحابہ کرام
رضی اللہ عنہم

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ۔

(پ:۱۰، سورۃ الانفال، آیت:۷۴)

اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے (اللہ تعالیٰ کی راہ میں اپنا) گھر بار چھوڑا (مہاجرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) اور اللہ تعالیٰ ہی کی راہ میں جدُّ وجُہد بھی کی، پھر جن لوگوں (انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے انھیں (مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو) رہنے کو جگہ دی اور ان کی (ہر طرح سے) مدد کی، بس یہ تو (تمام مہاجرین اور انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) پورے پورے ایمان والے ہیں۔ انہی کے لیے (تو) خطاؤں سے درگذر ہے اور (انہی کے لیے تو جنت میں) بہترین رزق ہے۔
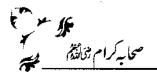
مقام ابراہیم علیہ السلام اور اس کی تنصیب

(فرمایا) مقام ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ سے جڑا ہوا تھا۔ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ۱۷ھ میں جب بیت اللہ کی توسیع کروائی ہے تو مکہ مکرمہ میں ۲۰ دن ٹھہرے تھے اور انہی ایام میں یہ حکم دیا تھا کہ مقامِ ابراہیم علیہ السلام کو کعبۃ اللہ سے کچھ فاصلے پر رکھا جائے۔ لیکن یہ کہنا کہ جہاں آج ۱۴۳۵ھ میں مقام ابراہیم ہے، یہ وہی جگہ ہے جہاں اَمیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اسے رکھوایا تھا، شاید ممکن نہیں، غالباً اس ''مقام'' کو مختلف جگہوں پر رکھا جاتا رہا ہے۔

عامُ الرَّمادہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے اقدامات.

(فرمایا) ۱۸ھ کو ''عَامُ الرَّمَادَۃ'' کہا جاتا ہے۔ ''رماد'' کے معنی ہیں ''راکھ'' اس سال بارش نہ ہونے کی وجہ سے قحط پڑ گیا تھا اور قحط اور خشک سالی اتنی شدید تھی کہ وحشی، جنگلی جانور بھی بھوک کے مارے انسانوں کے قریب آ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی مملکت میں امراء کو خط لکھا کہ اس قحط میں اہل حرمین شریفین کی مدد کی جائے، سب سے پہلے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے اناج لاد کر چار ہزار اونٹ حجاز کے لیے روانہ کیے۔ پھر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر سے خشکی اور بحری دونوں راستوں سے اشیاء خورد ونوش بھجوائیں۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نماز استسقاء پڑھائی، بارش کے لیے دعا مانگی اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے بھی دعا

مانگی ابھی اس دعا سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ بارش شروع ہوگئی اور بارش بھی ایسی کہ لوگوں کو جوتے پہننا دشوار ہوگئے۔

حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا شرف.

(فرمایا) حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں میں حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو یہ شرف حاصل ہے کہ جب ان کی تدفین ہوئی تو آپ نے بنفس اطہر ونفیس خود مٹی کے ڈھیلے اٹھا اٹھا کر قبر بند کرنے والے افراد کو دیے اور فرمایا ان سوراخوں کو بند کرو۔

نماز فجر کی جماعت کی اہمیت نگاہ فاروقی رضی اللہ عنہ میں.

(فرمایا) امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں تمام رات اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا رہوں اور نماز فجر کی جماعت میں شامل نہ ہوں تو پھر اس سے زیادہ اچھا یہ ہے کہ شب بھر سوتا رہوں اور فجر کی نماز جماعت سے پڑھوں۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، نگاہ نبوت میں.

(فرمایا) حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت زید رضی اللہ عنہ سے بہت محبت تھی اسی لیے تو ان کے لیے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا رشتہ پسند فرمایا تھا۔ پھر ان کے صاحبزادے حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ سے بھی بہت محبت تھی، آخری جھنڈا جو آپ نے باندھا ہے، وہ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ ہی کے لیے تھا۔ شب معراج میں آپ نے

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اعمال بھی ملاحظہ فرمائے تھے اور یہ بھی ملاحظہ فرمایا کہ حضرت جعفر بن ابوطالب رضی اللہ عنہ کا درجہ زید رضی اللہ عنہ سے اوپر ہے تو حضرت جبریل امین علیہ السلام سے فرمایا کہ یہ فرق کیوں ہے؟ میرا تو خیال یہ ہے کہ زید، جعفر سے کم درجے کے انسان نہیں ہیں۔ جبریل امین علیہ السلام نے عرض کیا کہ زید، جعفر سے کم درجے کے انسان تو نہیں ہیں لیکن جعفر کا ایک درجہ اس لیے بلند کیا گیا کہ جناب والا کے عزیز (چچازاد بھائی) بھی تو ہیں۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ پر عنایات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

فرمایا حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ''جند'' میں صرف حکمران اور قاضی ہی مقرر نہیں فرمایا تھا بلکہ انھیں قرآن کریم اور شریعت کی تعلیم کا استاد بھی مقرر فرمایا تھا۔ بہت سخی تھے۔ ان کے ہاں مال جمع کرنے کا دستور ہی نہیں تھا۔ اسی لیے عمر بھر جو کچھ بھی کمایا، قرض ادا کرنے میں لگ گیا۔ فتح مکہ کے بعد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن روانہ کیا ہے۔ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں شام کا گورنر مقرر فرمایا تھا، پھر ان کی وفات کے بعد انہوں نے یہ عہدہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو دے دیا تھا۔

یمن کے پانچ حصے اور ان کے گورنر

فرمایا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کو پانچ حصوں میں تقسیم فرمایا تھا۔ صنعاء
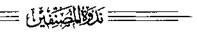
پر حضرت خالد بن سعید کو، کندہ پر حضرت مہاجر بن ابی امیہ کو، حضرموت پر حضرت زیاد بن لبید کو، جند پر حضرت معاذ بن جبل کو، زبید پر حضرت ابوموسیٰ اشعری کو اور عدن اور ساحلی علاقوں پر حضرت زمعہ رضی اللہ عنہم، کو گورنر مقرر فرمایا تھا۔ یمن والوں نے ایک استاد کا بھی مطالبہ کیا جو انھیں تعلیم دے تو آپ نے ارشاد فرمایا رات کو آنا میں ایسا اچھا آدمی دوں گا جو اس منصب کا اہل بھی ہے اور امانتدار بھی۔ رات کو جب وہ حاضر ہوئے تو آپ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑا اور ارشاد فرمایا انھیں لے جائیں میری امت میں سب سے زیادہ امانتدار فرد تو بس یہ ابوعبیدہ ہے۔ اسی لیے تو سقیفہ بنو ساعدہ میں جب خلافت کی بحث ہوئی تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگو ان دو ــــ عمر اور ابوعبیدہ رضی اللہ عنہما ــــ میں سے کسی کی بھی بیعت کرلو، میں خوش ہوں اور یہی وجہ یعنی امین ہونا ہی تو تھا کہ جب سیدنا عمر رضی اللہ عنہ شام تشریف لے گئے ہیں تو وہاں فوج کے قائد یہی تھے، انھیں دیکھا، پھر ان کے حالات ملاحظہ فرمائے تو ارشاد فرمایا ابوعبیدہ، حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دنیا کے اموال واسباب نے ہم سب کی زندگی میں ضرور کچھ نہ کچھ تبدیلی کردی مگر آپ ویسے کے ویسے ہی رہے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی عمر کم ہوئی اٹھاون برس کے تھے، جب واصل الی اللہ ہوئے۔ اردن میں ان کی قبر ہے بارہا حاضری کی توفیق ہوئی، ان کی نماز جنازہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے پڑھائی تھی اور قبر میں حضرت معاذ، عمرو بن العاص اور ضحاک بن قیس رضی اللہ عنہم اترے اور انھیں سپرد خاک کیا۔

جن حضرات کو یمن میں حکومت عطا فرمائی تھی ان میں سب سے افضل تو غالباً
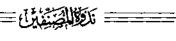
حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ تھے کہ انہوں نے دو ہجرتیں کی تھیں ایک ہجرت تو یمن سے حبشہ اور دوسری ہجرت حبشہ سے مدینہ منورہ لیکن سب سے زیادہ خوبصورت اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تھے۔ یہ سرو قامت، گورے چٹے، غلافی آنکھیں، دندان مبارک کہ درعدن، گھنے، سلجھے اور سیاہ بال لیکن عمر بہت کم ہوئی صرف اڑتیس برس، ہجرت مدینہ سے قبل جو ستر سے زائد افراد مدینہ منورہ سے بیعت عقبہ کے لیے مکہ مکرمہ حاضر ہوئے تھے، یہ ان میں سے ایک تھے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد انھیں حضرت عبداللہ بن مسعود مہاجر یا حضرت جعفر بن ابوطالب مہاجر رضی اللہ عنہم کا بھائی قرار دیا تھا۔ دونوں روایات مل جاتی ہیں مگر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی مواخات کی روایت کو ترجیح حاصل ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے تو براہ راست مدینہ طیبہ ہجرت کی ہی نہیں۔ وہ تو ہجرت مدینہ سے بھی پہلے اپنی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے ہمراہ اہل مکہ کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ ہجرت کر گئے تھے۔ پھر وہ حبشہ سے فتح خیبر کے دن مدینہ منورہ حاضر ہوئے ہیں تو اس طرح سے انہوں نے دو ہجرتیں کی ہیں۔ جبکہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو پہلے حبشہ ہجرت کر کے پہنچے تھے پھر حبشہ سے مکہ مکرمہ واپس تشریف لائے تھے پھر حبشہ تشریف لے گئے تھے اور غزوۂ بدر سے پہلے ہی حبشہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی تھی۔ بار بار ہجرت کے اسفار پیش آئے تھے تو قرین قیاس یہی ہے کہ یہ مدینہ منورہ چونکہ پہلے پہنچے ہیں اس لیے ان کی مؤاخات حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے کرائی گئی تھی اور اگر حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کو مانا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ مؤاخات کا سلسلہ کم سے کم
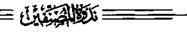
فتح خیبر تک باقی رہا جو کہ بہت مشکل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حیات طیبہ سفر اور ہجرتوں ہی میں تو گذری ہے۔ ہجرتِ مدینہ منورہ کے بعد پھر خلافتِ فاروقی تک یہیں رہے پھر حضرت امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں کوفہ بطور معلم روانہ فرما دیا تھا۔ خلافتِ عثمانی میں پھر واپس تشریف آوری مدینہ منورہ میں ہوئی اور پھر یہیں انتقال فرما کر جنت البقیع تشریف لے گئے۔ ان کا مکان وہی تھا جو بعد میں حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا گھر تھا۔

قانون اور انصاف کے فروغ کے لیے فاروقی رضی اللہ عنہ اقدامات.

فرمایا حضرت امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور میں جن شعبوں کی خاص طور پر نگرانی فرمائی ان میں سے ایک شعبہ قانون اور اس کے نفاذ کا بھی تھا۔ لوگوں کو ہمیشہ انصاف ملتا رہا اور قانون کی حکمرانی رہی۔ اسی لیے انہوں نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح اور حضرت معاذ رضی اللہ عنہما کے نام ایک گرامی نامے میں تحریر فرمایا کہ جو دیانتدار افراد قاضی بننے کے قابل ہوں، انھیں نگاہ میں رکھو اور ان کی اچھی تنخواہیں مقرر کرو۔ اور اس انصاف پسندی کی بھی اصل بِنا خوفِ خدا اور آخرت میں جواب دہی کا گہرا احساس تھا۔

حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم کا قبول اسلام.

فرمایا حضرت خالد بن ولید، عمرو بن العاص اور عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہم نے ۷ھ میں اسلام

قبول کیا تھا۔ پھر حضرت رسالت مآب ﷺ نے ان تین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو غزوۂ ذات السلاسل میں امیر مقرر فرمایا تھا اور پھر اس لشکر کی روانگی کے بعد حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ ہی کی ماتحتی میں شامل ہونے کے لیے حضرت ابوبکر، عمر اور ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہم کو بھی بھیج دیا گیا تھا۔ پھر حضرت رسالت مآب ﷺ نے انھیں ''عمان'' کا گورنر بنا دیا تھا۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں عمان سے واپس بلا کر شام کا امیر مقرر فرما دیا تھا۔ پھر سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے ان کی تبدیلی شام سے فلسطین کر دی۔ مصر کی فتح کا موقع آیا تو امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے لشکر کی قیادت انھیں دے دی اور جب مصر فتح ہو گیا تو آپ نے انھیں مصر کا گورنر مقرر کر دیا اور پھر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد تک بھی یہ اپنے عہدے پر قائم رہے ہیں۔ پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی انھیں مصر پر حاکم بنا دیا تھا یہاں تک کہ ۴۳ھ میں یہ اسی عہدے پر فائز تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

خطبہ حجۃ الوداع کن کی درخواست پر تحریر کیا گیا؟

فرمایا حضرت رسالت مآب ﷺ نے حجۃ الوداع میں جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا وہ حضرت ابوشاہ رضی اللہ عنہ کی درخواست پر تحریر کر کے ان کے حوالے کیا گیا تھا۔ حضرت ابوشاہ رضی اللہ عنہ یمن سے حاضر ہوئے تھے۔ ''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں یہ جو آیا ہے کہ قریش میں سے ایک صاحب نے، جن کو شاہ کے نام سے پکارا جاتا تھا ـــــ یہ درست نہیں ہے۔ قریش میں کسی کا نہ تو یہ نام تھا اور نہ ہی کسی کی کنیت۔ یہ حضرت ابوشاہ رضی اللہ عنہ تو یمنی تھے نہ کہ قریشی۔
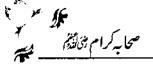
علوم وحی میں سے بعض علوم اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ !

فرمایا پہلی صدی ہجری میں ہی یہ بات پھیلنی شروع ہوگئی تھی کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم وحی میں سے بعض علوم امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائے ہیں اور ان کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری جماعت ان علوم سے محروم اور بے خبر ہے۔ اسی لیے تو حضرت قیس بن عبادہ، ابو جحیفہ اور اشتر نخعی کو یہ سوال کرنا پڑا کہ امیر المومنین کیا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو علوم وحی میں سے کچھ ایسا علم بھی مرحمت فرمایا ہے، جو آپ کے علاوہ کسی کو نہیں دیا گیا؟ یہ تمام پوچھنے والے پہلی صدی ہجری ہی کے تو ہیں اور حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کا خود اس بات کو جھوٹ اور افواہ ارشاد فرمانا، اس سے بھی تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زعم فاسد حضرت امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت جو کہ ۴۰ھ میں ہوئی ہے، سے بھی پہلے لوگوں میں پھیل چکا تھا۔

جوانی اور بڑھاپا، تکالیف اور عنایات.

فرمایا بعض لوگوں کی زندگی کا ابتدائی حصہ اور جوانی حتیٰ کہ ڈھلتی عمر تک شدید تکالیف اور مسائل میں گذرتی ہے پھر اس کے بعد بڑھاپے کی ابتداء ہی سے مشکلات میں کمی اور الطاف وعنایات الٰہیہ کا دروازہ کھل جاتا ہے تو یہ صحیح زندگی ہے۔ عقل اور نقل دونوں اس کی تائید کرتے ہیں۔ عقل تو اس لیے کہ جوانی وغیرہ کا زمانہ ہی شدید محنت ومشقت کا دور ہوتا ہے۔ آدمی سہہ بھی لیتا ہے، دشواریوں کا مردانہ وار مقابلہ بھی کر لیتا ہے اور ہمت اور

طاقت بھی ہوتی ہے اور نقلاً اس طرح سے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی ابتدائی زندگی پر غور کیا جائے تو کیا کیا مشکلات تھیں اور کیسے کٹھن حالات تھے اور جب حیات طیبہ کا آخری دور آیا تو بادشاہ اور ان کی اولادیں بھی اسلام قبول کرنے کے لیے خدمت شریفہ میں حاضر ہوئیں۔ یہ حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ شہزادے تھے ان کے والد حضر موت کے بادشاہ تھے جب یہ حضرات یمن (حضر موت) سے حاضر ہوئے ہیں ان کے وفد کا استقبال ہوا۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے ان کے لیے اپنی چادر بچھائی اور حضرت وائل رضی اللہ عنہ کو اپنے ہمراہ بٹھایا اور دعا بھی دی کہ اے اللہ وائل اور ان کی اولاد کو برکت سے نواز۔ ایسے ہی کندہ کے بادشاہ حضرت اشعث بن قیس ۱۰ھ میں، ستّر حضرات پر مشتمل اپنے وفد کے ہمراہ حاضر خدمت ہوئے ہیں۔ اشعث عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں "بکھرے بالوں والا" انھیں بھی اشعث اس لیے کہا گیا کہ ان کے بال ہمیشہ بکھرے رہتے تھے۔ حضرت اشعث رضی اللہ عنہ کا استقبال حضرت رسالت مآب ﷺ نے کیا ہے پھر یہ شام اور عراق کی فتوحات میں شریک رہے ہیں۔ کوفہ میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے رفقاء میں سے تھے۔ چنانچہ صِفّین میں بھی انہی کی رفاقت میں رہے۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ٹھیک چالیس دن بعد آپ کا بھی انتقال ہو گیا تھا اور نماز جنازہ حضرت حسین بن علی، شہید کربلا، سبط رسول ﷺ نے پڑھائی تھی۔ اس لیے عقلاً و نقلاً زندگی وہ اچھی ہے کہ ابتدائی دور میں تو محنت و مشقت اور عمر کے آخری حصے میں آسائش اور آسانی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ بقرہ میں صدقے اور سود کی آیات میں جو ایک مثال دی ہے کہ کوئی ایسا شخص جو بوڑھا ہو جائے، اس کی اولاد

ابھی چھوٹے بچے ہوں اور ایسے میں اس کے باغ کو آگ لگ جائے تو کیسی بُری حالت ہو۔ اس مثال سے بھی اس جوانی اور بڑھاپے کی بات کو سمجھا جاسکتا ہے۔

خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کے بعد اُمت کے سب سے بڑے فقیہہ

فرمایا حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی منقبت میں کوئی حدیث، کوئی واقعہ یا کوئی اثر نہ بھی ہوتا تو بھی ان کی منقبت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کے بعد اُمت میں سب سے بڑے فقیہہ وہی ہیں۔ خلفاء اربعہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ پورے مجمع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کوئی ایک شخص ایسا نہیں ہے، جو علم وفقہ میں ان کا پاسنگ ہو۔

جنگ بدر کے موقع پر کن صاحبزادی رضی اللہ عنہا صاحبہ کا انتقال ہوا؟

فرمایا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جب بدر میں تھے تو آپ کی غیر موجودگی میں آپ کی جن صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا ہے، وہ حضرت امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا تھیں۔ بعض محدثین نے اس موقع پر آپ کی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نام لیا ہے، جو کہ غلط ہے۔ ان کا انتقال تو ۹ھ میں ہوا ہے اور انھیں حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے غسل دیا ہے اور مدینہ منورہ میں عورتوں کو غسل عموماً حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا ہی دیا کرتی تھیں۔ بہت سے اکابر محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم سے یہ تسامح ہوا ہے کیونکہ ان کی نظر تاریخ پر نہ تھی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کے امتیازات.

فرمایا غزوۂ اُحد میں جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کی کم عمری کی وجہ سے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جہاد سے واپس بھیج دیا تھا ان میں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہم بھی تھے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا اصل نام سعد بن مالک تھا۔ ان کے والد مالک بن سنان رضی اللہ عنہ البتہ غزوۂ اُحد میں شامل تھے اور وہیں شہادت بھی ہوئی تھی۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُ وَعَنَّا. ان کو ''خدری'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ مدینہ منورہ میں قبیلہ خزرج کی ایک شاخ ''خدرہ'' تھی اور ان کا تعلق چونکہ اس شاخ سے تھا اس لیے یہ ''خدری'' کہلائے۔ داڑھی کو سفید نہیں رہنے دیتے تھے۔ مہندی یا خضاب وغیرہ لگا کر اسے زرد کر لیتے تھے۔ مونچھیں ایسی کاٹتے تھے کہ گویا مونڈ دیتے تھے۔ فقہاء صحابہ رضی اللہ عنہم میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ لمبی عمر پائی، ۷۴ھ میں مدینہ طیبہ میں انتقال ہوا اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔ اہل مدینہ نے یزید کے خلاف جو بغاوت کی تھی یہ بھی اس میں شریک تھے۔ حضرت حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تصریح کی ہے کہ حضرت ابوسعید خدری سعد بن مالک بن سنان رضی اللہ عنہ نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں بارہ غزوات میں شرکت کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن زید الانصاری رضی اللہ عنہ نام کے دو صحابہ اور ان میں فرق!

فرمایا: حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ نام کے دو صحابی ہیں ایک تو وہ ہیں جنہوں نے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خواب میں اذان کا طریقہ سمجھا تھا۔ ان کا پورا نسب یہ ہے۔ عبداللّٰہ بن زید بن عبد ربه بن ثعلبة الأنصاري اور اسی نام کے دوسرے صحابی حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم المازنی الانصاری رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ انصار کے قبیلے بنو مازن سے تعلق رکھتے تھے اور واقعہ حرہ میں شہید ہوئے تھے۔ یہ جو پہلے صحابی حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ ہیں انھیں محدثین کے ہاں ''صاحب النداء'' یا ''الذی اریٰ النداء'' کے عنوان سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ ان دونوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں فرق کرنا ضروری ہے۔

حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کی محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا انوکھا انداز.

فرمایا: حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت تھی۔ ان کا اپنا ایک باغ بھی تھا اور اس کی آمدنی سے گذر وبسر ہوتی تھی۔ ایک دن اپنے باغ میں کام کررہے تھے کہ بیٹے نے آکر خبر سنائی کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا۔ اس خبر وحشت اثر سے دل پر سخت چوٹ لگی اور زبان سے دعا مانگی کہ اللہ اب یہ بصارت واپس لے لے۔ میں اپنے دوست کے بعد اب کیا کسی کو دیکھوں گا۔

چنانچہ اسی مقام پر بیٹھے بیٹھے ان کی بینائی واپس چلی گئی۔ یہ باتیں بس اسی کی سمجھ میں آسکتی ہیں جس نے زندگی میں محبت کا مزا چکھا ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ "مسند عبداللّٰہ بن زید بن عبد ربه ثعلبة الأنصاري الذي ارىٰ الأذان جمعته للرد على من زعم أنه لم يرو سوى حديث الأذان" میں تحریر فرمایا ہے۔

زبان نبوت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے القابات

(فرمایا) حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو مختلف القابات سے نوازا تھا مثلاً امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو "ابوحفص" فرمایا تھا۔ امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو "ابوتراب" کا لقب دیا تھا لیکن جتنے القابات حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو عنایت فرمائے تھے غالباً کسی اور پر یہ شفقت وعنایت نہیں ہوئی۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ سے بہت محبت تھی۔ غزوۂ بدر سے پہلے غزوۂ ذوالعشیر ہ میں جو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں پہلا لقب عنایت فرمایا تھا "طلحۃ الخیر" تھا پھر غزوۂ بدر میں دوسرا لقب عنایت فرمایا "طلحۃ الفیاض" اور آخری لقب غزوۂ حنین میں عطا فرمایا "طلحۃ الجود" انہوں نے اپنے قبیلے "بنوتیم" میں کوئی ایسا گھرانہ نہیں رہنے دیا جسے خوشحال نہ کردیا ہو۔ اس قدر سخی تھے کہ قبیلے بھر کے یتیم بچے، معذور افراد، عورتیں اور بے روزگار افراد انہی کے در پر پلتے تھے۔ ان کے تجارتی قافلے عراق تک جاتے تھے اور جو نفع آتا تھا اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کردیتے تھے۔ جنگ جمل میں ۳۶ھ میں شہید ہوئے اور بصرہ ہی میں تدفین ہوئی۔ عشرۂ مبشرہ میں بھی تھے اور امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے

بعد خلافت کے لیے جن چھ افراد کو منتخب فرمایا تھا، یہ ان میں سے ایک تھے۔

امین الامۃ ——— حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ

(فرمایا) حضرت ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ جنھیں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ''امین الامۃ'' کا لقب عنایت فرمایا تھا ان کا اصل نام عامر بن عبداللہ تھا۔ امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بعد فوج کی قیادت انھیں عطا فرمائی تھی اور شام کی فتوحات انہی پر اختتام پذیر ہوئی تھیں۔ شام میں جو طاعون عمواس پھیلا تھا، اسی میں ۱۸ھ میں ان کا انتقال ہوا تھا۔

حضرت طلیحہ بن خویلد اسدی رضی اللہ عنہ کا اسلام، ارتداد اور دوبارہ قبول اسلام.
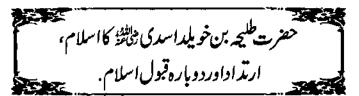
(فرمایا) بنو اسد کا ایک وفد ۹ھ میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قبول اسلام کی غرض سے حاضر ہوا۔ ان میں نڈر شیر اور اپنے قبیلے کی آنکھ کا تارا، حضرت طلیحہ بن خویلد اسدی رضی اللہ عنہ بھی تھے، جو ایک ہزار سواروں کے برابر مانے جاتے تھے۔ انہوں نے بھی اسلام قبول کیا لیکن جب اپنے قبیلے میں لوٹے تو نبوت کا دعویٰ کر دیا اور مرتد ہو گئے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ ارتداد بہت گراں گذرا اور آپ نے حضرت ضرار بن الازور کو انھیں سزا دینے کے لیے بھیجا۔ حضرت ضرار رضی اللہ عنہ نے انھیں تلوار ماری تو ان کی تلوار اچک (Slip) گئی۔ اس واقعہ کا بنو اسد قبیلے پر یہ اثر ہوا کہ انہوں نے یہ

کہنا شروع کیا اور یقین کر لیا کہ ہمارے نبی کے جسم پر اسلحہ کا اثر نہیں ہوتا۔ انہوں نے دعویٰ کیا کہ حضرت جبریل امین علیہ السلام میرے پاس آتے ہیں، وحی ہوتی ہے اور پھر اشعار سنا کر اپنی وحی بیان کی۔ نماز قائم کی لیکن یہ ترمیم کردی کہ ہماری شریعت میں جو نماز ہے وہ بغیر سجدے کے ہوگی۔ سرخ جھنڈا اپنا نشان بنایا اور بنو اسد سے متاثر ہو کر غطفان اور طئی قبیلے کے لوگ بھی مرتد ہوئے اور ان کی نبوت کے قائل ہوگئے۔ اسی اثنا میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور اس فتنے کی سرکوبی کے لیے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی ماتحتی میں ایک لشکر روانہ کیا۔ حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ کے لشکر نے شکست کھائی اور یہ شام بھاگ گئے۔ لیکن اس لشکر کشی کا فائدہ یہ ہوا کہ بنو اسد، غطفان اور طئی قبائل نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ اب حضرت طلیحہ اسدی رضی اللہ عنہ کا زور ٹوٹ گیا۔ اسی اثنا میں سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلو میں جگہ پائی اور امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا آغاز ہوا۔ حضرت طلیحہ رضی اللہ عنہ نے ایک وفد تیار کیا اور مدینہ منورہ پہنچ کر دوبارہ اسلام قبول کیا۔ حضرت امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے نہایت دانشمندی سے کام لیا، نہ صرف یہ کہ ان کا ارتداد سے رجوع اور قبول اسلام خوشی سے مانا بلکہ انھیں شرف بیعت سے بھی نوازا۔ انھیں فوج میں جانے کا حکم دیا اور ان کی بہادری کے پیش نظر انھیں عراق کی فوج میں عہدہ بھی دیا۔ ان کی وجہ سے مسلمانوں کی فتوحات میں اضافہ بھی ہوا اور ۲۱ھ میں غزوۂ نہاوند میں یہ شہید ہوئے۔

امام باقلانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مناقب الائمۃ الاربعۃ".
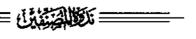
فرمایا جس شخص نے بھی مسئلہ امامت، حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت، مشاجرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ان کے فضائل، باغ فدک اور حضرات حسنین کریمین اور سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہم کے تعلقات پر اہل السنۃ کے صحیح مؤقف اور گمراہ فرقوں کے باطل مؤقف، کو پڑھنا یا سمجھنا ہو، اسے چاہیے کہ امام باقلانی رحمہ اللہ کی کتاب "مناقب الائمة الاربعة" کا ضرور مطالعہ کرے۔ یہ کتاب بظاہر اپنے نام سے تو یوں لگتی ہے جیسے حضرت امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم کے مناقب میں ہوگی لیکن درحقیقت یہ چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے مناقب میں ہے۔ اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ لوگ اس کتاب کو پڑھے بغیر ان نازک مسائل پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں اور بہت گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ نایاب ہے لیکن اپنے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا بنت سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے حالات.

فرمایا حضرت امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی محبت اور آخرت کا اتنا خوف غالب تھا کہ ایک مرتبہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا، میں نے حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے کہ روز قیامت کوئی نسب اور رشتہ داری کام نہیں آئے گی ہاں البتہ میرا نسب اور ہمارا داماد ہونا سود مند ہوگا۔ تو میری رشتے داری تو

حضرت رسالت پناہ ﷺ سے قائم ہے (ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی وجہ سے بھی اور قریشی ہونے کی وجہ سے بھی) لیکن چاہتا ہوں کہ ان کا داماد بھی بن جاؤں (تاکہ قیامت میں داماد ہونے کا نفع بھی پہنچے)۔ چنانچہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی چھوٹی صاحبزادی اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح، امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کر دیا اور اس رشتے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ، سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے داماد بن گئے۔ اور اسی حوالے سے وہ حضرت رسالت پناہ ﷺ کے بھی داماد ٹھہرے۔

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا، حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی، حضرت رسالت مآب ﷺ کی وفات سے پہلے دنیا میں آچکی تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان کی ایک بیٹی پیدا ہوئیں جن کا نام رقیہ بنت عمر رحمۃ اللہ علیہا تجویز ہوا اور ایک بیٹا پیدا ہوا، زید بن عمر رحمۃ اللہ علیہ۔ ایک مرتبہ قبیلہ بنو عدی میں باہمی خانہ جنگی ہوئی اور یہ حضرت زید بن عمر رحمۃ اللہ علیہ صلح کرانے کی غرض سے تشریف لے جا رہے تھے۔ بنو عدی کا ایک آدمی انھیں پہچان نہیں پایا اور رات کی تاریکی میں انھیں زخمی کر دیا۔ گھر اُٹھا کر لائے گئے۔ کچھ دن یہ زخم برداشت کیے اور اچانک رات کو ان کا اور ان کی والدہ حضرت ام کلثوم بنت علی رضی اللہ عنہا کا انتقال ہو گیا۔ دونوں کی وفات ایسے اکٹھے ہوئی کہ کوئی بھی یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ پہلے کس کا انتقال ہوا ہے اور کون کس کا وارث بنے گا۔ چنانچہ ان دونوں کی وراثت تقسیم نہیں کی جا سکی۔ نمازِ جنازہ میں حضرت زید اور اُم کلثوم دونوں کے دو بھائی حضرت حسن اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم موجود تھے۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے احترام میں انھیں جنازہ پڑھانے کے لیے آگے کر دیا حالانکہ وہ میت کے سوتیلے بھائی تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے پہلے

حضرت زید بن عمر کا جنازہ رکھا گیا اور ان کے بعد ان کی والدہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا اور آپ نے ان دونوں کا جنازہ اکٹھے پڑھایا۔فرضی اللہ عنہم و عنّا جمیعاً.

حضرت ابوبکر اور سیدنا عتاب بن اسید رضی اللہ عنہم کا وصال، ایک ہی دن.

فرمایا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو امیہ میں سے جن لوگوں نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول کیا تھا ان میں سے اکیس (۲۱) سالہ نوجوان حضرت عتاب بن اسید اموی رضی اللہ عنہ کو گورنر مکہ مقرر فرما دیا تھا۔ پھر وہی مکہ مکرمہ کے گورنر رہے ہیں حتیٰ کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی جس سال ۱۳ھ میں وفات ہوئی ہے یہ اس وقت بھی مکہ مکرمہ کے گورنر ہی تھے اور پھر جس دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مدینہ منورہ وفات ہوئی ہے، اسی دن مکہ مکرمہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔رضی اللہ عنّا و عنہم.

حضرت زید بن حارثہ اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہم

فرمایا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت تعلق خاطر تھا۔علم میں نہیں کہ کسی لشکر میں حضرت زید رضی اللہ عنہ بھی شامل ہوں اور آپ نے اس لشکر کی امارت کسی اور کے سپرد فرمائی ہو۔امارت ہمیشہ ان کی ہی رہی۔قدیم الاسلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک ہیں ان کی شادی حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے کی۔ان کے علاوہ ان کی شادی حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا سے ہوئی

اور انہی سے ان کے صاحبزادے سیدنا اُسامہ رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔ حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ بھی، اپنے والد کی طرح، حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منظور نظر تھے۔ مرض الوفات سے پہلے آپ نے جو لشکر شام کی طرف روانہ فرمایا تھا اس کی امارت حضرت اُسامہ رضی اللہ عنہ کو عطا فرمائی تھی۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسے مدبر اور بطل حریت ان کے زیر کمان تھے۔ دیکھیے چونکہ اُسامہ کو امیر حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کیا تھا اس لیے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور ان میں فنائیت اس قدر شدید تھی کہ امیر المومنین ہو جانے کے باوجود تاحیات اس امارت کا احترام کرتے رہے۔ اُسامہ جب بھی نظر آتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے السّلام علیکم یا امیر۔ امیر المومنین کو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قدر گہرا تعلق تھا کہ ذکر مبارک آنے پر رو دیتے تھے اور کبھی تو ایسی یاد ستاتی تھی کہ یہ غمِ فراق کئی کئی دن تک چارپائی پر ڈال دیتا تھا۔ اگر کوئی شخص اس موضوع پر کام کرے تو ایک چھوٹا سا رسالہ مرتب ہو جائے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ تو غزوۂ موتہ میں بطور امیر تھے اور ۸ ھ میں شہید ہو گئے تھے جبکہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کا انتقال مدینہ منورہ میں ۵۴ ھ میں ہوا اور جنت البقیع ہی میں پیوند خاک ہوئے۔ رضی اللہ عنّی و عنهم.

حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ کے بیٹوں میں سب سے زیادہ افضل اور سمجھدار کون؟

فرمایا حضرت امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو عمواس کا طاعون ۱۸ھ میں
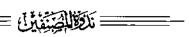
آیا تھا، اس میں بہت سے اکابر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دنیا سے تشریف لے گئے۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو شام اور اردن وغیرہ پر کمانڈر مقرر کیا گیا تھا اور جہاد پورے زور وشور سے جاری تھا کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کی جگہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا تو ان کا انتقال اسی طاعون میں ہوگیا۔ ان کی جگہ پھر حضرت یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا گیا تو غالباً ان کا انتقال بھی اسی طاعون میں ہوا تھا۔

حضرت یزید رضی اللہ عنہ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بیٹوں میں سب سے زیادہ افضل اور سمجھ دار تھے۔ لوگ انھیں "یزید الخیر" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ فتح مکہ کے موقع پر اپنے والد اور بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سمیت اسلام قبول کیا تھا۔ پھر یہ غزوۂ حنین میں بھی شریک ہوئے۔ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حنین کے مال غنیمت میں سے سو اونٹ اور چاندی کی ایک بڑی مقدار مرحمت فرمائی تھی۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا کہ بلال اتنی چاندی تول کر یزید بن ابوسفیان رضی اللہ عنہم کو دے دیں۔ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انہوں نے روایت کی ہے کہ جو شخص رکوع اور سجدے کو پورا نہیں کرتا وہ اس بھوکے کی طرح ہے جو ایک، دو کھجوریں کھاتا ہے اور یہ اس کی بھوک نہیں مٹاتیں۔ حضرت یزید رضی اللہ عنہ کی اولاد نہیں تھی اس لیے ان کا سلسلہ آگے کو نہ چلا۔

سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور والہانہ محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

فرمایا خلیفۂ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اصل نام کیا تھا،
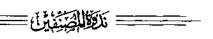
اس کے بارے میں اگرچہ علماء اسماء الرجال کا اختلاف ہے لیکن علامہ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے "عبداللہ" قرار دیا ہے اور ان کے والد حضرت ابو قحافہ رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی "عثمان" تحریر فرمایا ہے۔ اس اعتبار سے سیدنا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی "عبداللہ بن عثمان" تھا۔ واقعہ معراج کی صبح آپ نے اس واقعے کی تصدیق کی اور آپ کا لقب صدیق ہوا۔ انھیں مکمل یقین، اعتماد اور ایمان تھا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں وہ سب کچھ حق اور سچ ہے اور حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی معلوم تھا کہ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ ہر ہر معاملے میں میری تصدیق ہی کرتے ہیں اور اسی دولت یقین اور باہمی اعتماد ہی کی وجہ سے ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص بیل پر سوار ہو گیا تو بیل نے کہا میں سواری کے لیے نہیں پیدا کیا گیا، مجھے تو کھیتی باڑی کے لیے، ہل میں جوتنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ لوگوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ بیل بھی انسانوں سے باتیں کرتے ہیں تو حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس بیل کے بات کرنے پر میں گواہ ہوں اور ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے بھی پوچھ لو، وہ گواہی دیں گے۔

مقام فکر ہے کہ اس واقعے کو حضرت ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما نے نہ سنا اور نہ دیکھا لیکن حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں ہستیوں پر اتنا یقین ہے کہ وہ میری تصدیق کریں گے کہ بلا کھٹک، تعجب کا ازالہ یہ کہہ کر فرمایا کہ ان دونوں سے دریافت کر لیا جائے، وہ بھی تصدیق کر دیں گے۔

ہجرت، بدر، اُحد، خندق، بیعت رضوان، فتح مکہ، حنین، تبوک، وفات اور حتیٰ کہ تدفین تک میں ہر موقع اور مقام پر یہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہمیشہ ساتھ

ساتھ نظر آتے ہیں۔ مکہ مکرمہ میں بہت سے لوگوں کو مشرکین نے مبتلائے عذاب کر رکھا تھا کہ قبولیت اسلام ان کا ''جرم'' تھا۔ ان میں کچھ لوگ، جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ستائے گئے، (وَأُوذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ) ان پر سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اپنا مال خرچ کیا۔ انھیں غلامی سے آزادی دلائی اور پھر انھیں اپنا غلام بھی نہیں بنایا بلکہ انھیں آزاد کر دیا۔ جب بھی کوئی تحریک یا نیا نظریہ وجود پذیر ہوتا ہے، اس کی بقا اور اشاعت کے لیے مال بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اسلام کے آغاز میں مال خرچ کرنے کا یہ فریضہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی نے ادا کیا تھا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مالی قربانی کے بغیر قومیں بن جاتی ہیں انھیں اس نقطے پر غور کرنا چاہیے کہ کفر ہو یا اسلام اس کی جڑیں مظبوط کرنے کے لیے مال خرچ کیے بناں کوئی چارہ نہیں ہے۔ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے حضرت بلال، عامر بن فہیرہ، زنیرہ، نہدیہ اور ان کی صاحبزادی، قبیلہ بنومؤمل کی ایک باندی وغیرہ کو ان کے مالکان سے خرید کر اسلام کی غلامی میں داخل کر دیا۔ حضرات عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم میں حضرت عثمان، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، ابوعبیدہ بن جراح اور حضرت سعد رضی اللہ عنہم ان ہی کی محنت اور دعوت سے حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔ ان تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اسلام کے لیے ساری تگ و دو، عبادات، سجود و قیام، مختلف ممالک کی لاکھوں مربع میل کی فتح اور ہر ہر نیکی میں سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کا بھی حصہ ہے۔

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے پہلے جتنے بھی گھروں کے دروازے مسجد نبوی میں کھلتے تھے، حضرت ابو بکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دروازوں کے علاوہ، تمام کو بند کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

سیدنا ابوبکر خلیفہ رسول اللہ ﷺ تھے، اپنی وفات سے پندرہ دن پہلے ضعف اور بیماری شدید بڑھ گئے تھے، چنانچہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو بلا کر فرمایا کہ نماز پڑھانے کے لیے اب مسجد میں آنا دشوار ہے اس لیے آئندہ سے آپ لوگوں کی امامت کرائیں۔ یہ وہی ادا تھی جو حضرت رسالت پناہ ﷺ نے اپنی وفات سے پہلے اپنائی تھی۔ آج اس سنت کے اتباع کی گھڑی آ گئی اور درحقیقت ان کی وفات کا سبب بھی وہ گہرا صدمہ تھا، جو حضرت رسالت پناہ ﷺ کے انتقال سے آپ کو پہنچا تھا۔

ایک حدیث مبارکہ اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا طرزِ عمل

فرمایا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عمل کے لیے بس یہ بات کافی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے یا حضرت رسالت مآب ﷺ نے یہ فرمایا ہے۔ بس حکم صحیح ذرائع سے ان تک پہنچا ہو۔ درمیان میں کوئی غلط فہمی، نسیان یا جھوٹ یا کوئی قطعی تردید وغیرہ شامل نہ ہو گئے ہوں۔ حضرت ابومریم عمرو بن مرۃ رضی اللہ عنہ بہت قدیم الاسلام اور غزوات میں شریک رہے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں ان سے فرمایا کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ فرماتے تھے کہ جو حکمران ضرورت مندوں اور غریب لوگوں کی شکایات سننے کی بجائے، اپنے دروازے بند رکھے گا تو پھر اس حکمران کو جب خود مدد کی ضرورت ہوگی تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے دروازے اس کے لیے بند کر دے گا۔ یعنی نہ تو مشکل حالات میں اس حکمران کی دعا سنی جائے گی اور نہ اس کی مدد کے لیے رحمت کے دروازے کھلیں گے۔ حضرت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اس حدیث کو سن کر اتنے متفکر ہوئے کہ

فوراً ایک نئی وزارت قائم کر دی۔ ایک شخص کو اس عہدے پر مقرر کیا اور اس کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ جو بھی ضرورت مند یا شکایت کرنے والے یا دادرسی کے طالبین وغیرہ اس کے پاس آئیں، ان کی شکایات کے ازالے کے لیے فوراً اطلاع، حضرت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو دی جائے۔ کاش کہ اس اُمت کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ افسران تک، یہ تمام حضرات اس حدیث اور سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے طرز عمل سے کچھ سیکھتے۔

خود اپنے ہی اسلحہ سے شہید ہو جانا اور حضرت مولانا نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت.

فرمایا میدان جنگ میں بہت مرتبہ یوں بھی ہوتا ہے کہ آدمی خود اپنے اسلحے سے ہی شہید ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہینڈ گرینیڈ (Hand Grenade) اُٹھا کر دشمن کی طرف پھینکنا چاہا اور فوجی کے خود اپنے ہی ہاتھ میں پھٹ گیا اور وہ شہید ہوا اور دشمن صاف بچ گیا تو ایسی شہادت پر وہمی مزاج لوگ بہت سے اشکالات کا اظہار کرتے ہیں اور حتیٰ کہ اس شہادت کو شہادت ماننے سے ہی انکار کر دیتے ہیں لیکن یہ طرز فکر و عمل درست نہیں ہے خود حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ایک ایسا واقعہ پیش آ گیا تھا تو آپ نے ایسے مجاہد کو دوگنا ثواب ملنے کی بشارت ارشاد فرمائی تھی۔ حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت عامر بن سنان اکوع رضی اللہ عنہ تھے۔ ان کی شاعری کو دربار رسالت میں نہ صرف قبولیت حاصل تھی بلکہ کبھی فرمائش بھی ہوتی تھی کہ عامر بن سنان اپنے اشعار سے راحت پہنچائیں۔ غزوۂ خیبر میں انہوں نے اشعار پڑھے اور رحمت کی دعا بھی حاصل کی، بہت
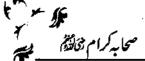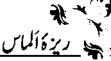
بے جگری سے لڑ رہے تھے اور ایک کافر کو جو تلوار ماری تو وہ اس کافر کے جسم سے اچک کر خود انھیں آ لگی۔ وار کچھ ایسا کاری تھا کہ یہ موقع پر، اپنے اسلحے سے، خود شہید ہو گئے۔ کچھ لوگوں کو ان کی شہادت پر اشکال تھا کہ یہ کیسی موت تھی جو اپنے ہی اسلحے سے آ گئی؟ شدہ شدہ یہ اشکال حضرت رسالت پناہ ﷺ کی سماعت مبارکہ سے گذرا تو آپ نے ان لوگوں کی تغلیط کی جو اس موت کو شہادت نہیں سمجھتے تھے اور فرمایا کہ جو لوگ اس موت کو شہادت نہیں سمجھتے، ان کی یہ سوچ درست نہیں ہے یہ شخص (عامر بن سنان رضی اللہ عنہ) تو جہاد کر بھی رہا تھا اور مجاہد بھی تھا اس لیے اللہ تعالیٰ اسے دو مرتبہ شہید کا اجر دے گا۔ پھر اپنا دست مبارک بلند کر کے دو انگلیوں سے اشارہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اسے دو مرتبہ شہید کا اجر ملے گا۔

ایسے ہی وہ لوگ جو بندوق صاف کر رہے ہوتے ہیں اور وہ بھری ہوئی ہوتی ہے اور ذرا سی بے احتیاطی سے چل جاتی ہے اور صفائی کرنے والا شہید ہو جاتا ہے، وہ بھی شہید ہی کے زمرے میں آتا ہے کیونکہ اپنے اسلحے کی حفاظت اور صفائی میں خود اپنے اسلحے ہی سے شہید ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنے اساتذہ میں حضرت مولانا نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جیسا ذکی، ذہین، نہایت متیقظ اور حاضر دماغ شخص کسی کو نہ پایا۔ اپنی مثال خود ہی تھے مسلم الثبوت، سلم، مشکوٰۃ شریف، اور صحیح بخاری اور ترمذی ان سے پڑھی۔ ہماری آنکھیں تو ان جیسا کیا کسی کو دیکھتیں خود ان کی آنکھوں نے بھی اپنے جیسا نہ دیکھا ہوگا۔ وفات سے کچھ دن پہلے اپنی ترمذی شریف مرحمت فرمائی جس کے حواشی پر بعض جگہ بہت معمولی سا، کچھ تحریر بھی فرمایا ہے۔ اپنے ہاں کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے، ان کی شہادت بھی ایسے ہی

ہوئی تھی۔ اپنے گھر (میلوڈی، اسلام آباد) میں اپنی بندوق صاف کررہے تھے اور وہ بھری ہوئی تھی، اچانک گولی چل گئی اور وہ زخمی ہو گئے اور اسی زخم سے شہادت واقع ہوئی۔ طَابَ ثَرَاہُ رضی اللہ عنّا وعنھم.

وہ واحد صحابی رضی اللہ عنہ جن کی چار پشتیں شرفِ صحابیت سے مشرف ہوئیں.

فرمایا خلیفہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ وہ واحد صحابی ہیں جن کی چار پشتوں نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور صحابیت کے شرف سے مشرف ہوئے۔ ایک تو سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ بنفس نفیس دوسرے ان کے والد حضرت ابو قحافہ قریشی تیمی رضی اللہ عنہ جو کہ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تیسرے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما یہ اتنے شجیع اور بہادر تھے کہ غزوۂ بدر میں اور پھر احد میں کفار مکہ کے ہمراہ جنگ کے لیے آئے اور چیلنج کیا کہ کوئی میرے مقابلے کا ہو تو ذرا سامنے آئے۔ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اٹھے اور قریب تھا کہ مومن والد اور کافر بیٹے کا مقابلہ ہو جاتا، حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے والد کو روک دیا اور فرمایا ابھی تو تم مجھے اپنی ذات سے نفع اٹھانے دو۔ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ حدیبیہ میں مسلمان ہوئے تھے ان کا پرانا نام عبدالکعبہ تھا اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ ہی میں ان کا نام عبدالرحمٰن تجویز فرمایا تھا۔ بہت مانے ہوئے تیرانداز تھے۔ اور پھر چوتھی پشت میں محمد بن عبدالرحمٰن تھے اور یہ بھی صحابی تھے رضی اللہ عنہ گویا کہ ان چاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شجرہ یوں بنا۔
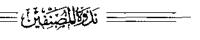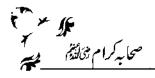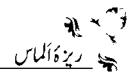
حضرت ابوقحافہ قریشی تیمی (صحابی)

↓

خلیفہ رسول اللہ حضرت سیدنا ابوبکر (صحابی)

↓

سیدنا عبدالرحمٰن (صحابی)

سیدنا محمد (صحابی)

رَضِيَ اللّٰهُ عَنَّا وَ عَنْهُمْ.

علم کی فضیلت واہمیت.
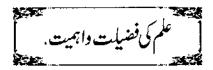
فرمایا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بھی مختلف مدارج تھے وہ تمام حضرات علم وفضل کی مختلف منازل پر فائز تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت علی، حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم تو ایسے لوگ تھے کہ ان میں سے ایک آدمی کے علم کی زکوٰۃ بھی شہروں کو کافی ہے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو ترجیح دیتے تھے جن کا تعلق علم سے تھا اسی لیے ایک مرتبہ مسجد نبوی میں مختلف حضرات کے مختلف حلقے لگے ہوئے تھے کہ آپ کی تشریف آوری ہوئی اور آپ اس حلقے میں تشریف فرما ہوئے جہاں قرآن کریم کی تعلیم ہو رہی تھی اور تین مرتبہ یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے حکم ملا ہے کہ میں اصحاب قرآن کی مجلس میں بیٹھوں۔

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے ''مولیٰ'' ہونے کی حدیث متواتر ہے.

(فرمایا) امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ''مولیٰ'' ہونے کی حدیث متواتر ہے اور وہ لوگ جو اس روایت کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، انھیں بہت محتاط رہنا چاہیے کہ متواتر احادیث کا انکار بسا اوقات موجب کفر بن جاتا ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ایک دن خود اس روایت کے متعلق حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا تھا کہ کس کس نے یہ جملے براہ راست حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنے ہیں تو سترہ (17) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور گواہی دی کہ ''یوم غدیر'' میں انھوں نے حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ میں جس کا مولیٰ (آقا) ہوں، علی اس کے مولیٰ ہیں اے اللہ جو علی کا دوست ہو اس سے محبت فرما اور جو علی کا دشمن ہو، اس سے دشمنی رکھ، اور یہ جملہ آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا۔

حضرت اُم انس رضی اللہ عنہا کی دعا اور خواہش.

(فرمایا) حسنِ عقل بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، جسے چاہے سرفراز فرمائے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسی خوبصورت دعائیں اور اتنی عقل اور ایسے سلیقے سے مانگتے تھے کہ لاجواب تھے۔ حضرت ام انس رضی اللہ عنہا حاضر ہوئیں اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو دعا دی کہ اللہ کے رسول، اللہ تعالیٰ آپ کو آخرت میں ''رفیق اعلیٰ'' کا مقام عطا فرمائے۔ پھر دوسری دعا یا خواہش کا اظہار فرمایا کہ اے اللہ کے رسول اس مقام پر میں بھی آپ کی خدمت میں
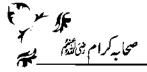
رہوں۔ حضرت رسالت پناہ ﷺ خوش ہوئے اور فرمایا امین۔ پھر اس اعلیٰ مقام کی تمنا اور دعا کی قبولیت پر نظر کر کے فرمایا، ام انس نماز پابندی سے پڑھا کیجیے اور گناہوں سے ہمیشہ دور رہنا ہے، دیکھیے گناہ کو چھوڑ دینا، جہاد سے بھی افضل عمل ہے۔

اب امت مسلمہ کے افراد، مرد و عورت کا یہ حال ہے کہ معمولی گناہ تک نہیں چھوڑ سکتے۔ اپنی روزمرہ کی باتوں میں جھوٹ تک سے پرہیز نہیں کرتے حتیٰ کہ بغیر کسی سبب اور مزے کے بھی، معاصی میں مبتلا ہوتے رہتے ہیں اور جان دینے کی بات کیجیے، لڑنے، مرنے اور مارنے کی بات کیجیے، تو ہزاروں تیار ہوں گے۔

حضرت اُم ایمن رضی اللہ عنہا کی خوش نصیبی.

فرمایا حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا بڑی شان کی خاتون تھیں۔ حضرت رسالت مآب ﷺ ان سے ملاقات کے لیے ان کے گھر خود چل کر جاتے تھے اور جب دنیا سے رخصت ہو گئے تو سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہما بھی ان کی زیارت کے لیے خود ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما انہی کے صاحبزادے تھے۔

حضرت خلیدہ رضی اللہ عنہا کا خوبصورت استدلال.

فرمایا جب کسی مرد و عورت کا انتقال ہوتا ہے اور اس کی روح عالم برزخ میں پہنچتی ہے تو اپنے سے پہلے پہنچے ہوئے مرد و زن سے اپنے اعزا و اقارب کے احوال بیان کرتی ہے۔ اگر مبتلائے عذاب نہ ہو تو پھر یہاں کی خبریں وہاں جا کر سناتی ہے۔ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ
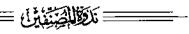
کا انتقال ہو رہا تھا کہ حضرت خلیدہ رضی اللہ عنہا تشریف لائیں اور یہ برأ بن معرور رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔ فرمانے لگیں کہ اے کعب ابھی انتقال کے بعد میرے والد سے ملاقات ہو تو میرا اسلام پیش کیجئے گا۔ حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا بیٹی اللہ تعالیٰ تمھاری عمر دراز کرے وہاں تو حساب و کتاب کی مشغولیت بہت ہوگی۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ کیا بات ارشاد فرماتے ہیں آپ نے یہ نہیں سنا تھا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ ایمان والوں کی روحیں تو جنت کے باغات میں پھل کھایا کریں گی اور فاجر کی روح کو جیل خانے میں بند کر دیا جائے گا۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی روضۂ مبارک پر حاضری.

فرمایا حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو حضرت صاحب الرسالۃ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت تھی۔ جب حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو یہ یمن میں گورنر تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں لوٹے اور مدینہ منورہ میں داخل ہوئے تو رات ہو چکی تھی۔ سیدھے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر حاضر ہوئے کہ قبر مبارک وہیں تھی۔ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے دروازہ بند کر دیا تھا کہ رات ہو چکی تھی انہوں نے دستک دی تو فرمانے لگیں اب اتنی رات گئے کون ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ معاذ۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے اپنی خادمہ عنقودہ سے فرمایا کہ دروازہ کھول دیں۔ معاذ رضی اللہ عنہ قبر مبارک پر حاضر ہوئے اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم
من و تو کشتہ شان جمالیم
دو حرفے بر مراد دل بگوئیم
بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

حضرت رسالت مآب ﷺ کا حضرت رملہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا سے نکاح اور اس کی تفصیلات۔

فرمایا حضرت رسالت مآب ﷺ کو حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ سے جو تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ۵ ھ میں غزوۂ خندق برپا کیا۔ مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہوئے اور ناکام لوٹے اور ابھی ایک برس کی مدت بھی نہیں گذری تھی کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت رملہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا سے نکاح کرلیا۔ حضرت رملہ بنت ابوسفیان رضی اللہ عنہا اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے شوہر عبداللہ بن جحش کے ہمراہ حبشہ ہجرت کر گئی تھیں۔ وہاں عبداللہ بن جحش نے عیسائیت قبول کرلی اور پھر اسی حالت میں انتقال ہوگیا۔ اب حضرت رملہ رضی اللہ عنہا بیوہ ہوگئی۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے غالباً عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کو خط دے کر حبشہ روانہ کیا اور نجاشی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ حضرت رملہ کے ساتھ میرا نکاح کر دیں۔ نجاشی نے بہت اہتمام کیا حضرت خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ، ام المومنین رضی اللہ عنہا کے وکیل ٹھہرے۔ نجاشی نے 400 دینار حق مہر اپنے پاس سے پیش کیا۔ تقریب نکاح

کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے گوشت پکوایا سب کی دعوت ہوئی اور گویا کہ یہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ولیمہ تھا۔ اور آپ مدینہ منورہ میں تشریف فرما تھے۔ حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے بندوبست کیا کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کو مدینہ منورہ لے جائیں اور پھر خود انھیں لے کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے۔ ادھر حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو اس تمام واقعے کی خبر ہوئی تو اپنی بیٹی کے اس رشتے پر صرف یہ فرمایا کہ میرے داماد محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رشتے کو انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اپنی ہمشیرہ سے مسائل بھی پوچھا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک مسئلہ یہ پیش آیا کہ کوئی آدمی جن کپڑوں میں اپنی بیوی سے مقاربت کرتا ہے ان میں نماز بھی پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انھیں خط لکھا کہ اس معاملے میں حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل کیا تھا؟ تو ام المومنین حضرت رملہ رضی اللہ عنہا نے جواب تحریر فرمایا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم جن کپڑوں میں اپنی کسی بھی اہلیہ سے مقاربت فرماتے تھے تو غسل کے بعد ان کپڑوں کو دیکھ لیتے تھے کہ ان میں کوئی ناپاکی تو نہیں لگ گئی اور جب ان کپڑوں کے پاک ہونے کا یقین ہوتا تھا تو انھیں ہی پہن کر نماز ادا فرماتے تھے۔

برکتیں تو بیٹیوں کے ساتھ ہی ہوتی ہیں.

فرمایا عورتوں کے مسائل بہت ہوتے ہیں اور پھر وہ معاشرتی زندگی میں گھمبیر بھی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ عرب اسی وجہ سے بیٹیوں کی ولادت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ

اسلام ہی تھا جس نے انھیں عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلائی اور ان سے نباہ سکھایا۔
حضرت اوس بن ساعدہ رضی اللہ عنہ اگر چہ مسلمان ہو چکے تھے لیکن بیٹیوں کے بارے میں بہت پریشان رہتے تھے۔ انھیں جب ان کے مسائل کا کوئی حل نظر نہیں آیا تو وہ ان کی موت کی دعا مانگنے لگے۔ ایک مرتبہ غالباً کوئی دقت زیادہ پیش آئی ہوگی، حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو چہرے پر خوشی نہیں تھی آپ نے اس کی وجہ دریافت فرمائی تو عرض کیا کہ اللہ کے رسول کچھ بیٹیاں ہیں اور ان کی موت کی دعا مانگتا ہوں۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا کہ اوس ایسی بد دعائیں نہ مانگیں اور بیٹیوں کی تعریف میں فرمایا دیکھو اوس برکتیں تو بیٹیوں ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے انعامات پر یہی تو ہیں جو اس کا شکرادا کرتی ہیں اور اگر کوئی مصیبت پڑ جائے تو یہی تو ہیں جو رو دیتی ہیں (یعنی ان کے رونے پر اللہ تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہو جاتی ہے) پھر یہی تو ہیں جو تمھیں بیماری میں خدمت کر کے، سنبھال لیتی ہیں۔ ان کا کیا بوجھ ہے وہ تو زمین نے اٹھایا ہوا ہے اور (ان کے رزق کا مسئلہ تو) ان کا رزق تو اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔

اس حدیث پر غور کرنا چاہیے اور اپنے گرد و پیش کو دیکھنا چاہیے کہ عورتیں اللہ تعالیٰ کا زیادہ شکرادا کرتی ہیں یا مرد؟ مصیبت کے وقت مرد اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ رجوع اور دعا مانگتے ہیں یا یہی مائیں، بہنیں اور بیٹیاں؟ بیماری میں خدمت بیوی، بہن، بیٹی یا ماں کرتی ہے کیا شوہر، بھائی، بیٹا اور باپ بھی کبھی ایسی خدمت کر پاتے ہیں؟ اس لیے جو شخص ان کی تلخیوں اور مصائب پر صبر کرتا ہے، اس کا بھی اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا مرتبہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی بصیرت.

فرمایا حضرت امیر المومنین سیدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد جن لوگوں سے اصرار کیا گیا کہ وہ خلافت سنبھال لیں ان میں ایک حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ مروان نے انھیں یہ پیش کش کی تھی کہ اہل شام کی نگاہ، خلافت کے لیے آپ پر ہے۔ آپ آگے بڑھیں۔ انہوں نے فرمایا عراق والوں کا کیا بنے گا؟ اس نے کہا عراقیوں کو تلوار کے زور پر منوائیں گے تو عبداللہ فرمانے لگے اللہ کی قسم اگر خلافت کے مفتوحہ تمام علاقے میری خلافت پر راضی ہوں اور صرف ایک چھوٹے سے گاؤں (فدک) کے لوگ نہ مانیں تو بھی میں خلافت نہ لوں اور اگر بالفرض اس گاؤں والے بھی مان جائیں اوران میں سے صرف ایک آدمی کو باغی قرار دے کر قتل کرنا پڑ جائے تو میں اس خون کے عوض بھی خلافت لینے کو تیار نہیں ہوں۔ مسلمانوں کے خون بہانے سے وہ حد درجہ مجتنب تھے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی حمایت میں لڑنے پر اگر چہ انھیں پہلے اشکال تھا لیکن بعد میں وہ ان کے اجتہاد کے صحیح ہونے کے اتنے قائل ہوئے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ نہ دینے پر ہمیشہ اظہار ندامت فرماتے رہے۔ وفات سے پہلے بھی فرمایا کہ دنیا میں کوئی عمل ایسا نہیں جس پر افسوس ہو سوائے اس کے کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کرنے والوں کے خلاف جہاد کیوں نہ کیا؟

حجاج بن یوسف کے گناہوں میں ایک گناہ، انھیں شہید کر دینا بھی تھا۔

حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی جنگ صفین میں شہادت.

فرمایا حضرت امیرالمومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دوسرے صاحبزادے حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہمراہ رہے اور حتیٰ کہ جنگ صفین میں انہی کے پرچم تلے لڑے اور شہید ہوئے اس میں بہت اختلاف ہے کہ انھیں کس نے شہید کیا۔ بہت سے نام لیے جاتے ہیں لیکن تحقیق نہیں ہوسکی سخت دشواری ہے۔ حضرت عبیداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بہت طویل القامت تھے۔شہادت پر ان کی اہلیہ ان کی میت لینے کے لیے آئیں اور پھر ان کی تدفین کی گئی۔ان کی تلوار جو درحقیقت انھیں وراثت میں ملی تھی اور سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی تھی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خرید لی اور پھر یہی تلوار انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو تحفہ میں مدینہ منورہ بھجوادی تھی۔

علم کے مختلف شعبے.....!

فرمایا علم کے بعض شعبے ایسے ہیں جن سے ہمیں اپنی معاشرتی زندگی میں واسطہ پڑتا ہے۔ مثلاً طب ہے کہ ہر شخص بیماری میں طبیب کی طرف رجوع کرتا ہے۔ مکانات کے نقشے اور تعمیرات کا، پورا ایک علم وفن ہے اب ہر آدمی کو اس کی ضرورت ہے تو ایسے علوم میں کفار سے استفادے کی اجازت نہ صرف شریعت نے دی ہے بلکہ یہ ثابت ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حارث بن کلدہ سے مشورہ کرنے اور دوا لینے کا حکم فرمایا جبکہ حارث بن کلدہ
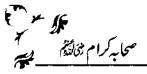
کافر تھے۔ ان کا انتقال بھی کفر پر ہی ہوا تھا۔ اور ان کے بیٹے حضرت حارث بن حارث رضی اللہ عنہ مسلمان ہو گئے تھے اور وہ مؤلفۃ القلوب میں سے تھے۔

صاحبِ نورالانوار پر تنقید ـــــــ دوہرا معیار کیوں؟

فرمایا آئمہ حنفیہ رحمۃ اللہ علیہم پر توہین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا الزام دھرتے ہیں کہ وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو فقیہہ نہیں مانتے۔ صاحبِ نورالانوار پر تنقید ہے کہ وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو فقیہہ نہیں مانتے اور ٹھیک یہی باتیں علماء تاریخ و اسماء الرجال کہیں تو پھر کوئی بات نہیں۔ مخالفین احناف نے یہ دُھرا معیار کیوں بنا رکھا ہے؟ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ آگ پر پکی ہوئی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جانے کا فتویٰ دیں اور اس فتوے پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تنقید فرمائیں تو وہ درست اور احناف یہ بات اور اس کا نتیجہ بیان کریں تو نادرست۔ علماء اسماء الرجال اور حافظ ابن الاثیر رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرمائیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما علم حدیث میں تو جیّد تھے لیکن علم فقہ میں جیّد نہ تھے تو صحیح اور صائب اور یہی جملہ اور اس کے مضمرات ہم بیان کریں تو توہین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مرتکب ٹھہریں یہ کہاں کا انصاف ہے؟ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم کو دلائل کی بنا پر کوئی حنفی فقیہہ غیر مجتہد تحریر کرے تو گنہگار ٹھہرے اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو معاذ اللہ غافل قرار دیں تو قابل ستائش اور محقق ٹھہریں۔ کیا اسی کا نام عدل ہے؟ حالانکہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم کے غیر مجتہد ہونے پر خود احناف کا اختلاف ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں ان دونوں جلیل القدر صحابہ کرام رضی اللہ عنہما

کو مجتہد قرار دیا ہے۔

عبادلہ اربعہ سے مراد کون ہیں؟

(فرمایا) کتب احادیث میں جب یہ جملہ آتا ہے کہ عبادلہ اربعہ اس بات پر متفق ہیں یا عبادلہ اربعہ کی یہ روایت ہے تو عبادلہ اربعہ سے مراد چار عبداللہ ہوتے ہیں۔ عبادلہ درحقیقت عبداللہ کی جمع ہے اور اربعہ کا مطلب ہے چار، تو اس اصطلاح کا مطلب یہ ہوا کہ چار عدد عبداللہ اس قول یا فعل پر متفق ہیں یعنی چاروں کا عمل یا فتویٰ یہی ہے۔

چار، عبداللہ سے محدثین کی مراد:

① عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ

② عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ

③ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ

④ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، ہیں۔

یہ چاروں عبداللہ رضی اللہ عنہم حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے موقع پر نوجوان اور کم عمر تھے اس لیے طبعی طور پر بہت مدت تک حیات رہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ان میں شامل نہیں ہیں کیونکہ وہ ان چاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عمر میں بڑے تھے اور پھر ان کی وفات بھی خلافت عثمانی میں ہوگئی تھی پھر یہ بھی ہے کہ ان عبادلہ اربعہ سے مراد اگر کوئی اور عبداللہ بھی لیا جائے تو پھر تو عبداللہ نام کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد دو سو سے بھی زائد ہے، جنہوں نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے

اپنی آنکھیں روشن کی ہیں۔ ایسے ہی جن حضرات نے ان عبادلہ اربعہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو شامل کر کے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے نام کو حذف کیا، ان کے اس ترمیم واضافے کو محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے قبول نہیں کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے مفتیان کرام.

فرمایا امام ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "أصحاب الفتيا من الصحابة والتابعين و من بعدهم على مراتبهم في كثرة الفتيا" میں مفتی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد ۱۴۶ تحریر فرمائی ہے اور اس کتاب کے محقق سید کردی نے حواشی میں یہ تعداد ۱۴۲ مردوں اور ۲۰ عورتوں کی تحریر کی ہے اور اس طرح سے یہ کل تعداد ۱۶۲ بن جاتی ہے۔ اپنے ذخیرۂ کتب میں موجود، کتاب کو دیکھ لیا جائے۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُم وَ عَنَّا.

وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کی روایات کی تعداد ہزاروں میں ہے.

فرمایا حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں کس صحابی سے کتنی احادیث کی روایات ملتی ہیں؟ اس سوال کے جواب کے لیے امام ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "أسماء الصحابة الرو اة و ما لكل واحد من العدد" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کی روایات کی تعداد ہزاروں میں ہے، کتنے ہیں؟ ابن حزم ظاہری رحمۃ اللہ علیہ نے صرف چار صحابہ کرام ① حضرت ابوہریرہ ② حضرت عبداللہ بن عمر ③ حضرت انس بن مالک ④ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم کا تذکرہ فرمایا ہے۔

فقه

اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَفْقَهُوْنَ۔

(پ:۷،سورۃ الانعام،آیت:۶۵)
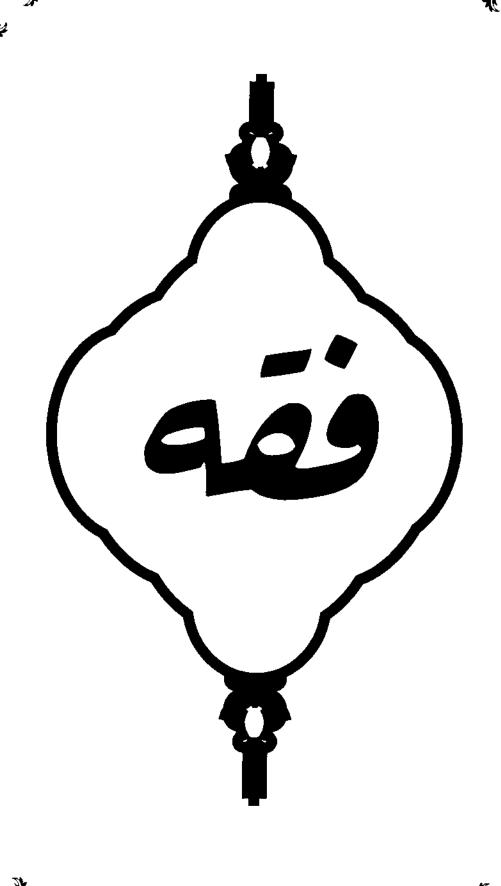
دیکھ! ہم دلائل کو کیسے بار بار بیان کرتے ہیں تاکہ وہ لوگ گہری سمجھ سے کام لیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور فقیہہ کے تین اوصاف.

فرمایا کسی شخص نے حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مسئلہ پوچھا اور اپنے سوال کے ساتھ ساتھ مختلف فقہاء کے مسالک کا تذکرہ بھی کیا کہ ان کے فتاویٰ تو یہ ہیں، اب آپ کیا فرماتے ہیں؟ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تم نے کبھی فقیہہ دیکھا ہے کہ کون ہوتا ہے؟ پھر فرمایا فقیہہ وہ ہے جس میں تین باتیں ہوں:

① دنیا کی محبت سے پاک ہو۔

② اپنے دین اور مسلک سے صحیح معنی میں باخبر ہو۔

③ ہمیشہ اپنے پروردگار کی عبادت میں لگا رہے۔

''مسلم الثبوت'' اور اس کی پہلی شرح.

فرمایا اصولِ فقہ کی کتاب ''مسلّم الثبوت'' کی اصل دیکھنی ہو تو علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کی ''التحریر'' ابن حاجب رحمۃ اللہ علیہ کی ''مختصر'' اور قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ''منہاج'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ حضرت محبّ اللہ بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی اپنی معروضات اس کے علاوہ ہیں۔ حنفی اور شافعی اصولِ فقہ خوب سمجھ میں آتے ہیں بشرطیکہ پڑھانے والا ان مباحث کو سمجھتا ہو۔ ملا حبیب اللہ قندھاری نے اپنی کتاب ''مغتنم الحصول فی علم الاصول'' میں ان مباحث کو لیا ہے، وہ بھی زیر مطالعہ رہنی چاہیے۔ لطف کی بات یہ بھی ہے کہ اس کتاب ''مسلّم الثبوت'' کی سب سے پہلی شرح ''الفوائد العظمیٰ'' بانی درسِ نظامی

ملا نظام الدین فرنگی محلی (المتوفی ۱۱۶۱ھ بمطابق ۱۷۴۸ء) رحمۃ اللہ علیہ نے، مصنف قاضی محب اللہ بہاری (المتوفی ۱۱۱۹ھ) رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں ہی لکھ ڈالی تھی۔

پٹے (Lease) پر دی جانے والی زمین کے احکامات.

فرمایا: جو زمین پٹے (Leas) پر دی جاتی ہے اور دوامی پٹہ طے کر لیا جاتا ہے ان زمینوں میں قبرستان اور مساجد بنانا جائز ہیں کیونکہ یہ پٹہ ہمیشہ کے لیے ہوتا ہے۔ لوگ ان پر مکانات بنالیتے ہیں پھر توڑتے ہیں پھر نئے مکانات بنتے ہیں۔ یہ زمین اور مکانات وراثت میں تقسیم ہوتے ہیں۔ وصایا نافذ کی جاتی ہیں۔ نہ آج تک حکومت نے لوگوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کیا ہے اور نہ ہی ان زمینوں میں دفن مردوں کو اکھاڑا ہے۔ نہ قبریں مسمار کی گئی ہیں اور نہ ہی مساجد کو شہید کیا گیا ہے تو پھر یہ وقف یا پٹہ ہمیشہ کے لیے نہیں تو اور کیا ہے؟

اس لیے یہ وقف تابید ہے۔ شبہ نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں راولپنڈی کینٹ تقریباً سارے کا سارا اسی طرح دوامی پٹے پر ہے۔ حکومت نے آج تک رعایا، مساجد اور قبرستان کا ازالہ نہیں کیا بلکہ لوگوں کی ملکیت کا اثبات اور جب مدت وقف پوری ہو جائے تو اپنا حصہ وصول کر کے دوبارہ دائمی پٹے پر دے دیتی ہے تو یہ تمام مساجد، قبرستان، وصایا کا نفاذ اور خرید و فروخت درست ہے۔ علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ نے فتح القدیر میں اس مسئلے پر عمدہ بحث کی ہے۔
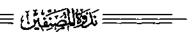
خواتین کا قبرستان جانا.

(فرمایا) خواتین اگر قبرستان جائیں اور غیر شرعی اعمال مثلاً بدعات اور بین وغیرہ کرنے کی مرتکب نہ ہوں تو ان کے لیے یہ زیارتِ قبور ممنوع نہیں۔ انھیں بھی مردوں ہی کی طرح اجازت ہے، منع نہیں کرنا چاہیے۔ اصل کام سے نہیں روکنا بلکہ اس مستحب کام کے ساتھ جو ناجائز امور بڑھا دیئے جاتے ہیں انھیں منع کرنا چاہیے۔ ہاں لوگ اگر باز ہی نہ آئیں تو پھر اجازت ہے کہ اس مستحب کام کی اجازت نہ دی جائے کیونکہ اس صورت میں مستحب کام (زیارت قبور) حرام کام (بدعات) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔
اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب حج کے لیے مکہ مکرمہ جاتی تھیں تو راستے میں ان کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکر رضی اللہ عنہما کی قبر بھی پڑتی تھی، وہ اس قبر کی زیارت بھی کرتی تھیں۔ حنفی فقہاء کرام رحمہم اللہ میں سے امام علاؤ الدین عبدالعزیز بن احمد البخاری (المتوفی ۷۳۰ھ رحمۃ اللہ علیہ) نے جو "کشف الاسرار عن اصول البزدوی" میں عورتوں کے قبرستان جانے کا جواز لکھا ہے وہاں اسی روایت سے استدلال کیا ہے۔ حضرت ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے "البحر الرائق" میں بھی جواز ہی کا فتویٰ دیا ہے۔

وقف کی ہیئت کی تبدیلی.

(فرمایا) وقف کی ہیئت صرف اسی صورت میں تبدیل کی جاسکتی ہے جب واقف نے نگرانِ وقف کو یہ اختیار دیا ہو کہ وہ وقف کی مصلحت ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے، ہیئت تبدیل
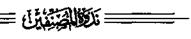
کرسکتا ہے وگرنہ تو وقف کو اپنی اصل حالت میں باقی رکھنا واجب ہے۔

نماز جنازہ اور نماز عید کے قضاء ہونے کا خطرہ اور تیمّم.

فرمایا نماز جنازہ اور نماز عید دونوں ایسی نمازیں ہیں جن کی قضا نہیں ہے۔اس لیے شریعت نے یہ اجازت دی ہے کہ اگر ان دو فرض نمازوں کے قضاء ہونے کا خطرہ ہو تو خواہ پانی سامنے نظر آ رہا ہو، وضو نہ کرو، تیمّم کرلو اور ان دونوں نمازوں کو پڑھو۔

جانوروں میں خنثیٰ اور ان کا حکم.

فرمایا انسانوں کی طرح جانوروں میں بھی خنثیٰ ہوا کرتے ہیں۔نر و مادہ دونوں کی علامتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کوئی وجہ ترجیح نہیں ہوتی۔نر یا مادہ ہونے کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تو ایسے جانور کی قربانی درست نہیں ہوتی البتہ اس کو اگر ذبح کریں تو گوشت حلال ہوگا۔ایسے کا گوشت گلتا بھی نہیں لیکن یہ گوشت کھانا جائز ہے۔

قربانی کے متعین جانور.
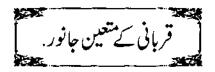
فرمایا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ قربانی کرو اور جانوروں کا خون بہانے پر تمہیں ثواب دوں گا۔بس یہ بات ہے وگرنہ جانور کے خون بہانے پر ثواب ملنا ایسی بات ہی نہیں جسے عقلِ سلیم قبول کرے۔اس لیے قربانی بھی فقط انہی جانوروں کی ہوگی جنہیں شرع نے متعین کیا ہے۔ان کے علاوہ دیگر حلال جانوروں کی قربانی بھی درست نہیں۔مثلاً

کوئی نیل گائے کی قربانی کرنا چاہیے، تو درست نہ ہوگی۔

اُلو سے متعلق اہم معلومات.

فرمایا اُلو حرام ہے اور اس کا کھانا جائز نہیں حضرت رسالت پناہ ﷺ نے ہر اس پرندے کو حرام قرار دیا ہے جو اپنے پنجوں سے شکار کرتا ہے اور حکمت اس کی یہ ہے کہ آدمی جو گوشت کھاتا ہے اس جانور کی بدخصلت اس میں آسکتی ہے۔ جو پنجے والا پرندہ پنجے سے بے رحمی اور سنگ دلی سے شکار کرتا ہے ڈر ہے کہ اس کی یہ سنگدلی انسان کی خصلت نہ بن جائے اور انسان اگر سنگدل ہو جائے گا تو نصیحت قبول نہیں کرے گا۔ اُلو نہ صرف یہ کہ اپنے پنجے سے، اپنے سے کمزور پرندوں کا شکار کرتا ہے بلکہ کبھی تو رات کے وقت کمزور بلیوں اور اس سے ملتے جلتے جانوروں کو بھی نہیں چھوڑتا۔ تو اس لیے اس کی حرمت میں شبہ نہیں ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں جو اُلو کو حلال لکھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پر اصل عربی عبارت میں لفظ ''بوم'' آیا ہے۔ اب اس لفظ ''بوم'' کا ترجمہ کرنے والا کوئی مفتی اور فقیہہ تو تھا نہیں، اس نے ترجمہ ''اُلو'' کر دیا حالانکہ عربی میں ''بوم'' ہر اس پرندے کو کہا جاتا ہے جو رات کی تاریکی میں اپنے آشیانے سے نکلتا ہے۔ سو جو پرندے رات کو اپنے آشیانے سے نکلیں اور انکے پنجے نہ ہوں تو وہ کھانا جائز ہوں گے اور جن کے پنجے ہوں گے اور وہ ان سے شکار کرتے ہوں گے، اگر چہ وہ ''بوم'' تو ہوں گے لیکن ان کا کھانا ناجائز ہوگا۔ اس لیے مترجم نے بوم بمعنی چغد یعنی ''اُلو'' ترجمہ کر کے اسے جائز لکھا حالانکہ یہ کیونکر حلال ہو سکتا ہے کیونکہ پنجے سے شکار

کرتا ہے، گوشت خور ہے۔ اس کے پنجے بہت سے شکاری پرندوں کے پنجوں سے زیادہ تیز ہیں۔ نیپال میں ''اُلو'' بازاروں میں بکتے دیکھا۔ لوگ خرید رہے تھے۔ ایک ہندو شخص ایک سڑک کے کنارے بیٹھا بیچ رہا تھا۔ وہاں اسے اور اس کے پنجوں کو خوب غور سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ ایک شاعر نے کہا ہے

؎ شاید وہ عاشقوں کو سمجھتا ہو بومِ محض
رکھتے ہیں جو وفا کی تمنا جفا کے بعد

ایک دور ایسا بھی تھا کہ شرفاء کسی احمق کو ''اُلو'' کہنا خلافِ ادب سمجھتے تھے چنانچہ جس کو ''اُلو'' کہنا ضروری ہوتا تھا اسے ''گھگھو'' کہہ دیا کرتے تھے۔ یہی لفظ اب تک پنجاب میں بولا جاتا ہے اور کسی کو بے وقوف کہنا ہو تو ''گھگھو'' بول دیتے ہیں۔

جہاں کوئی مسلمان شرعی حاکم موجود نہ ہو وہاں علماء کرام اس کے قائم مقام سمجھے جائیں گے.

فرمایا جس جگہ کوئی مسلمان شرعی حاکم نہ پایا جائے وہاں علماء اس شرعی حاکم کے قائم مقام بن جائیں گے۔ اور اگر کسی ایک عالم پر لوگ متفق نہ ہو رہے ہوں تو پھر ہر علاقے کے لوگوں کو چاہیے کہ اپنے علاقے کے سب سے بڑے عالم دین کا اتباع کریں اور اگر علماء بھی علم میں برابر ہوں تو پھر ان کے درمیان قرعہ اندازی کر لینی چاہیے۔
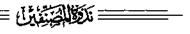
حکمرانِ وقت کا قاضی مقرر کرنا.

(فرمایا) حکمرانِ وقت خواہ عادل ہو یا ظالم، مسلمان ہو یا کافر، مسلمانوں کے باہمی تنازعات یا امورِ شرعیہ کے فیصلے کے لیے جب وہ کسی مسلمان عالم دین کو قاضی مقرر کردے گا تو اس قاضی کا تقرر درست ہوگا۔

ورثاء کو وراثت سے محروم کرنے والے، خود کہیں جنت سے محروم نہ کر دیے جائیں.

(فرمایا) بعض لوگ اپنے ورثاء کو بغیر عذر کے، اپنے ورثے سے محروم کرنے کی چالیں چلتے رہتے ہیں کہ اپنا ترکہ ہی نہیں چھوڑنا چاہیے کہ کل ان کی اولاد یا رشتے داران کی وراثت سے فائدہ اٹھائیں۔ تو انھیں سوچنا چاہیے کہ جیسے وہ ورثے سے محروم کر رہے ہیں کہیں موت کے بعد اپنے حقیقی والد سیدنا آدم علیہ السلام کے ورثے (جنت) سے خود محروم نہ ہو جائیں۔ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا دی ہے کہ جو شخص اپنے ورثاء کو ترکہ دینے سے گریز کرے تو اللہ تعالیٰ قیامت میں اسے اس کی میراث (جنت) سے محروم کردے۔ ہاں کوئی شرعی عذر ہو مثلاً اولاد فاسق و فاجر ہو اور یقین ہو کہ میرا ترکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال ہوگا وغیرہ وغیرہ تو پھر اس صورت میں ورثاء کو محروم رکھنا مستحب ہے۔

گھریلو استعمال کی اشیاء اور ان کی ملکیت کا حکم.

فرمایا شوہر جو اشیاء گھریلو استعمال کے لیے، خرید کر گھر لاتا ہے اور بیوی کے حوالے کر دیتا ہے مثلاً پنکھا، کرسیاں، صوفہ، میز، برتن وغیرہ تو جب تک صراحتاً یا قرائن سے یہ بات واضح نہ ہو جائے کہ اس نے یہ سامان اپنی بیوی کی ملکیت میں دے دیا ہے، اس وقت تک اس سامان کا مالک شوہر ہی گِنا جائے گا اور اس کے مرنے کی صورت میں یہ اشیاء اس کی وراثت میں شمار کی جائیں گی۔ یہ سمجھا جائے گا کہ یہ تمام اشیاء اس مرد نے اپنی بیوی اور بچوں کو محض استعمال کے لیے دی تھیں، مالک نہیں بنایا تھا۔ شوہر کی خریدی ہوئی چیز سے عورتیں فائدہ اٹھاتی ہیں اور شوہر اپنی بیوی اور اولاد کے ان اشیاء کے استعمال کرنے پر خوشی کا اظہار بھی کر دیتا ہے تو بھی یہ ان کے مالک ہونے کی دلیل نہیں۔ ملکیت کے لیے صراحت یا دلالت یا قرائن چاہییں۔

اولاد کو وراثت سے محروم کرنا.

فرمایا یہ جو لوگ اخبارات میں اشتہارات دیتے پھرتے ہیں کہ ہم نے اپنی اولاد کو وراثت سے عاق کر دیا، یہ اعلانات محض بے کار ہیں۔ کوئی شخص وصیت بھی کر جائے کہ میرا سارا مال فلاں کو دے دیا جائے یا فلاں کو محروم کر دیا جائے تو اس کی وصیت کا کوئی اعتبار نہیں۔ میراث دینے والے خود اللہ تعالیٰ ہیں، نہ تو کوئی شخص کسی کا یہ حق ساقط کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی شخص خود اپنا یہ حق ساقط کر سکتا ہے۔ وارث اگر کہہ بھی دے،

جیسے کہ ہمارے معاشرے میں خواتین یہ کہہ دیا کرتی ہیں ــــ میں نے اپنا حصۂ وراثت چھوڑ دیا ــــ تو بھی کہنے والے کا حق ساقط نہ ہوگا، جبراً ان خواتین کو وارث بنایا جائے گا۔ وراثت سے محروم کرنے یا خود ہو جانے کی کوئی صورت نہیں۔ صرف دو صورتوں میں حق وراثت کسی مسلمان سے ساقط ہوگا ایک تو یہ کہ مثلاً کوئی خاتون اپنا حق وراثت قبضے میں لے کر کسی کو دے دے تو اب جس کو یہ دیا جا رہا ہے اس کے لیے یہ ہدیہ ہو جائے گا، وراثت نہ رہے گی اور دوسرے یہ کہ کوئی شخص حالت صحت میں اپنا مال خود ختم کر دے تو اب موت کے بعد اس کا کوئی ترکہ نہ ہوگا تو جب ترکہ ہی نہ رہا تو وراثت کا ہے میں تقسیم ہو؟ ارتداد وغیرہ کی صورتیں اس مسئلے سے الگ ہیں۔

منصوص مسائل اور لوگوں کا تعامل.

فرمایا منصوص مسائل کے بالمقابل لوگوں کا تعامل معتبر نہیں ہوتا۔

فقہاء نے جن اقوال کو مرجوح قرار دیا ہے ان کے مطابق فتویٰ دینا جائز نہیں

فرمایا فقہاء احناف رحمہم اللہ نے اپنی کتب فتاویٰ میں جن اقوال کو مرجوح قرار دیا ہے، ان کے مطابق فتویٰ دینا جائز نہیں۔ مرجوح اقوال پر فتویٰ منصب افتاء کے خلاف بھی ہے، جہالت بھی ہے اور اجماع کو باطل قرار دینا بھی ہے۔

سود کے متعلق احکامات.

فرمایا سود کے حرام مال کا اگر کوئی شخص مالک بن جائے تو وہ مِلکِ خبیث ہے۔ اس لینے والے پر فرض ہے کہ یہ ناپاک مال جن افراد سے لیا ہے انھیں واپس کرے اگر وہ لوگ زندہ نہ ہوں تو ان کے ورثاء کو ڈھونڈ کر واپس کرے وہ بھی نہ ملیں تو بغیر نیت ثواب اس مال کو صدقہ کردے۔ اور اگر وراثت میں سودی مال ایسا ملے کہ اصل مالکان کا بھی معلوم نہیں اور اس سودی مال کے ساتھ کچھ حلال مال کی بھی آمیزش ہے تو اب تقویٰ تو یہ ہے کہ کل مال صدقہ کردے، یہ بہتر ہے اور اگر صدقہ نہ کرے اور اس مخلوط مال کو اپنی ضروریات میں استعمال کرے تو جائز ہے۔ مال کا حرام ہونا، پشت بہ پشت چلتا رہتا ہے لیکن وراثت میں یہ صورت نہیں ہوتی۔ حرام کی وراثت اگر اصل مالکان یا ان کے ورثاء معلوم ہیں تو انھیں لوٹائی جائے۔ وگرنہ یہ مال اصل مالکان کی طرف سے نیت کرکے، صدقہ کردیا جائے اور اگر حرام و حلال مخلوط ہو تو یہ مال مشتبہ بھی ہے، اور پھر اگر اصل مالکان کا بھی علم نہیں تو اب وارث کے لیے جائز ہے لیکن اس سے بھی بچے تو تقویٰ اور رضائے الٰہی کا سبب ہے۔

امام ابوبکر خصاف رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ اور باقی آئمہ کی رائے.

فرمایا اکابرین امت کا احترام چاہیے جو دنیا کا نظام قائم رکھنے اور آخرت میں نفع بخش ہے لیکن پرستش نہیں کرنی چاہیے۔ یہود و نصاریٰ اسی سبب سے اپنے دین میں
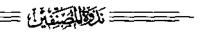
تحریف کے مرتکب ہوئے کہ ان کے ہاں جس کسی نے کوئی مسئلہ طے کر دیا اب دلائل سے اس کے خلاف ثابت بھی ہو جائے تو بھی نہیں ماننا، اپنے علماء ومشائخ کو شارع کا درجہ دے دیا۔ یہ ''شرک فی الرسالۃ'' تھا جو آہستہ آہستہ بڑھتا چلا گیا اور شرک باللہ کا سبب بنا۔ ایسے ہی اکابرین امت کا احترام نہ کرنا، ان کی مساعی کی قدر نہ کرنا، ان کے مقام سے ناواقفیت اور ان کی توہین تو نہایت خطرناک ہے۔ یہ قبیح حرکت تو کبھی کبھی سلب ایمان کا موجب بن جاتی ہے۔ ہمارے دور کے بعض اہل حدیث نوجوان اور وہابی تو خاص طور پر اس مصیبت میں مبتلا ہیں اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے اور انھیں سلامتی کی راہ نصیب فرمائے۔

اپنے اکابر سے علمی اختلاف ہمیشہ امت میں رہا ہے۔ چاہیے کہ اختلاف اور احترام کو جمع کیا جائے۔ دیکھیے علامہ احمد بن عمرو بن مہیر الشیبانی المعروف امام ابوبکر خصاف رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۲۶۱ھ کس قدر بلند پایہ شخصیت ہیں۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے صرف دو واسطوں سے شاگرد ہیں، فتویٰ یہ دیتے ہیں کہ نکاح میں لڑکی کا وکیل، لڑکی کی غیر موجودگی میں، اس کا نام لیے بغیر نکاح کر دے تو نکاح منعقد ہو جائے گا۔ حضرت شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتوے کا بہت احترام کیا ہے اور فرمایا کہ حضرت ابوبکر خصاف رحمۃ اللہ علیہ بلند پایہ ہستی تھے ان کے فتوے کو مانا جائے لیکن اس کے باوجود علامہ ابن نجیم رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتوے پر اپنی رائے تحریر فرمائی کہ حضرت خصاف رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ امام کبیر تھے لیکن فقہ حنفی میں فتویٰ اس کے برعکس ہے۔ ایک دوسری مثال دیکھیے ایک شخص نے کسی سے دس لاکھ روپے قرض لیے۔ اب واپس نہیں کرتا۔ تو جس شخص نے قرض دیا ہے کیا اس
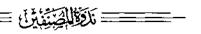
کے لیے یہ درست ہوگا کہ وہ اپنے قرض کے عوض اس شخص کی کسی ایسی گاڑی پر قبضہ کرلے، جس کی مالیت بھی دس لاکھ ہے۔ حنفی فقہاء رحمۃ اللہ علیہم اسے جائز نہیں کہتے تھے کہ شے کی جنس بدل گئی۔ قرض تو دس لاکھ کے نوٹ دیے تھے اور واپس گاڑی لی جا رہی ہے جو کہ نوٹ نہیں ہیں۔ لیکن علامہ مقدسی رحمۃ اللہ علیہ نے اس فتوے سے اختلاف کیا اور لکھا کہ میرے والد کے نانا جمال اشقر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فتویٰ دیا کہ خلافِ جنس قرض وصول کرنے کا فتویٰ اکابر کے دور میں اس وجہ سے تھا کہ لوگ قرض کی ادائیگی میں شریعت کا خیال رکھتے تھے اور اب لوگ قرض لے کر بے فکر ہو جاتے ہیں مسلسل اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں یعنی رقم ہونے کے باوجود قرض ادا نہیں کرتے اس لیے اب فتویٰ یہ ہوگا کہ خلافِ جنس سے قرض واپس لے لینا درست ہے۔ اس طرح کی سینکڑوں مثالیں مل جائیں گی کہ اکابر نے اصاغر کے قول کو قبول کیا اور اصاغر نے اکابر کے اقوال سے ہٹ کر فتویٰ دیا تو یہ علمی اختلافات ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گے۔ اس میں نہ تو کسی کی توہین ہے اور نہ عدم احترام۔ اگر کوئی شخص اسے عدم احترام سمجھتا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنی طبیعت میں اعتدال پیدا کرے۔

امام ابوبکر خصاف رحمۃ اللہ علیہ کا فقہی مقام وخدمات.

فرمایا حضرت امام ابوبکر خصاف الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد عمرو بن مہیر الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت حسن بن زیاد لؤلؤی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور وہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے، سو اس طرح امام ابوبکر خصاف رحمۃ اللہ علیہ بدو واسطہ حضرت الامام الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد
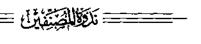
تھے۔ حدیث میں ابو داؤد الطیالسی، مسدد بن مسرھد، علی بن مدینی، ابونعیم، فضل بن دکین، امام واقدی، سفیان بن عیینہ، کندی، وکیع بن الجراح، ابن ابی الزناد جیسے محدثین اور فقہائے کرام رحمہم اللہ کے شاگرد تھے۔ بہت کتابیں تحریر فرمائیں۔ کتاب الوصایا، کتاب الشروط الکبیر، کتاب الرضاع، کتاب النفقات علی الاقارب، کتاب ذراع الکعبۃ، کتاب احکام الوقف، کتاب المسجد والقبر اور ان کے علاوہ بھی بہت کتابیں ہیں لیکن افسوس کہ اب اکثر کتابیں نہیں ملتیں۔ خلیفہ وقت المھتدی باللہ العباسی کو ان کے فتوے پر بہت اعتماد تھا اور انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا لیکن جب وہ قتل ہوا تو شہید کرنے والوں نے اسے جان سے اور انھیں کتابوں سے محروم کردیا۔ ان کی کتابوں کی لوٹ مار ہوئی اور کچھ مسودات وہ ساتھ لے گئے، انہوں نے اس خلیفہ وقت کے لیے ایک کتاب ''کتاب الخراج'' بھی لکھی تھی۔ متقی اتنے تھے کہ ہمیشہ اپنے ہاتھ سے محنت مزدوری کرکے اپنا رزق کماتے رہے۔ محنت کیا تھی؟ چمڑے سے جوتے بنانا، پیشے سے آدمی کا مرتبہ متعین نہیں ہوتا، ذات اور پیشہ دیکھیے اور علمی مرتبت اور جلالت شان دیکھیے۔ احناف کے آئمہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی کتاب النفقات کی شروح امام ابوبکر جصاص رازی، امام حلوانی، امام سرخسی، امام اِسبیجابی اور حضرت صدر الشہید رحمہ اللہ جیسی ہستیوں نے تحریر فرمائی ہیں لیکن افسوس کہ اب ان میں سے اکثر شروح نایاب ہیں۔
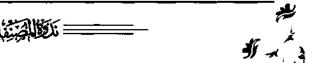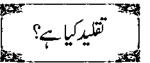
فرمایا ہر جھگڑے میں، فیصلے کی غرض سے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت رسالت مآب ﷺ کی طرف رجوع کیا جائے گا مگر ہر شخص کو بلا واسطہ رجوع کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ ضروری ہے کہ رجوع کرے لیکن جو کچھ حکم ہو اس کو سمجھنے کے لیے واسطہ ضروری ہوتا ہے اور اسی واسطے کی اتباع، تقلید کہلاتی ہے۔

قربانی کی کھال کے احکامات.

فرمایا قربانی کی کھال شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو ہدیہ کر سکتے ہیں اور جو ہدیہ قبول کرے اگر اس ہدیے کو بیچ دے تو اس کی قیمت اسے استعمال کرنا درست ہے۔ مثلاً شوہر نے قربانی کی اور اپنے جانور کی کھال بیوی کو ہدیہ کر دی، بیوی نے یہ کھال فروخت کر کے دام کھرے کیے تو اب یہ رقم اس بیوی کو خرچ کرنا درست ہے۔ ایسے ہی قربانی کی کھال سادات کرام کو دینا بھی جائز ہے۔

نکاح ایک پختہ عہد.

فرمایا نکاح اور طلاق کو لوگوں نے کھیل سمجھ رکھا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نکاح کو ''میثاق غلیظ'' (نہایت پختہ عہد) فرماتا ہے۔ یہ اتنا مضبوط عہد ہے کہ شوہر کو اگر کوڑھ یا پھلبہری ہو جائے تو بھی عورت طلاق کا مطالبہ نہیں کر سکتی اور شوہر بیوی سے کسی نقص
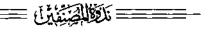
کی وجہ سے صحبت نہ کر سکے مثلاً بیوی کے ستر کا مقام جڑ گیا اور مرد دخول نہیں کر سکتا یا بیوی کے اس مقام پر ہڈی ابھر آئی اور شوہر اپنی ضرورت پوری نہیں کر سکتا تو پھر بھی بیوی کا کوئی قصور نہیں وہ ان وجوہ کی بنا پر اسے طلاق دینا تو درکار، اس کا نان ونفقہ بھی بند نہیں کر سکتا۔

جو شخص حرام مال چھوڑ کر مر جائے تو......!

فرمایا جو شخص حرام مال چھوڑ کر مر جائے تو اس کے ورثاء کو چاہیے کہ اس کل مال کو صدقہ کر دیں کیونکہ اب انھیں تو معلوم نہیں کہ یہ مال کس کس شخص سے وصول کیا گیا ہے اور اس مال کا اصل مالک کون ہے۔ فقہاء کرام رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ یہ تمام مال اللہ تعالیٰ کے ہاں پہنچ کر امانت رہے گا اور قیامت میں تفصیلی حساب کے وقت اللہ تعالیٰ یہ مال اصل مالکوں کو اس ظالم شخص کی طرف سے پہنچا دے گا۔ فتاویٰ عالمگیری میں متفرق مسائل کے ضمن میں جہاں غصب کے مسائل تحریر کیے گئے ہیں، وہاں یہ مسئلہ مل جائے گا۔

دعوتِ ولیمہ اور اس کا قبول کرنا.

فرمایا اگر کوئی دوست ولیمہ کی دعوت دے اور اس تقریب میں کوئی شریعت کے خلاف کام نہ ہو، تو ایسی دعوت کو قبول کرنا بعض فقہاء کرام کے نزدیک تو واجب ہے کہ اسے قبول نہ کرنے پر، گنہگار ہوگا چنانچہ فتاویٰ تاتارخانیہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے واجب کے قریب لکھا ہے اور فتویٰ اس بات پر ہے کہ اس دعوت میں جانا، بشرطیکہ کوئی غیر شرعی کام نہ ہو رہا ہو، تو سنت مؤکدہ ہے اور کھانا کھالے تو بہت اچھا ہے کہ دوستوں کو دلی خوشی ہوگی اور اگر کسی وجہ سے نہ کھا سکے تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔

جانور کو ذبح کرتے وقت تکبیر کا حکم۔

فرمایا جانور کو ذبح کرنے کے لیے جب قصاب چھری چلائے اور کوئی انسان قربانی کے ارادے سے اس قصاب کی چھری پر ہاتھ رکھ کر اس چھری کو چلانے لگے تو اس کے لیے بھی یہ ضروری ہوگا کہ وہ تکبیر پڑھے۔ دونوں پر تکبیر ذبح واجب ہے۔ اگر ایک نے بھی یہ سوچا کہ دوسرا تو تکبیر پڑھ ہی رہا ہے مجھے کیا ضرورت ہے اور تکبیر نہ پڑھی تو جانور حرام ہو جائے گا۔

حربی کافر اور صدقہ۔

فرمایا حربی کافر کو مسلمان صدقہ نہیں دے سکتا۔ احناف نے لکھا ہے کہ اگر چہ وہ مستامن بھی ہو تو بھی اسے تمام صدقات دینا ناجائز ہے۔ اس کے ساتھ صلہ رحمی بھی نہیں کی جائے گی اور نہ ہی اس پر احسان کیا جائے گا۔
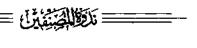
بدنظری کی نیت اور فقہاء کرام.

فرمایا یہ جو فرمایا گیا ہے کہ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے تو اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ کسی شخص نے نگاہ اٹھائی اور دور فاصلے پر اسے ایک عورت نظر آئی، اب یہ اسے دیکھنے کی نیت سے بار بار نگاہ اٹھاتا ہے۔ اس غیر محرم کو دیکھنا چاہتا ہے، لیکن جب بہت قریب آیا تو معلوم ہوا کہ یہ تو نظر کا دھوکہ تھا، کوئی عورت نہیں بلکہ یہ تو ایک درخت ہے۔ اس فعل پر گناہ ہوگا کیونکہ نیت تو غیر محرم کو دیکھنے کی تھی چنانچہ فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم نے اس کی تصریح کی ہے۔

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور فتح روم کی شرط.

فرمایا سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے روم کی فتح کے بارے میں جو شرط لگائی تھی، جب کفار مکہ وہ شرط ہار گئے تو آپ نے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے شرط میں طے شدہ اونٹ کفار مکہ سے لے لیے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ کفار مکہ حربی کافر تھے۔ اور حربی کافر کا مال معصوم نہیں ہوا کرتا، اگر ان کا مال معصوم ہوتا تو پھر یہ معاملہ جوا ہو جاتا۔ اور جوئے کا مال سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ باجازت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم لے لیں، یہ کیسے ممکن ہے؟

❀ ❀ ❀

فتاویٰ قاضی خان کا ایک اہم مسئلہ

(فرمایا) حضرت الامام قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ کے کیا کہنے، حقیقتاً فقیہہ النفس تھے۔ ان کے فتاویٰ میں ایک مسئلہ لکھا ہے جس پر احناف کثر اللّٰہ سوادھم کے مخالفین بہت جھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فتاویٰ قاضی خان میں لکھا ہے کہ جس شخص کی نکسیر پھوٹ پڑے اور خون بند نہ ہو اور وہ اپنی پیشانی پر اسی خون سے قرآن کریم کی کوئی آیت لکھے تو کیسا ہے؟ حضرت ابوبکر اسکاف رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جائز ہے پھر ان سے عرض کیا گیا کہ اگر پیشاب سے کوئی آیت لکھے تو جائز ہے؟ فرمایا اگر اس میں شفاء معلوم ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ عرض کیا گیا کہ اگر مردار جانور کی کھال پر قرآن لکھے تو؟ فرمایا یہ بھی جائز ہے۔ اب اس مسئلے کو بیان کرتے ہیں اور احناف رحمہم اللہ کو مطعون کرتے ہیں۔ جب کوئی سنتا ہے تو قرآن کریم کی نسبت سے یہ سب کچھ سن کر واقعی اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ لیکن اس مسئلے کی حقیقت یہ ہے کہ فقہائے احناف رحمۃ اللہ علیہ اس فتوے کے ساتھ پہلی شرط یہ لگاتے ہیں کہ نکسیر کا خون اس قدر بہہ رہا ہو کہ تھمتا ہی نہ ہو حتیٰ کہ زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ اب انسان غور کرے کہ ایسی حالت میں تو اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں سور کے گوشت کو کھانے کی اجازت دیتے ہیں، یہ فتویٰ تو کم درجے کا ہے کہ سور کا گوشت تو جزو بدن بنے گا۔ اب احناف رحمہم اللہ کے اس فتوے کو غلط استعمال کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی عیسائی کل کو یہ کہے کہ مسلمانوں کی مذہبی کتاب، قرآن میں سور کا کھانا جائز لکھا ہے۔ والعیاذ باللہ۔ حضرت قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری شرط یہ تحریر
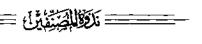
فرمادی کہ یہ عمل اس وقت جائز ہوگا جب پورے یقین سے یہ معلوم ہوجائے کہ اس طرح کرنے سے خون رک جائے اور انسانی زندگی بچ جائے گی۔ خود ہی انصاف کرنا چاہیے کہ اگر یقین سے یہ بات معلوم نہ ہوتو پھر جائز ہی نہیں ہوگا۔ اور اگر یقین سے معلوم نہ ہو اور پھر انسانی جان کا ضیاع ہوجائے کچھ پروا نہیں کرنی چاہیے، کون عقلمند یہ مشورہ دے گا اس لیے اس شرط کے بعد ہی بات بنے گی۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اس عمل کے علاوہ کوئی دوا کارگر نہ ہوسکے تو یہ عمل جائز ہے۔ اب تو سائنس کی ترقی سے ایسی ایسی ادویہ بازار میں میسر ہیں کہ ان اعمال کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس لیے یہ عمل زمانہ قدیم میں بحالت اضطرار شاید ہوتا ہوگا تو اس زمانے کے اعتبار سے یہ فتویٰ ہوگا اور یہ کون ثابت کرسکتا ہے کہ اس فتوے پر کبھی عمل بھی ہوا ہے۔ بسا اوقات لوگ محض فرضی سوالات دریافت کرتے ہیں۔ اور یہ فعل واقع نہیں ہوتا۔ حضرت قاضی خان رحمۃ اللہ علیہ کی ان تین شرائط کے بعد احناف رحمۃ اللہ علیہم کے ہاں چوتھی شرط یہ ہے کہ مریض کے لیے کوئی متبادل دوا تو ہو لیکن فوری طور پر مل نہ رہی ہو تو پھر یہ عمل جائز ہے۔ گویا کہ مریض کی جان بچانے کے لیے یہ عمل کیا جاسکتا ہے۔ اب غور کرنا چاہیے کہ جو عمل ان چار شرائط کے ساتھ مقید ہو

① مریض کے مرنے کا اندیشہ
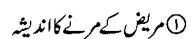
② عمل سے یقینی طور پر زندگی کا بچاؤ

③ عمل کے علاوہ کوئی دوا نہ ہو

④ دوا ہو لیکن دستیاب نہ ہو، تو پھر یہ عمل کیا جاسکتا ہے۔

اب کہاں یہ چار شرائط اور کہاں یہ کہنا کہ احناف کے نزدیک ناپاک خون اور پیشاب سے قرآن لکھنا جائز ہے۔ جب خوف خدا نہ ہو تو پھر تہمت گھڑنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ اس طرح تو قرآن کریم سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ کفر کا کلمہ بکنا، توہین رسالت کا ارتکاب اور گنہگار کی توبہ کبھی قبول نہ ہونا سبھی باتیں قرآن میں لکھی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احناف کتاب وسنت کا اتنا احترام اور ادب کرتے ہیں کہ باید وشاید۔ ہمارے حضرت، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تو اپنے اجتہاد اور مسلک کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ ہمارے ہاں حدیث شریف اگرچہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو، قیاس اور رائے سے بہتر ہے۔ اس اُصول پر حنفی فقہاء کا اجماع ہے اور ہمارے اس اصول کو ہر مکتبۂ فکر کے فقہائے کرام نے نقل بھی کیا ہے کہ احناف کے ہاں یہ اصول مسلّم ہے۔

''اعلام الموقعین'' میں حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ تک نے اس اجماع کو نقل کیا ہے۔ کنوئیں کی پاکی اور ناپاکی کے متعلق جو بھی مسائل ہیں، ان میں ہم نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار پر عمل کیا ہے اور قیاس کو بالکل ترک کر دیا ہے۔ امام بیٹھ کر نماز پڑھائے اور اس کے پیچھے مقتدی کھڑے ہو کر نماز پڑھیں، یہاں قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ مقتدیوں کی نماز فاسد ہو کیونکہ مقتدی کی حالت قیام کی ہے اور امام کی حالت بیٹھنے کی ہے تو مقتدی کی حالت امام سے بہتر ہے اور اگرچہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ یہ ہے، لیکن ہم نے قیاس کو صحیح حدیث ہی کی بنیاد پر تو ترک کیا ہے کہ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض وفات میں نماز میں بیٹھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی امامت کی حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حالت قیام کی تھی۔ اس لیے احناف کے خلاف یہ ڈھنڈورا پیٹنا کہ ان کی فقہ

خلاف حدیث ہے، ایسا الزام ہے جس کی باز پُرس قیامت میں ہوگی، ہمیشہ جھوٹ اور تہمت لگانے سے بچنا چاہیے۔ مقلدین میں سے جو محدثین کرام اور غیر مقلدین میں سے جو آئمہ کرام رحمۃ اللہ علیہ کی بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں، سبھی کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں اور اپنی روش تبدیل کریں وگرنہ بے ادبی دنیا وآخرت دونوں برباد کر دیتی ہے۔

ازدواجی تعلقات قائم کرنے میں تین مقاصد.

فرمایا اہلیہ کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں تین مقاصد یا نیتیں ہونی چاہیں

① اللہ تعالیٰ صالح اولاد عطا فرمائیں۔ امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ تو شادیاں اسی غرض سے کرتے رہے کہ اولادِ صالحہ میں اضافہ ہو۔

② بیوی کے حقوق کی ادائیگی کے لیے کہ حقوق العباد میں بیوی کا ایک اہم حق یہ بھی ہے

③ اپنے اطمینان نفس کے لیے کہ ذہن پرسکون ہو اور اپنے دینی اور دنیوی کام اطمینان سے پایہ تکمیل تک پہنچا سکے۔

مشتبہ مال اور اس کا مصرف.

فرمایا کسی شخص کے پاس کوئی ایسا مشتبہ مال ہو جسے اس نے خیرات کرنا ہے تو یہ ضروری تو نہیں کہ وہ اس مال کو کسی غیر پر خیرات کرے یا مسجد کے بیت الخلاء بنوا دے اگر اس مال کو وہ اپنے بھائی کو دے دے، والد کو دے دے یا خاندان میں ہی کسی کو دے دے تو اس کی ذمہ داری ادا ہو جائے گی۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کے لیے دعائے مغفرت.

(فرمایا) حضرت رسالت مآب ﷺ صغائر و کبائر تمام گناہوں سے معصوم تھے اس لیے کوئی امتی ان کے لیے دعائے مغفرت مانگے، یہ جائز کیا، گناہ کی بات ہے۔ کیونکہ یہ وہم پیدا ہوگا کہ ان سے کوئی کوتاہی ہوگئی تھی جو امتی ان کے لیے دعائے مغفرت مانگ رہا ہے۔

خطبہ جمعہ کے احکام.

(فرمایا) خطبہ جمعہ جب شروع ہو جائے تو پھر اس کے سننے کا حکم نماز ہی کی طرح کا ہو جاتا ہے یعنی جیسے نماز میں کھانا پینا، بات چیت کرنا، اِدھر اُدھر دیکھنا، گھڑی دیکھنا، پیدل چلنا، کوئی فضول حرکت کرنا وغیرہ سبھی کام منع ہیں ایسے ہی یہ کام اگر کوئی خطبہ کے دوران کرے تو گنہگار ہوگا۔

وقف کو دوبارہ وقف کرنا.

(فرمایا) وقف کو دوبارہ وقف نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ایک مقام پر قبرستان تھا اور اس کی زمین وقف تھی اب اگر کوئی یہ چاہے کہ ان تمام قبرں کو مٹا کر دوبارہ اس زمین کو مسجد کے لیے وقف کردے تو حرام ہے وہ دوبارہ وقف ہو نہیں سکتی کیونکہ اب اس پر قبرستان بن چکا۔

فاسق اور عدالت میں گواہی
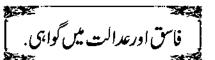
(فرمایا) جس شخص کو شریعت کا ضروری علم بھی حاصل نہ ہو مثلاً اسے یہ نہ پتہ ہو کہ غسل یا وضو کب فرض ہوتا ہے یا نماز کے فرائض کیا ہیں یا نماز کن کاموں سے ٹوٹ جاتی ہے یا نماز باجماعت کو جان بوجھ کر ترک کر دیتا ہے یا اپنی اولاد کو گالیاں دیتا ہے، محلے وغیرہ میں لوگوں کو گالیاں دیتا پھرتا ہے یا اسے معلوم ہی نہیں کہ ضروریات دین کیا ہیں تو ایسا شخص خود ہی فاسق ہو جائے گا اور عدالت میں اس کی گواہی قابلِ قبول نہ ہوگی۔

زکوٰۃ کا وکیل اگر خود مستحق ہو تو....!

(فرمایا) کسی شخص نے اپنی زکوٰۃ کا وکیل کسی دوسرے شخص کو بنایا اور اسے اجازت دی کہ وہ زکوٰۃ کی رقم جس مستحق کو چاہے، دے دے تو اگر یہ وکیل خود مستحق ہے یا اس کی اولاد، بیوی وغیرہ مستحق ہیں تو یہ زکوٰۃ کی رقم یہ خود بھی رکھ سکتا ہے اور اپنی بیوی اور بچوں کو بھی دے سکتا ہے کیونکہ زکوٰۃ دینے والے (مالک مال) نے اسے مطلقاً اجازت دے دی ہے۔

جائیداد کی تقسیم اور نالائق اولاد

(فرمایا) جس شخص کے ورثاء مالدار ہوں یا اسے معلوم ہو کہ اگر میں اپنے مال میں سے ۳/۱ حصے کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کر دوں اور اس کے بعد بھی جو میرا مال یا جائیداد

بچے گی، میرے ورثاء میں سے ہر ایک کا حصہ اسے مالدار کر دے گا تو اس شخص کے لیے بہتر یہ ہے کہ اپنے مال میں سے ۳/۱ حصہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دے اور اگر اسے معلوم ہو کہ جو مال اور جائیداد میں چھوڑ کر دنیا سے جاؤں گا، اس کے حصے جب تقسیم ہوں گے تو میرے تمام ورثاء مالدار نہ بن سکیں گے تو پھر ایسے شخص کے لیے ثواب کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے مال میں سے ۳/۱ حصہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے کی وصیت نہ کرے کیونکہ وہ ۳/۱ حصہ اللہ تعالیٰ کی جس راہ میں بھی خرچ کرے گا مثلاً مسجد کی تعمیر، مدرسے کی مدد، بیماروں کی ادویہ، یتیم خانہ وغیرہ ان تمام مصارف سے بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کا خیال کرے اور انھیں کھاتا پیتا چھوڑ کر جائے اور اگر اولاد نالائق ہو اور معلوم ہو کہ یہ میرے چھوڑے ہوئے مال یا جائیداد کو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذریعہ بنادیں گے تو ایسی نالائق اولاد کو وراثت سے محروم کر دینا بہتر ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی زمین اس کی نافرمانیوں سے پاک رہے۔

قرآن کریم کی تلاوت اور فرض نماز کی جماعت.

فرمایا اگر کوئی شخص تلاوت قرآن کریم میں اتنا مصروف ہوگیا کہ فرض نماز کی جماعت جاتی رہی تو ایسی تلاوت کرنا گناہ ہوگی۔ اگر کوئی شخص اتنی تلاوت کرے کہ کمزور پڑ جائے اور رمضان شریف کا فرض روزہ نہ رکھ سکے تو ایسی تلاوت کرنا جائز ہی نہیں گناہ کی بات ہے۔ کسی شخص نے فرض روزہ رکھا اور پھر اتنی کمزوری ہوگئی کہ فرض نماز کھڑے ہو کر ادا نہیں کر سکتا تو اسے فرض روزہ چھوڑ دینا جائز نہیں روزہ رکھے اور فرض نماز بیٹھ کر ادا کرے۔

بغیر عذر کے زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر.

فرمایا مال اور سونے چاندی وغیرہ پر جونہی سال پورا ہو یا جونہی زکوٰۃ کی ادائیگی کا دن آئے، اسی دن زکوٰۃ فوراً ادا کرنا ضروری ہے، بغیر کسی عذر کے زکوٰۃ کی ادائیگی میں تاخیر کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ حضرت امام کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ایسے شخص کی گواہی قبول نہیں کی جاسکتی ہے اسے رد کردینا چاہیے۔

نماز کا ایک اہم مسئلہ.

فرمایا کسی شخص نے کوئی فرض نماز پڑھنی شروع کی پھر اسے خیال آیا کہ یہ نماز تو میں پڑھ چکا ہوں اور اس نے نماز توڑ دی، تو درست کیا اب اس کے ذمے کوئی قضا نہیں لیکن کسی شخص نے نفل نماز شروع کی اور پھر اسے توڑ دیا تو اس کے ذمے ان نفلوں کو دوبارہ پڑھنا یعنی انکی قضا کو ادا کرنا یعنی دو نفل پڑھنا واجب ہے۔

مفتی کو جب دو صحیح قول مل جائیں تو.....!

فرمایا مفتی کو جب فتویٰ دینے کے لیے دو صحیح قول مل جائیں اور کسی ایک قول کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو پھر کسی بھی ایک قول پر افتاء وقضاء جائز ہوتی ہے۔
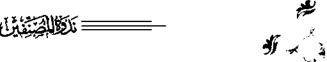
چند مسافروں کا اپنے طور پر نماز جمعہ ادا کرنا.

فرمایا چند مسافر مل جائیں اور بروز جمعہ اپنا جمعہ قائم کرنا چاہیں تو جمعہ تو درکنار نماز ظہر بھی باجماعت نہیں پڑھ سکتے شہر کے جمعہ میں شرکت کریں۔ شہر کی نمازِ جمعہ سے پہلے اور نمازِ جمعہ کے بعد بھی مسافر، قیدی اور معذور افراد اپنی نماز ظہر علیٰحدہ علیٰحدہ پڑھیں۔ جماعت کرانا جائز نہیں۔

محدثین اور فقہاء کا کسی حدیث کو موضوع قرار دینے میں معیار.

فرمایا کسی بھی حدیث پر کوئی حکم لگانے کے معاملے میں محدثین اور فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے طریقۂ کار میں فرق ہے۔ محدثین جب کسی حدیث کو ''ضعیف''، ''منکر'' یا ''غریب'' کہتے ہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو حدیث اس وقت پیش نظر ہے اس کی سند یا متن میں ضعف یا نکارت ہے یہ ضروری نہیں ہوا کرتا کہ اسی حدیث کے باقی طرق بھی ضعیف یا منکر ہوں۔ عین ممکن ہے کہ وہ حدیث کسی اور سند یا متن کے اعتبار سے بالکل صحیح ہو لیکن فقہائے کرام رحمۃ اللہ علیہم کا طریقہ مختلف ہے کہ وہ جب کسی حدیث کو موضوع کہتے ہیں تو اس حدیث کے متن پر موضوع ہونے کا حکم لگا رہے ہوتے ہیں کہ اس حدیث کے جتنے بھی متون ہیں سب موضوع ہیں۔

❀ ❀ ❀

سفہ اور عبث میں فرق.

(فرمایا) ''سَفَہْ'' اور ''عَبَثْ'' میں فرق ہے۔ ''اَلْعَبُثْ'' کے معنی ہیں کسی سنجیدہ کام کے ساتھ کھیل کود کو شامل کردینا۔ اسی لیے وہ کھانا جو مختلف اشیاء کو باہم ملا کر پکایا گیا ہو ''اَلْعَبُثْ'' کہلاتا ہے۔ کھجور، گھی اور ستو کو ملا کر جو آمیزہ یا کھانا تیار کیا جاتا ہے اسے ''عَوْ بَثَانِیْ'' کہا جاتا ہے۔ سنجیدہ کام ہمیشہ کسی غرض کے تحت کیے جاتے ہیں اور کھیل کود کے کام عام طور پر بغیر کسی صحیح غرض کے غفلت سے انجام پاتے ہیں اس لیے ''اَلْعَبَثْ'' اس کام کو بھی کہتے ہیں جس کا مقصد صحیح نہ ہو۔ فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم اپنی اصطلاح میں ''عَبَثْ'' اس فعل کو کہتے ہیں، جس فعل کو کرنے والے کی غرض صحیح نہ ہو۔ یا اس کی غرض شرعی نہ ہو، مثلاً ایک شخص رقم اس غرض سے جمع کرے کہ اس سے شراب پیئے گا تو اس کا یہ فعل عَبَثْ ہے اسی لیے فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم ہر عبث کام کو حرام کام قرار دیتے ہیں۔ اور سَفَہْ کا مطلب یہ ہے کہ وہ کام جس کا کوئی مقصد ہی نہ ہو دراصل یہ لفظ (سَفَہ) بنیادی طور پر ہلکے پن کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہلکی چیز قیام پذیر نہیں ہوتی اور اس میں اضطراب پایا جاتا ہے۔ اسی لیے ''مہار'' کو ''زِمَامٌ سَفِیْہٌ'' کہا جاتا ہے کہ وہ ہر وقت متحرک رہتی ہے اسے قرار نہیں ملتا۔ ''ثَوْبٌ سَفِیْہٌ'' ردی اور بے کار کپڑے کو کہا جاتا ہے اور اسی وجہ سے وہ انسان جو ہلکا ہو، جس کی رائے میں استقامت نہ ہو لمحہ بہ لمحہ اپنے فیصلے اور سوچ تبدیل کرتا رہے اسے بھی ''سَفِیْہٌ'' بیوقوف کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی زندگی، اس کی فکر، اس کا کلام اور اس کے فیصلے سب بے مقصد ہوا کرتے ہیں۔ اس وجہ
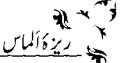
سے فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک یہ ''عَبَث'' سے بھی بدتر ہے کہ وہ تو ایسا کام کرتا ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں میں خسارہ اٹھاتا ہے۔ بیوقوف آدمی یا تو عقل سیکھنے کی کوشش کرتا رہے اور یا پھر عقلمندوں کی مجلس میں بیٹھ کر ان کی گفتگو سنے اور ان کے اعمال کی علت سمجھنے کی کوشش کرے اور یا پھر اپنے آپ کو کسی عقلمند کے حوالے کر دے اور یا پھر خاموشی سے موت کا انتظار کرے۔

کتاب وسنت کا باہمی تعلق

فرمایا اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے کہ رکوع کرو اور سجدہ کرو اس لیے نماز میں رکوع اور سجدہ کیا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ارشاد فرمایا گیا کہ رکوع کرو تو ایک رکعت میں ایک رکوع کرلیا گیا۔ حکم ربانی کی اطاعت ہوگئی۔ پھر فرمایا گیا کہ سجدہ کرو تو اگر ایک سجدہ بھی کرلیا جاتا تو آیت کریمہ پر عمل ہو جاتا پھر سجدے دو کیوں اختیار کیے گئے؟ اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ اس آیت میں اجمال ہے تفصیل نہیں ہے۔ اور اس آیت پر عمل کرنے کے لیے تفصیل ہمیں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ملے گی کہ آپ نے اس آیت پر عمل کرتے ہوئے نماز کی ہر آیت میں رکوع تو ایک ہی کیا لیکن سجدے ہمیشہ دو کیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تشریح کبھی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال سے ہوتی ہے اور کبھی اعمال و افعال سے۔ اس لیے جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہدایت کے لیے صرف قرآن کافی ہے اور سنت یا احادیث کی کوئی ضرورت نہیں تو پھر وہ اس مندرجہ بالا سوال کا

جواب دے دیں۔

ادب اور بے ادبی کا معیار.

فرمایا ادب اور بے ادبی کا مدار کبھی عرف پر بھی ہوتا ہے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ کے دور میں یہودی اپنی عبادت گاہ میں داخل ہونے سے پہلے جوتے اُتار دیا کرتے تھے۔ آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کی مخالفت کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہودیوں کے برعکس تم لوگ مسجد میں جوتوں سمیت آیا کرو۔ چنانچہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم سے جوتوں سمیت مسجد میں جانا بھی ثابت ہے۔ لیکن اب مسلمان ہر جگہ مسجد میں جوتے پہن کر جانے کو بے ادبی سمجھتے ہیں تو مسجد کی تعظیم کا اعتبار اب عرف پر آ گیا اور مفتی حضرات نے فتویٰ دیا کہ مسجد میں جوتے پہن کر داخل ہونا مکروہ ہے۔ ایسے ہی عرب اور انگریز اپنے بڑوں کو اَنْتَ (تو) You (تو) کہہ کر بلاتے ہیں اور ہمارے ہاں بڑوں کے لیے ''آپ'' کا لفظ بولا جاتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی اپنے بڑوں یا ماں باپ وغیرہ کو یہاں ''تو'' کہہ کر پکارے گا تو بے ادب سمجھا جائے گا اور فی الواقع ہے بھی ''بے ادب'' کہ عرف عام کا اعتبار نہیں کرتا۔

فقہاء کا یہ فرمانا کہ ''یہ بات نہ کرنا بہتر ہے'' کی وضاحت.
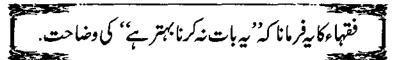
فرمایا فقہاء کرام رحمۃ اللہ علیہم جن امور پر یہ تحریر فرماتے ہیں کہ ''یہ بات نہ کرنا بہتر ہے'' تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کرتا کہ اگر کوئی شخص وہ کام کر لے تو گناہ کا مرتکب ہوگا بلکہ

مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کام کو اگر کر بھی لے تو کوئی حرج نہیں۔ اس کی ایک واضح مثال یہ بھی ہے کہ فرض نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے بعد قرآن کریم کی کوئی سورت یا چند آیات کا پڑھنا واجب ہے اور آخری دو رکعتوں میں جیسے ظہر، عصر اور عشاء یا آخری ایک رکعت میں جیسے کہ مغرب، میں سورۂ فاتحہ کے بعد اگر کوئی سورت یا چند آیات پڑھے تو اس پر فقہاء کرام رحمہم اللہ فتویٰ دیتے ہیں کہ یہ خلاف اولیٰ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان آخری رکعتوں میں سورت یا آیات کا ملانا جائز ہے۔ اگر کوئی شخص یوں کرے تو گناہ نہ ہوگا۔

اس کی ایک دوسری مثال یہ بھی ہے کہ جس شخص نے قربانی کرنی ہو اس کے لیے ذی الحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد ناخن تراشنا یا جسم کے بال لینا مناسب نہیں۔ مستحب یہ ہے کہ قربانی ہو چکنے کے بعد صفائی حاصل کرے لیکن اگر کوئی شخص اس پر عمل نہیں کرتا ذی الحجہ کا چاند نظر آنے کے بعد قربانی سے پہلے ان نو دنوں میں صفائی حاصل کرتا ہے۔ ناخن ترشواتا ہے تو یہ بالکل جائز ہے کوئی گناہ نہ ہوگا۔

بدعت جب اہل بدعت کا شعار نہ رہے تو.....!

فرمایا بدعت، جب اہل بدعت کا شعار نہ رہے تو پھر اس کام کو کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ کسی کام پر بدعت کا حکم لگانے کے لیے بہت احتیاط چاہیے۔ کوئی کام اگر بنیادی طور پر کتاب وسنت سے نہیں ٹکراتا، تو وہ بدعت نہیں ہوتا اگر چہ اس کام کی کتاب وسنت میں کوئی دلیل بھی نہ ہو۔ قرآن کریم جو رکوعات میں تقسیم کیا گیا ہے تو
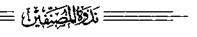
اس تقسیم کی کتاب وسنت میں کیا دلیل ہے؟ اور ایسے ہی ہر آیت کے بعد نمبر شمار لکھ دیا گیا ہے، اس لکھنے کی بھی، کتاب وسنت سے کیا دلیل ہے؟ عام طور پر کھانے کی دعوت میں اصل کھانے کے بعد جو میٹھی چیز (Sweet Dish) کھلائی جاتی ہے اس کا کتاب وسنت میں کیا ثبوت ہے؟ حضرت رسالت پناہ ﷺ کو اگر چہ میٹھا پسند تھا لیکن دعوتوں میں جس اہتمام سے میٹھا کھلایا جاتا ہے اس اہتمام کی اصل کیا ہے؟ خود مدارس کا پختہ اور خوب آرام دہ بنانے کا مسئلہ بھی ایسے ہی ہے کہ کتاب وسنت میں ایسے مدارس کا کیا جواز ہے؟ سو یہی کہیں گے کہ یہ تمام افعال کتاب وسنت کے منافی نہیں اگر چہ براہ راست ان کا ثبوت بھی نہیں۔ ایسے ہی کوئی کام درحقیقت جائز ہو اور اہل بدعت کا شعار بن جائے تو جب تک وہ ان کا شعار رہے گا، اس وقت تک اس کام کو نہیں کیا جائے گا کہ اہل بدعت سے مشابہت پیدا نہ ہو اور جب وہ وقت گذر جائے اور وہ فعل اہل بدعت کا شعار نہ رہے تو پھر اس کام کو کرنے میں بھی کوئی حرج نہ ہوگا۔ مثلاً کسی زمانے میں اہل السنۃ والجماعۃ کے فقہاء کرام رحمہم اللہ دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے سے منع فرماتے تھے کہ اس زمانے میں یہ اہل بدعت کا شعار تھا۔ اب کوئی منع نہیں کرتا کہ اب دائیں ہاتھ کو انگوٹھی کے لیے مخصوص کرنا اہل تشیع کے شعائر میں سے نہیں رہا۔ فقہاء کرام رحمہم اللہ کی کتابوں میں اس اصول کی متعدد مثالیں ملیں گی۔

بدعت کو کبھی تو اس وجہ سے منع کرتے ہیں کہ اس فعل میں بدعتیوں سے مشابہت پیدا ہوتی ہے اگر چہ وہ فعل سنت سے ثابت ہی کیوں نہ ہو ہاں جب کوئی فعل بدعت اور واجب کے درمیان دائر ہو جائے تو اس کام کو کیا جائے گا کیونکہ واجب فعل کا کرنا

ضروری ہے، بدعت کا لحاظ نہ کیا جائے گا اور جب کوئی فعل سنت اور بدعت کے درمیان دائر ہو تو اس کام کو چھوڑ دیا جائے گا کیونکہ بدعت کا ارتکاب حرام ہے اور سنت کے اتباع سے کہیں زیادہ ضروری یہ ہے کہ بدعت سے بچا جائے کیونکہ اس کا ارتکاب حرام ہے۔ حرام سے بچنا فرض ہے۔ مثلاً دیکھیے سیاہ عمامہ باندھنا حضرت رسالت مآب ﷺ سے ثابت ہے۔ فتح مکہ زادھا اللہ شرفاً و تعظیماً کے موقع پر آپ نے یہی زیب سر اقدس فرمایا تھا لیکن ہمارے دور میں یہ شیعہ اور خوارج دونوں کا یکساں شعار بن گیا ہے اس لیے اس سے منع کیا جائے گا کہ یہ سیاہ عمامہ ان دونوں بدعتی فرقوں کا شعار بن گیا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ اس سے بچیں گے کہ یہ اگرچہ سنت سے ثابت لیکن اہل بدعت کا شعار ہے لہٰذا اس مشابہت سے بچنا واجب ہے۔

اور کبھی بدعت سے بچنا اس لیے بھی ضروری ہوتا ہے کہ وہ فعل سرے سے شریعت سے ثابت نہیں ہوتا۔ شیعہ جو تعزیہ برآمد کرتے ہیں اس کی اصل شریعت میں کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ دور از کار تاویلات سے ثابت کیا جاتا ہے اور الزامی جوابات دیے جاتے ہیں ورنہ تو یہ خود اہل تشیع کے ہاں بھی متفقہ طور پر ثابت نہیں ہے۔ اس لیے جو کام دراصل شرعاً ثابت ہی نہ ہو اور نہ وہ ایسا کام ہو جو اُمورِ شرعیہ میں معاون ثابت ہوتا ہو، یا اُمورِ خیر کا وسیلہ بنتا ہو تو ایسا کام بدعت اور حرام کے زمرے میں آئے گا اس لیے اس سے بچنا بھی ضروری ہوگا۔

اور کبھی کوئی شخص اہل بدعت جیسا کام خود کرتا ہے تاکہ وہ اہل بدعت سے مشابہت پیدا کر سکے، اپنے آپ کو انہی میں سے ایک ہونے کا تاثر دے تو پھر مسئلہ یہ پیدا ہو جاتا

ہے کہ آخر وہ یہ تاثر کیوں دینا چاہ رہا ہے؟ اس لیے کہ انھیں دھوکہ دے تو دھوکہ تو انھیں دینا بھی جائز نہیں ہے، جو دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ کجا یہ کہ اہل بدعت کو دھوکہ دیا جائے کہ وہ کم سے کم دائرہ اسلام میں تو داخل ہیں۔ یا وہ یہ تاثر اس لیے پیدا کرنا چاہتا ہے کہ اہل بدعت نے ہتھیار اٹھا لیے ہیں۔ خوارج کی طرح عام مسلمانوں کے جان و مال کو مباح سمجھ کر وحشیانہ حرکتیں کر رہے ہیں۔ شرعی حکومت انھیں تہہ تیغ کرنے کی غرض سے مخبری کے لیے اپنی فوج کو اہل بدعت کے شعائر اختیار کرنے کا حکم دیتی ہے۔ تو ان مقاصد کے لیے اہل بدعت کے شعائر کو شرعی فرائض کو انجام دینے کی غرض سے، اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یا کسی وقت علماء کرام کو جو صحیح معنی میں اصحاب علم وتقویٰ ہوں اور ڈر رہے ہوں کہ ان اہل بدعت پر اگر کام نہ کیا گیا اور دین کی صحیح تصویر ان کے سامنے نہ رکھی گئی تو یہ اب تو بدعتی ہیں، پھر کافر ہو جائیں گے تو اس صحیح مقصد کے تحت اور کفر سے بچانے کی خاطر یہ کسی وقت اہل بدعت کے شعائر کو اپنا لیں تو اس میں بھی کچھ حرج نہ ہوگا لیکن یہ راستہ بہت خطرناک ہے۔ اس راہ پر اسی کو چلنا چاہیے جو علماء راسخین کے زمرے میں آتا ہو۔ علم میں منجھا اور سلوک وتصوف کی گھاٹیوں کو عبور کر چکا ہو اور مشہور مقتداء بھی نہ ہو ورنہ ان کو کفر سے بچاتے بچاتے اپنے متبعین کو بدعات کے گڑھے میں پھینک دے گا۔

علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ اور ''فتح القدیر''

فرمایا صاحب فتح القدیر علامہ ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کتنے بڑے فقیہ تھے اس کا صحیح اندازہ

اس وقت ہوتا ہے، جب کوئی شخص خود فتح القدیر کا مطالعہ کرے۔ فقہ حنفی کے اصولوں پر فروعات کو ایسے منطبق کرتے ہیں کہ گویا انگوٹھی میں ہیرا جڑتے ہیں۔

یہ سیواسی الاصل ہیں ان کے آباء واجداد ترکی کے شہر سیواس کے رہنے والے تھے اور ان کے والد ''سیواس'' شہر کے قاضی بھی تھے اس لیے یہ سیوٗاسیؔ کہلائے۔ اسکندریہ (مصر) میں پیدا ہوئے پھر وہیں عمر بسر کی اور قاہرہ میں انتقال ہوا۔ عام طور پر ''الکمال ابن الھُمَام'' یا ''ابن الھُمَام'' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ دس سال کے بچے تھے کہ والد، مرحوم ہوئے اور نانی مرحومہ نے تربیت کی قرآن کے حافظ تھے اور ایسے ذہین تھے کہ ان کے جوابات پر ان کے اساتذہ رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ علم حدیث بھی خاص طور سے پڑھا اور پھر سلوک ومجاہدہ کے مقامات طے کرنے کے بعد صاحبِ کرامت اولیاء اللہ میں شمار کیے جانے لگے حتیٰ کہ اپنے دور کے ''ابدال'' میں شمار کیے گئے۔ ان کے اساتذہ میں علامہ بدرالدین عینی، شیخ سراج الدین قاری الھدایہ، ابن شحنہ، ابن جماعہ، شُمُنّی اور حافظ ابن حجر عسقلانی شافعی رحمۃ اللہ علیہم جیسے آسمان علم کے آفتاب وماہتاب تھے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مزید کرم فرمایا اور ان کے شاگرد بھی ایسے ہی دنیائے علم کے نامی گرامی اساتذہ ہوئے۔ علامہ مناوی شافعی، علامہ ابن امیر الحاج حنفی، قاسم بن قطلو بغا، امام سخاوی، امام جلال الدین السیوطی اور شیخ الاسلام زکریا بن محمد الانصاری جن کے علم کی چاپ سے اب بھی عالم اسلام گونج رہا ہے، یہ پورا گروہ اسی ہستی سے سیراب ہوا تھا۔ یہ بھی اپنے دور کے علماء کے حسد کا شکار ہوئے اور پھر زندگی کے آخری سال میں قاہرہ سے مکہ مکرمہ حاضر ہوگئے۔ اب بقیہ تمام زندگی وہیں گذارنے کا ارادہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کا ارادہ غالب
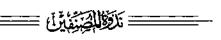
آیا اور بلاشبہ اسی کا ارادہ اصل ہے اور یہ قاہرہ لوٹے۔ رمضان المبارک ۸۶۰ھ میں انتقال ہوا۔ قاہرہ مصر کے سفر میں ''قرافہ'' کے مقام پر جو ایک بڑا قبرستان ہے، یہ وہیں مدفون ہیں اور بے شمار اکابرین اُمت رحمۃ اللہ علیہم کی قبور کی زیارت ہوئی تھی۔ ابن عطاء اللہ سکندری مشہور صوفی بزرگ اور ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار ہی میں یہ مدفون ہیں اسی پر حاضری ہوئی اور دیر تک ان کی شخصیت اور خدمات کے سحر میں کھوئے رہے۔

فقہ حنفی پر اللہ تعالیٰ نے ان سے بہت کام کروادیا۔ بدیع النظام کی شرح تحریر فرمائی ہے اور فتح القدیر میں اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ اپنے شیخ عمر بن علی قاری الہدایہ رحمۃ اللہ علیہ کے فتاویٰ بھی جمع فرمائے مگر ان کا اصل کام ہدایہ کی شرح ''فتح القدیر'' کا تحریر فرمانا ہے جو کہ بظاہر ہمیشہ ان کے ایصال ثواب کا ذریعہ قرار پائے گا۔ اگرچہ اس میں انہوں نے تفردات کو بھی اختیار کیا ہے لیکن مجموعی اعتبار سے یہ ایک بے مثال کتاب اور کاوش ہے۔ نماز کے کئی ایک مسائل میں ان کے اپنے فتاویٰ ہیں جو کہ اُمت کے مختار نہیں ہیں لیکن یہ پڑھنے سے معلوم ہوا کہ فقیہہ کیا مجتہدانہ شان رکھتے تھے۔

کتاب الصلوٰۃ میں یہ بحث کی ہے کہ نماز مغرب کے فرائض سے پہلے، دو نفل پڑھنا کیسا ہے؟ اور آخر پر لکھا ہے کہ تمام بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دو نفل مستحب نہیں ہیں، لیکن کیا یہ ثابت ہو سکے گا کہ یہ دو نفل مکروہ ہیں؟ نہیں کیونکہ کراہت ثابت کرنے کے لیے نفی استحباب کے علاوہ کوئی مستقل دلیل درکار رہے۔ مستحب کام نہ کرنے سے کراہت تنزیہی لازم نہیں آتی۔ کراہت تنزیہہ ہو یا تحریمہ اس کے ثبوت کے لیے ہمیشہ دلیل درکار ہوتی ہے۔ ہے کوئی ٹھکانہ اس فقاہت کا۔ پچھلی صدی کے مفتی اور

علماء حضرات طاب اللہ ثراہم بوقت ضرورت ہی سہی اس کا کچھ نہ کچھ مطالعہ کر ہی لیا کرتے تھے اب تو وہ بھی نہ رہے۔ علماء وفقہاء احناف اس عظیم کتاب کی طرف اعتنا فرماتے، اس کی تحقیق وتخریج ہوتی اور کم سے کم ایک نسخہ ہی ایسا تیار ہو جاتا کہ اس کا سہولت سے مطالعہ کیا جاسکتا مگر اب تک ایسے بھی میسر نہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''السیاسۃ الشرعیۃ''

فرمایا حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو بھی مسلمان کرلیا جنھوں نے اپنے قبول اسلام میں یہ شرط لگادی تھی کہ وہ دو سے زیادہ نمازیں ادا نہیں کریں گے۔ اور ان لوگوں کو بھی مسلمان کرلیا جنھوں نے یہ کہا کہ وہ شراب پیتے رہیں گے۔ ان لوگوں کی شرائط تسلیم کرنے میں مصلحت یہ تھی کہ کم سے کم یہ لوگ کفر سے تو باہر نکل آئیں گے۔ پھر ان کا اسلام، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت، عامۃ المسلمین سے اختلاط، نماز، کفر سے ٹکراؤ، اسلام کے لیے غیرت وحمیت اور خود حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں وغیرہ وغیرہ یہ تمام عوامل مل کر انھیں ان گناہوں کے ترک اور توبہ کی طرف رغبت دلائیں گے۔ اس طرح کی باتوں کو سمجھنے اور اسلام کا مزاج پھر اس میں جو حکمت اور قانون کا امتزاج ہے، اس کی تفہیم کے لیے، حضرت شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "السياسة الشرعية"، امام ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "حجة الله البالغة"، ابن عاشور رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "مقاصد الشريعة" اور امام رازی، ابن خلدون، امام شاطبی، مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ کی تمام کتابوں کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے۔
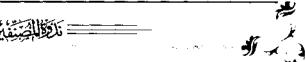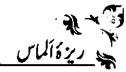
عیدین کی نماز اور زمین کا وقف ہونا.

فرمایا حضرت رسالت پناہ ﷺ نے جن مساجد میں جمعہ یا فرض نمازیں پڑھائی ہیں وہ تمام مساجد وقف شدہ زمین پر قائم تھیں اگر وہ زمینیں وقف نہ ہوتیں تو مسجد ہی نہیں بن سکتی تھیں البتہ جہاں نماز عید پڑھائی ہے وہ زمینیں وقف نہ تھیں بلکہ لوگوں کی نجی ملکیت تھیں اسی وجہ سے فقہائے احناف رحمہم اللہ نے تصریح کی ہے کہ نماز عیدین کے لیے زمین کا وقف ہونا نہ عیدین کی سنت ہے نہ مستحب، سنت تو صرف یہ ہے کہ صحرایا جنگل یا شہر میں ایک کھلا میدان ہو۔

بلغاریہ کی موسمی صورتحال ــــــ شمس الائمہ حلوانی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ اور شیخ کبیر بقالی رحمۃ اللہ علیہ کی ذہانت.

فرمایا بلغاریہ میں ایسے بھی دن آتے ہیں کہ سورج ایک طرف مغرب میں غروب ہو رہا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی مشرق سے سورج کا طلوع بھی شروع ہو جاتا ہے۔ اس صورتحال میں انہیں نماز عشاء کی ادائیگی کے لیے وقت نہیں ملتا۔ علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ ہر سال وہاں چالیس دن ایسے آتے ہیں کہ عشاء کا وقت نہیں ملتا۔
بلغاریہ کے مسلمانوں نے حضرت شمس الائمہ حلوانی رحمۃ اللہ علیہ سے فتویٰ طلب کیا کہ ان حالات میں نماز عشاء کا کیا کیا جائے تو انہوں نے نماز عشاء کی قضاء کا حکم تحریر فرمایا۔
یہی استفتاء جب شیخ کبیر بقالی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے عشاء کی نماز فرض نہ

ہونے کا فتویٰ دیا اور وجہ یہ بیان فرمائی کہ نماز کا سبب وقت ہے تو جب عشاء کا وقت ہی نہیں ہوتا تو پھر نماز بھی فرض نہیں ہوتی۔

شمس الائمہ حلوانی رحمۃ اللہ علیہ نے جب اس فتوے کو دیکھا تو ایک آدمی کو بلا کر فرمایا کہ خوارزم جاؤ اور جب حضرت بقالی رحمۃ اللہ علیہ عام لوگوں کے مجمع میں سوالات کے جوابات ارشاد فرما رہے ہوں تو تم کھڑے ہو کر صرف یہ پوچھنا کہ اگر کوئی شخص پانچ نمازوں میں سے کسی ایک نماز کا انکار کردے تو اس کی تکفیر کی جائے گی یا نہیں؟

اس آدمی نے اس ہدایت پر عمل کیا اور جامع مسجد خوارزم میں پہنچ کر جب یہ سوال کیا تو حضرت بقالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حافظے اور ذہانت کی بنا پر یہ بھانپ لیا کہ بلغار یہ والوں کو جو فتویٰ میں نے دیا تھا، یہ سوال اسی کے متعلق ہے۔ اس شخص کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ میں آپ سے یہ دریافت کرتا ہوں کہ فرض کرو کسی شخص کے دونوں ہاتھ کہنیوں سے یا دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت کٹ گئے تو اس کے لیے وضو کے کتنے فرائض باقی رہ جائیں گے۔ اس شخص نے جواب دیا کہ تین فرض باقی رہ جائیں گے کیونکہ چوتھا فرض جس جگہ کو دھونے کا تھا، جب وہ جگہ ہی نہ رہی تو یہ فرض ساقط ہو جائے گا۔

علامہ بقالی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا بس اسی طرح پانچویں نماز بھی ساقط ہو جائے گی کیونکہ نماز تو وقت کی وجہ سے فرض ہے تو جب وجہ (سبب) ہی نہ رہی تو اب نماز کی ادائیگی کس وقت ہوگی۔

وہ شخص یہ جواب لے کر حضرت شمس الائمہ حلوانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا عرض کیا۔ حضرت حلوانی، حضرت بقالی (رحمۃ اللہ علیہ) کی ذہانت اور حاضر جوابی سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے فتوے سے رجوع کر لیا۔ علامہ ابن ہمام اور حضرت ابن عابدین الشامی رحمۃ اللہ علیہم

نے اس حکایت کو نقل کیا ہے۔

بیوی کی موجودگی میں سالی سے نکاح کا حکم.

(فرمایا) اگر کسی شخص کی بیوی اس کے نکاح میں ہے تو اب وہ اس بیوی کی بہن (سالی) سے نکاح نہیں کرسکتا۔ اگر وہ اس صورت میں سالی سے نکاح کرے تو یہ نکاح فاسد قرار پائے گا۔ اب اگر اس کی اولاد اپنی سالی سے ہوگئی اور پھر اس نے طلاق دی یا تفریق ہوگئی یا مرگیا تو اس کی سالی کو عدت بھی گذارنا پڑے گی اور اس شخص کی سالی سے ہونے والی اولاد کا نسب بھی اسی شخص سے ثابت ہوگا۔ نکاح فاسد کی وجہ سے جو اولاد پیدا ہوتی ہے وہ ولد الحرام تو ہوتی ہے، ولد الزنا نہیں ہوتی۔ ایسے بچوں کو یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ نکاح فاسد کی پیدائش ہیں لیکن حرام کی اولاد نہیں کہا جاسکتا۔ حرام کی اولاد تو ولد الزنا ہوتی ہے۔

صاحبِ ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ کا فقہ مالکی پر اعتراض........!

(فرمایا) ہمارے حنفی فقہاء رحمۃ اللہ علیہم میں سے صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ انہوں نے فقہاء مالکیہ کے متعلق یہ جو لکھا ہے کہ وہ کسی شخص کے اپنی بیوی سے غیر فطری فعل کرنے کو جائز قرار دیتے تھے، تو یہ غلط ہے۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول یہ نہیں تھا۔ اعتراض کرنے والوں نے مالکی فقہاء رحمۃ اللہ علیہم کی اصل کتابوں سے رجوع نہیں کیا اور خواہ مخواہ صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ پر برسے ہیں۔ اور وہ جنہوں نے آئمہ مالکیہ رحمۃ اللہ علیہم کی

اصل کتابوں کی طرف رجوع نہیں کیا، وہ بھی معذور ہیں کہ اس دور میں فقہ مالکی کی کتابیں ملتی ہی کہاں تھیں۔ خود ہمارے اس دور میں مالکی فقہ کی تمام اُمہات کتب برصغیر میں کہاں ملتی ہیں؟ مراکش، الجزائر، تیونس، المغرب اور افریقہ میں مالکی مسلک متداول ہے۔ اب کوئی صاحب علم وہاں کا سفر کرے اور موالک کی کتابیں وہاں سے خرید کرلائے۔ مگر کیا کیجئے کہ ان ممالک کا ویزا بھی دشوار ہے، الغرض پیچیدگی در پیچیدگی ہے۔

اپنی بیوی سے غیر فطری فعل کی اجازت، مالکی فقہاء رحمۃ اللہ علیہم نے اپنے امام حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول لکھا ہے کہ وہ اس فعل کو جائز فرماتے تھے۔ جن مالکی فقہاء نے اس طرح اپنی جنسی آسودگی سے منع کیا ہے تو یہ متاخرین مالکی فقہاء کا قول ہے وگرنہ ان کے متقدمین اس کی اجازت دیتے تھے۔ علامہ عینی، حافظ ابن حجر عسقلانی اور شوکانی رحمۃ اللہ علیہم کو پڑھنا چاہیے۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نہایت پختہ صوفی اور مالکی فقیہہ ہیں۔ وہ فتوحات میں صاف تحریر فرماتے ہیں کہ یہ فعل مباح ہے۔ اور جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اپنی بیوی سے ایسے تعلق قائم نہ کرے تو اسے چاہیے کہ جو فعل مباح ہے، اس سے روکنے کی کوئی دلیل لائے۔ شریعت نہ تو یہ کہتی ہے کہ یہ کام کرو اور نہ ہی یہ کہتی ہے کہ نہ کرو اس لیے یہ جائز اور مباح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ نے موالک کا جو مسلک بیان کیا ہے، اس کی اصل خود مالکیوں کے ہاں موجود ہے۔ البتہ یہ بات الگ ہے کہ حنفی فقہاء رحمۃ اللہ علیہم اس فعل کو حرام اور کبیرہ گناہ کہتے ہیں۔

تصوّف
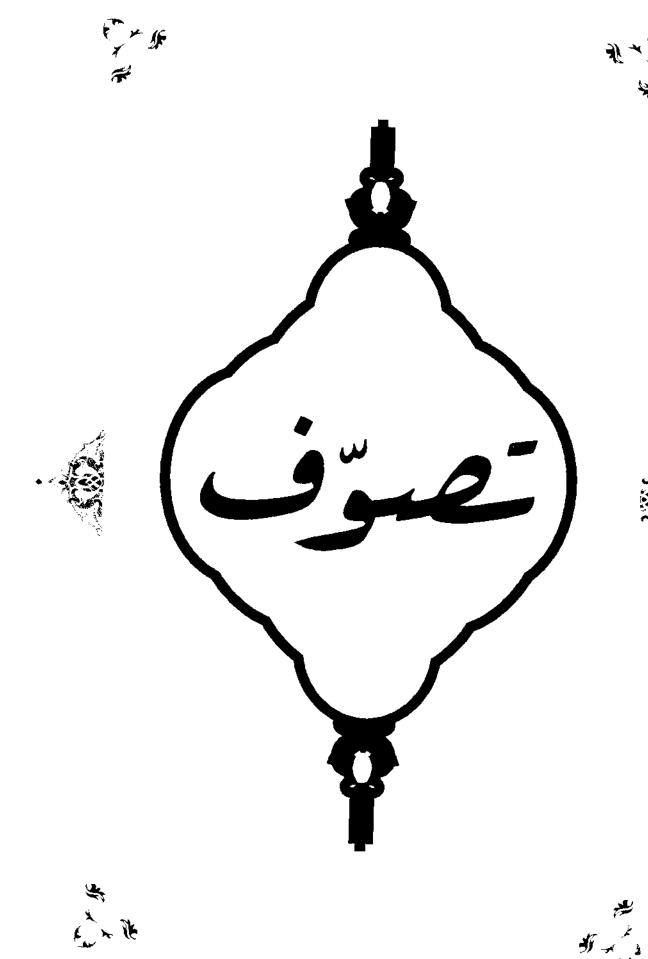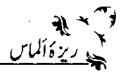
وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔

(پ:۱۱،سورۃ التوبہ،آیت:۱۰۰)

اور جو لوگ (بعد میں اُمت میں آئے اور) راست بازی کے ساتھ ان (مہاجرین و انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کے نقش قدم پر چلے، اللہ تعالیٰ ان سب (مہاجرین، انصار اور ان کے بعد آنے والوں سے، جنہوں نے ان کی پیروی کی، ان) سے خوش ہوا اور وہ (سب) اس سے راضی ہوئے۔
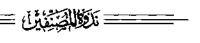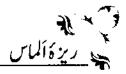
اجازت نامے سلسلہ ہائے تصوف

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۴ ربیع الاوّل ۱۴۱۵ھ بمطابق 31 اگست 1994ء آکسفورڈ یونی ورسٹی انگلینڈ کے مہمان خانے میں بعداز نماز فجر، محترم مفتی محمد سعید خان صاحب کو طلب فرمایا اور جو خلافت نامہ عنایت فرمایا، اس کا عکس پیش خدمت ہے۔ بعض الفاظ کے پڑھنے میں شاید کسی کو دقت ہو اس لیے ٹائپ کرکے بھی پیش کیا جارہا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Phones : 73864, 72336, 72338

Abul Hasan Ali Nadwi
P. O. BOX, No. 93, NADWATUL ULAMA,
LUCKNOW—226 007, U. P. (INDIA)

ابوالحسن علی الحسنی الندوی
ندوۃ العلماء - لکھنؤ - الهند

Ref : التاریخ :

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

[illegible]

ابوالحسن علی ندوی
۲۴ ربیع الاول
۳۱ اگست ۱۹۹۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ
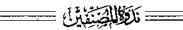
امابعد، راقم السطور (ابوالحسن علی ندوی) کواس امر کے اعتبار سے مسرت ہے کہ لندن میں مولوی محمد سعید خان صاحب سے ملاقات ہوئی اور چند روز ساتھ رہنا ہوا۔ وہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلۂ عالیہ محمدیہ نقشبندیہ میں داخل ہوئے۔ اور اس عاجز نے ان کو اس میں اجازت بھی دی۔ وہ دوسرے طالبین کو بھی اس سلسلۂ عالیہ میں داخل کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو اور اس سلسلہ میں داخل ہونے والوں کو اس سلسلۂ عالیہ مقبولہ کے حقوق ادا کرنے اور شکر کی توفیق عطا فرمائے۔ اور اس کی برکات میں حصہ عطا فرمائے۔ و ما ذلك علی اللّٰه بعزیز.

حضرت سید صاحب حکومت الٰہیہ کے قیام اور عمل بالشریعہ اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جو جدوجہد فرماتے تھے۔ اور اسی سلسلہ میں جان عزیز دے دی۔ اللہ تعالیٰ اس سلسلہ میں داخل ہونے والوں اور داخل کرنے والوں کو اس کے اجراء اور اس کے لیے سعی وجدوجہد کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

راقم تائب وعاجز،

ابوالحسن علی ندوی

۲۴/ربیع الاول ۱۴۱۵ھ

○ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بارِ دگر جو گرامی نامہ جمادی الثانی ۱۴۱۷ھ بمطابق اکتوبر 1996ء محترم مفتی محمد سعید خان صاحب کو ارسال فرمایا اس کا عکس بھی ملاحظہ ہو۔ قارئین کی سہولت کے لیے اسے بھی ٹائپ کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔

BOX, No. 93, NADWATUL ULAMA
LUCKNOW 226007 U.P. (INDIA)

محبّ عزیز و مکرم داعی الی اللہ محمد سعید خان صاحب وفقه الله لما یحبّ ویرضٰی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

کل شام کو آپ سے ٹیلی فون پر گفتگو ہوئی اس کے کچھ بعد آپ کا فیکس بھی مل گیا ہمیں وہ بات جو لندن میں ہوئی تھی، یاد نہیں رہی تھی① اور مسئلہ بھی ذرا احتیاط کا ہے اور اس کے لیے کچھ صحبت اور زیادہ واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کی گفتگو کے بعد اور دعوتی و اصلاحی مصالح کی بنا پر جن کی خاص طور پر بیرونی مغربی ممالک میں سخت ضرورت ہے اور بڑا خلاء بھی پایا جاتا ہے۔ ہم تو کلاً علی اللہ تعالیٰ آپ کو سلاسلِ اربعہ میں اجازت دیتے ہیں. سلسلہ قادریہ میں ہم کو شیخ التفسیر اور داعی الی اللہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری ؒ سے اور سلاسلِ اربعہ میں شیخِ وقت حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری ؒ سے اجازت حاصل ہے۔ آپ سے یہ درخواست ہے کہ آپ حضرات دیوبند کے مسلکِ توحید و اتباعِ سنت پر قائم رہیں اور سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات و ہدایات

① اس سے مراد وہ اجازت نامہ ہے، جو آکسفورڈ یونیورسٹی لندن میں حضرت رحمہ اللہ نے عنایت فرمایا تھا۔ عمر عبارک زیادہ ہونے کی وجہ سے بعض مرتبہ بعض اُمور میں نسیان بھی لاحق ہو جاتا تھا اسی کی طرف اشارہ تحریر فرمایا ہے۔ جن حضرات نے حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدنی نور اللہ مرقدہ اور حضرت مولانا خان محمد صاحب رحمہ اللہ کی حیات طیبہ کے آخری سال دیکھے ہیں وہ سب گواہی دیں گے کہ ان حضرات رحمہم اللہ کے ہاں بھی دورِ آخر میں غلبۂ نسیان ہو گیا تھا۔ یہ تمام عوارض لوازماتِ بشریہ ہیں کچھ عیب چھپی نہیں کہ اس سے اکابر کا فیض منقطع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان اصحاب مکرمین و اولیاء کرام رحمہم اللہ کے ادب کی توفیق بخشے۔

پر عمل کریں۔ان کے ملفوظات وارشادات کے مجموعہ "صراطِ مستقیم" اور حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تالیف "تقویۃ الایمان" کو دستور العمل جانیں راقم کی کتاب ''دستور حیات'' اور ہو سکے تو مولانا تھانوی کے مواعظ وملفوظات سے بھی استفادہ کریں اللہ تعالیٰ آپ سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے۔

والسلام

دعا گو: ابوالحسن علی الحسنی الندوی

حضرت مولانا خان محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے دور میں تصوف کے امام اور سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے بدرجہ اتم وارث وامین تھے، ان سے محترم مفتی محمد سعید خان صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبات شریف اور سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ کے دیگر مشائخ کرام رحمہم اللہ کی مختلف کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں۔2005ء میں جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے جلسہ ختم نبوت لندن کے لیے سفر فرمایا، تو جناب مفتی صاحب بھی ان کی خدمت میں دوران سفر اور انگلینڈ حاضر رہے۔تعلیم وتعلم کا یہ سلسلہ اس سفر میں بھی جاری رہا اور پایہ تکمیل تک پہنچا۔اس موقع پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دست مبارک سے جو سند جناب مفتی صاحب کے لیے تحریر فرمائی اس کا عکس، تسکین قارئین کے لیے حاضر ہے۔اسے ٹائپ کر کے بھی پیش کیا جارہا ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۔ بعد الحمد والصلوٰۃ وارسال التسلیمات والتحیات
فقیر خان محمد عفی عنہ نے ۱۹۳۹ء میں ڈابھیل میں دارالعلوم ڈابھیل صوبہ بمبئی
ضلع احمد آباد میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے مشکوٰۃ شریف
پھر اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں دورۂ حدیث پاک دارالعلوم دیوبند میں پڑھا
اب اس سند متصل حدیث پاک کی اجازت محترم مولوی محمد سعید صاحب زید مجدہ کو
دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ باعث برکت فرماوے۔ اور علوم دینیہ کی تعلیم و اشاعت
کی توفیق کرامت فرماوے۔ آمین۔
فقیر نے سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کی کتابیں اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا
محمد عبداللہ صاحب قدس سرہ العزیز سے پڑھی ہیں۔ ان کتابوں کی روایت
کی بھی میں انہی کو اجازت دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرماوے۔ آمین

والسلام
فقیر خان محمد عفی عنہ
۲۹ جولائی ۲۰۰۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم. بعد الحمد والصلوٰۃ وارسال التسلیمات والتحیات فقیر خان محمد عفی عنہ نے ۱۹۳۹ء میں ڈابھیل میں دارالعلوم ڈابھیل صوبہ بمبئی ضلع احمد آباد میں حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے مشکوٰۃ شریف پڑھی، پھر اس کے بعد ۱۹۴۰ء میں دورۂ حدیث پاک دارالعلوم دیوبند میں پڑھا اب اس سند متصل حدیث پاک کی اجازت محترم مولوی محمد سعید صاحب زید مجدہ کو دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ باعث برکت فرماوے۔اور علوم دینیہ کی تعلیم واشاعت کی توفیق کرامت فرماوے۔آمین

فقیر نے سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کی کتابیں اپنے پیر ومرشد حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحب قدس سرہ العزیز سے پڑھیں۔ اُن کتابوں کی روایت کی بھی میں انہی کو اجازت دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مبارک فرماوے۔آمین

والسلام

فقیر خان محمد عفی عنہ

۲۹ جولائی ۲۰۰۵ء

کیا خواجہ آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے تھے؟

فرمایا: مشائخ مجددیہ طاب اللہ ثراھم کے احوال و مقامات پر خواجہ کمال الدین محمد احسان نے ایک کتاب "روضۃ القیومیۃ" تحریر فرمائی ہے۔ اصل فارسی نسخے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے مزاج میں شدید مبالغہ تھا۔ اپنی اسی طبیعت کی بنا پر انہوں نے حضرت خواجہ آدم بنوری نور اللہ مرقدہٗ پر یہ الزام لگایا کہ وہ اپنے شیخ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی قدس اللہ سرہ الاقدس کی تعلیمات سے منحرف ہو گئے تھے۔ حالانکہ امر واقع ایسا نہیں ہے۔ ان کی اس کتاب ہی کی وجہ سے سرہندی ـــــ جن کی قیادت حضرت خواجہ معصوم صاحب رحمہ اللہ کر رہے تھے ـــــ اور بنوری ـــــ جن کی قیادت حضرت خواجہ آدم بنوری نور اللہ مرقدہٗ کر رہے تھے ـــــ دو فریق بنے اور آپس میں اختلافات پیدا ہوئے۔

"مکاشفات عینیہ" کی نسبت خواجہ محمد ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف درست نہیں.

فرمایا: "مکاشفات عینیہ" کے نام سے جو رسالہ چھپا ہے، یہ دراصل حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمہ اللہ ہی کی تصنیف ہے۔ البتہ اسکے مرتب حضرت خواجہ معصوم صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ خواجہ محمد ہاشم کشمی سے اس کی نسبت

غلط ہے۔انہوں نے یہ رسالہ نہ لکھا ہے اور نہ ہی اسے مرتب فرمایا ہے۔اب جو چھپا ہے تو اسے خواجہ محمد ہاشم کشمی سے منسوب کیا گیا ہے۔ یہ غلط ہے اور نقشبندی حضرات کو چاہیے کہ اس غلطی کی تصحیح کریں۔

مولانا محمد ہاشم کشمی رحمۃ اللہ علیہ کی دو کتابیں دیکھنے اور پڑھنے کی حسرت!

فرمایا مولانا محمد ہاشم کشمی رحمہ اللہ کی دو کتابیں دیکھنے اور پڑھنے کی حسرت ہے۔ ① زبدۃ المقامات ② نسمات القدس۔ بتیس (32) برس سے تلاش جاری ہے۔ کتابیں تو کیا ملیں گی، ان کا نام تک محو ہوتا جارہا ہے۔ ①

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب احیاء علوم الدین —— جھوٹی احادیث اور من گھڑت روایات۔

فرمایا حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احیاء علوم الدین'' کی بہت تعریف کی جاتی ہے اور صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم تو اپنی اپنی خانقاہوں میں اسے پڑھتے پڑھاتے رہے۔ بہت ہمت کر کے ایک مرتبہ اسے پڑھا۔ ہمت اس لیے کرنی پڑی کہ احادیث کے معاملے

① للّٰہ الحمد والمنۃ کہ یہ دونوں کتابیں نظر سے گذر گئیں۔ ''زبدۃ المقامات'' کے قلمی نسخے کا عکس تو ترکی میں چھپ گیا اور محترم جناب پروفیسر اقبال مجددی صاحب دام ظلہ نے ہدیتاً مرحمت فرمایا اور ''نسمات القدس'' کا نسخہ ادارہ تحقیقات فارسی اسلام آباد میں موجود ہے۔ وہاں سے اسکی CD اور پھر فوٹو کاپی کروا کر اپنے ہاں کے ذخیرہ کتب میں داخل کر دی گئی۔

میں یہ کتاب جھوٹ سے بھری پڑی ہے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ اور دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے منسوب روایات، ایسی ایسی تحریر کی گئی ہیں کہ پڑھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ واہیات اور جھوٹ ہے۔ حضرت رسالت پناہ ﷺ سے منسوب جھوٹی روایات اور من گھڑت احادیث پڑھنے سے سخت وحشت ہوتی ہے، اس لیے دل پر جبر کر کے یہ کتاب پڑھی۔

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے سیر اعلام النبلاء میں، محمد بن ولید طرطوشی نے اس خط میں جو انہوں نے ابن مظفر کے نام لکھا ہے، اور حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے فتاویٰ میں، احیاء العلوم کی ایسی روایات پر کڑی تنقید کی ہے۔

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے تو احیاء علوم الدین کی ایسی جھوٹی احادیث اور موضوع روایات پر مستقل ایک کتاب ''الاحیاء'' کے نام سے تحریر کی تھی جو کہ غالباً اب تک چھپی نہیں۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور ''نردیار'' نام کا رکھا جانا.

(فرمایا) حضرت الامام محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب فتوحات مکیہ میں متعدد ایسے خواب تحریر فرمائے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم رویاء اور مراقبات میں بار بار رویت باری تعالیٰ کے شرف سے مشرف ہوئے ہیں، چنانچہ ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ذات اقدس جل سلطانہ کی زیارت کی اور اللہ تعالیٰ نے میرا وہ نام تجویز فرمایا جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں سنا تھا۔ مجھ سے ارشاد فرمایا کہ ہم نے تمھارا نام ''نردیار'' رکھا ہے۔ میں نے درخواست کی کہ میرے اس نام کا مطلب کیا ہے

توارشادفرمایا ”ممسوک الدار“ (اپنے گھر میں رہنے والا)۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں پڑھانے اور سمجھانے والے علماء اب برصغیر میں نہیں رہے.

فرمایا حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی فتوحات مکیہ، فصوص الحکم اور دیگر کتب پڑھانے اور سمجھانے والے علماء اب برصغیر میں نہیں رہے۔ ایسے بھی ملے جن کی شہرت تو تھی کہ ان علوم کو جانتے ہیں لیکن حاضری پر معلوم ہوا کہ انھیں تو ڈھنگ سے کتاب کھولنا بھی نہیں آتی۔ علماء کو حسد، غیبت اور نفاق سے فرصت ملے تو مطالعہ کریں اور مطالعہ بھی جب کریں جب علمی بنیاد مظبوط ہو۔ جس ملک اور دور کے مفتی حضرات اردو فتاویٰ دیکھ کر فتویٰ صادر فرمائیں ان کی جہالت کی بھی کوئی حد ہے۔ علم سے تو کیا مناسبت ہو اب پیری مریدی کی سوجھی ہے اور حال یہ ہے کہ کہیں باقاعدہ سلوک کے اسباق طے نہیں کیے اور نہ معلوم کہ مراقبہ ذات مقدسہ تک کی منازل کیا ہیں اور شیخ المشائخ سے کم درجے پر متمکن ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ کہ طالب کی استعداد برباد کرتے ہیں۔ مشائخ حقہ اتنی آسانی سے بیعت نہیں فرماتے تھے جتنی آسانی سے آج کل کے یہ مشائخ خلافت دے دیتے ہیں۔

ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی معراج اور مختلف انبیاء کرام علیہم السلام سے ملاقاتیں
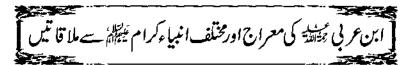
فرمایا حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر کے مطابق حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو
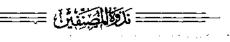
چونتیس بار معراج ہوئی۔ ایک مرتبہ کی معراج جسمانی تھی جبکہ باقی تمام روحانی تھیں اور بار بار آپ کو عالم برزخ اور آخرت کا ملاحظہ کرایا گیا۔ پھر انہوں نے اپنی معراج کا بھی ذکر کیا ہے کہ وہ کیا تھی اور مختلف آسمانوں پر انھیں کن حضرات انبیاء علیہم السلام کی زیارت اور عرض و معروض کا شرف حاصل ہوا۔ جب وہ اس زمین کی حدود سے نکلے تو عناصر اربعہ میں سے ''آب'' عنصر نے ان کا ساتھ چھوڑا پھر ''خاک'' عنصر سے خلاصی ہوئی اور پہلے آسمان تک رسائی ہوئی۔ سیدنا آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان سے دریافت فرمایا کہ بیٹے مٹی کا عنصر کہاں رہ گیا؟ عرض کیا کہ زمین نے اپنا حصہ واپس لے لیا تو ارشاد فرمایا کہ میرے ساتھ بھی ایسے ہی ہوا تھا۔ پھر دوسرے آسمان پر جانا ہوا تو وہاں پر حضرت سیدنا مسیح اور سیدنا یحییٰ علیہما السلام کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ سیدنا مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے بعض سوالات کے جوابات مرحمت فرمائے اور پھر انھوں نے حضرت یحییٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عرض کیا کہ روز حشر جب موت کو دنبے کی صورت میں حاضر کیا جائے گا اور جنت اور جہنم کے درمیان رکھ کر ذبح کیا جائے گا تاکہ اہل جنت اور اہل جہنم سب دیکھ لیں کہ اب کسی کو موت نہیں آئے گی تو اس موت کو آپ ذبح فرمائیں گے؟ حضرت سیدنا یحییٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ارشاد فرمایا کہ یہ درست ہے کیونکہ دیکھیے میں زندگی ہوں اور میں اپنی ضد یعنی موت کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی، اس لیے حکمت الٰہیہ اس بات کی متقاضی ہوئی کہ کامل زندگی کامل موت کو فنا کردے اسی لیے تو مجھ سے پہلے کبھی بھی کسی کا نام یحییٰ نہیں رکھا گیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ علم کا یہ نقطہ اس سے پہلے مجھے معلوم نہیں تھا۔ پھر ان دونوں حضرات انبیاء علیہم السلام سے تفصیلی سوالات و جوابات ہوئے۔ انھیں بتایا گیا کہ جنت

میں جب کوئی شخص اپنی بیوی سے لطف اندوز ہونے کے بعد فارغ ہوگا تو انزال کی صورت کیا ہوگی۔ انھوں نے حضرت یحییٰ علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا اس دوسرے آسمان پر آپ کا ٹھکانا ہے تو انھوں نے فرمایا کہ میں حضرت عیسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام کے درمیان ہوں کبھی یہاں ہوتا ہوں اور کبھی وہاں۔ یہاں اس لیے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام میرے خالہ زاد بھائی ہیں اس رشتے کا احترام بھی ضروری ہے اور وہاں اس لیے کہ میں حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوں اور ایسے ہی میں حضرت یوسف اور حضرت ادریس علیہما السلام کے ہاں بھی حاضر ہوتا رہتا ہوں۔

پھر تیسرے آسمان پر حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام کی خدمت میں حاضری ہوئی تو آپ نے عرض کیا کہ حضرت آپ میں اور اس خاتون، عزیز مصر کی اہلیہ میں ایک بات ''ھَمَّ'' مشترک تھی؟ ارشاد فرمایا آپ درست کہتے ہیں انھوں نے ''ھَمَّ'' (پختہ اور مضبوط ارادہ) یہ کیا تھا کہ مجھے رام کر کے جو وہ چاہتی ہیں وہ ہو جائے اور میں نے ''ھَمَّ'' (پختہ اور مضبوط ارادہ) یہ کیا تھا کہ ان کا یہ ارادہ فنا ہو جائے۔

اس کے بعد چوتھے آسمان پر حضرت سیدنا ادریس علیہ السلام کے ہاں حاضری ہوئی، انھوں نے یہ کہہ کر استقبال کیا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم و معارف کے وارث کا آنا بہت مبارک ہے اور پھر سوالات اور جوابات کی ایک طویل نشست ہوئی۔ خطا اور صواب کی بحث ہوئی حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا صواب اصل ہے اور خطاء امر اضافی ہے۔ انھوں نے دریافت فرمایا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کس صفت سے کائنات وجود پذیر ہوئی؟ ارشاد فرمایا کہ صفت ''جُودْ'' سے۔
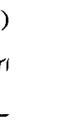
اس موقع پر ذہن بلاقصد حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ انھوں نے نیابت الٰہی میں کچھ اسی طرح کی بات ارشاد فرمائی کہ

؎ من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

ترجمہ: (ہم نے مخلوق کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ ان کی تخلیق میں ہمارا کوئی نفع تھا بلکہ ہم نے تو اس لیے پیدا کی تا کہ اپنے بندوں پر اپنی صفت ''جود'' کا اظہار کریں۔)

اسی لیے تو ہم کئی مرتبہ یہ عرض کرتے ہیں کہ اگر آپ فتوحات مکیہ، فصوص الحکم اور حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی دیگر کتب کا مطالعہ کریں اور خاص طور سے فتوحات کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اگر مثنوی مولانا روم کو بھی پیش نظر رکھیں تو یہ بات بالکل واضح ہوتی چلی جائے گی کہ جن افکار اور خاص طور پر وحدۃ الوجود کے موضوع پر جو کچھ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے نثر میں فرمایا ہے، حضرت صاحب مثنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس منثور کو، منظوم کر دیا ہے۔ ''جُوْدْ'' کیا ہے؟ ''جُوْدْ'' کے معنی لغت میں سخاوت اور فیاضی کے آتے ہیں۔ ایک شاعر کا شعر ہے

؎ جود ہے، بخشش ہے دل نوازی ہے
ہر ایک طرح غلاموں کی سرفرازی ہے

تو جب حضرت ادریس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ خلقِ خلائق صفت جود سے ہے تو انہوں نے عرض کیا کہ یہ بات میں نے اپنے بعض مشائخ سے سنی ہے تو انہوں نے تصویب فرمائی

کہ آپ نے جو کچھ سنا وہ درست ہے۔اب یہ یہاں سے رخصت ہوئے اور پانچویں آسمان پر حاضری ہوئی۔وہاں حضرت ہارون علیہ السلام کی خدمت میں ٹھہرنا ہوا۔دیکھا تو وہاں ان سے پہلے حضرت یحییٰ علیہ السلام موجود ہیں۔انھوں نے عرض کیا کہ اے حضرت یحییٰ علیہ السلام راستے میں آپ سے تقابل نہیں ہوا تو انھوں نے کیا خوبصورت جواب دیا کہ ابن عربی ہر شخص کا اپنا ایک راستہ متعین ہے اور اس راستے پر صرف وہی چلتا ہے۔پھر حضرت ہارون علیہ السلام سے جو گفتگو ہوئی اس کے ڈانڈے وحدۃ الوجود سے جا ملتے ہیں۔اس کے بعد اب چھٹے آسمان پر اس ہستی کا دیدار ہوا جو کلام الٰہی کے شرف سے مشرف اور بارگاہ ناز میں اس قدر عزیز الوجود ٹھہرے کہ تمنائے رویت سے سرفراز کیے گئے۔حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی تمنائے رویت کی حقیقت دریافت کی کہ آپ نے یہ درخواست کیسے پیش کی حالانکہ ہمارے نبی حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت قبل از موت ممکن نہیں؟ تو ارشاد فرمایا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ ہی تو ارشاد فرمایا ہے۔جب میں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے یہ درخواست کی تو انھوں نے اسے قبول فرمایا۔آپ غور نہیں کرتے کہ قرآن میرے بارے میں یہ کہتا ہے کہ میں گر پڑا تو درحقیقت میری موت ہی تو تھی۔بس پھر اس موت کے بعد میں نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی زیارت کر لی پھر میں نے جو چاہا تھا اس کا مجھے علم دے دیا گیا تو میں نے جو یہ کہا کہ اللہ میں توبہ کرتا ہوں تو پھر یہ اسی ذات کی طرف تو رجوع تھا جسے میں نے دیکھا تھا۔اس سوال وجواب کے طویل سلسلے میں ایک مقام پر حضرت سیدنا موسیٰ بن عمران علیہ السلام نے انھیں یہ بھی بتایا
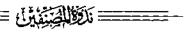
کہ ذوق بقدر مرتبہ ہوا کرتا ہے۔

پھر ساتویں آسمان پر حضرت خلیل اللہ سیدنا ابرہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حضور میں پہنچائے گئے۔ انھوں نے فرمایا کہ دیکھیے نمرود نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میرے خدا زندگی اور موت دیتے ہیں بلکہ الزام اپنے سر لے لیا کیونکہ اگر وہ اپنے خداؤں کے متعلق یہ کہتا تو لوگ اس جھوٹ کی وجہ سے ان بتوں سے متنفر ہو جاتے۔ پھر حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے بعض ایسے جملے تحریر فرمائے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ بین السطور وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ نمرود مدعی الوہیت نہ تھا۔

اس کے بعد حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کو بیت المعمور کی زیارت کرائی گئی جہاں اللہ تعالیٰ کی تجلیات، نور وظلمت کے ستر ہزار حجابات کو عبور کر کے اپنے مستقر پر پڑتی ہیں۔ پھر سدرۃ المنتہیٰ پر لے جائے گئے۔ نشاءۃ انسانی کا مشاہدہ ہوا۔ چار دریا علم کے دکھائے گئے جو کہ علم وہبی کے دریا تھے۔ وہاں انھیں ایک خلعت بھی پہنائی گئی جو کہ اپنی مثال آپ تھی۔ اور یہ سراپا نور ہو گئے اور اس موقع پر انھیں یہ آیت بھی عطا کی گئی۔

قُوْلُوْآ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِىَ النَّبِيُّوْنَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ۔

(کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور جو کتاب ہم پر نازل ہوئی اور جو صحیفے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اترے، اور جو

کتابیں موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کو پروردگار کی طرف سے ملیں
(ہم) سب پر ایمان لائے۔ ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں
کرتے اور ہم اس (خدائے واحد) کے فرمانبردار ہیں۔)

یہ بشارت بھی دی گئی کہ آپ ''محمدی المقام'' ہیں علی صاحبها أكمل التحيات و أجمل الثناء۔ پھر جب انھیں وہاں پر رسالت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومیت اور وسعت مشاہدہ کرائی گئی تو یہ تاب نہ لا سکے اور تنگئ داماں کی شکایت کرتے ہوئے عرض کیا کہ ''حَسْبِي حَسْبِي'' بس کیجیے بس کیجیے۔ یہ جو کچھ بھی دیکھ رہا ہوں مجھے کافی ہے۔ مجھ میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ میں بالکل بھر گیا ہوں۔ اور پھر ان تمام مکشوفات کے بعد فرماتے ہیں کہ تب جا کر مجھ پر عبدیت کی حقیقت واضح ہوئی اور میں نے جانا کہ میں تو محض ایک بندہ ہوں۔ مجھ میں ربوبیت کا تو شمہ تک نہیں۔

اس ایک معراج کے علاوہ بھی انھیں معراج ہوئی اور کئی مرتبہ عروج حاصل ہوا لیکن اب تو مدت ہوئی ان واقعات کو پڑھے ہوئے لیکن یہ واقعات دلچسپ بھی ہیں اور عبدیت کی حقیقت اور اس کے عروج، نشیب و فراز، علم و جہل اور مراتب علیا و سفلی کا جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ ہماری صفت نیاز مندی اور عبدیت کو جلاء بخشتا ہے۔ عروج و معراج کو پڑھ کر بار بار حضرت علامہ اقبال مرحوم و مغفور کا یہ شعر دل کے تار چھیڑتا ہے

؎ سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

''ماوردی'' اور ''ہاشمی'' نسبتوں کی اصل.....؟

فرمایا جن علماء کرام رحمہم اللہ کیساتھ ''ماوردی'' کی نسبت آتی ہے، ان کے متعلق ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ ''ماء الورد'' کا کاروبار کرتے تھے اس لیے ماوردی کہلائے۔ ماء کا مطلب تو ہوا ''عرق'' ''پانی'' او ''ورد'' کا مطلب ہے ''گلاب'' یعنی یہ حضرات ''عرق گلاب'' کا کاروبار کرتے تھے۔

یہ ضروری نہیں ہے کہ جس کے ساتھ ''ہاشمی'' نسبت ہو، وہ حضرت ہاشم بن عبد مناف کی اولاد میں سے ہی ہوگا بلکہ عباسی خلیفہ سفاح نے کوفہ کے قریب ایک شہر آباد کیا تھا اور اس کا نام ''ہاشمیہ'' رکھا تھا، جن لوگوں کی نسبت اس شہر سے ہوئی وہ بھی ہاشمی کہلاتے تھے۔

عام طور پر بدگمانی کا سبب.
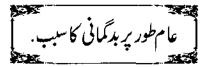
فرمایا عام طور پر بدگمانی کا سبب حقائق سے بے خبری ہوتی ہے۔

مخلص آدمی کی ناؤ ڈوبتے ڈوبتے بھی ساحل پہ جالگتی ہے.

فرمایا اخلاص بڑی دولت ہے۔ تحریر اور تقریر دونوں، مکمل مطالعے کے بعد الفاظ کے چناؤ کے ساتھ اور محض اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کی جائے اور مخلوق کے متاثر ہونے اور اپنے موثر ہونے کی نفی کی جائے تو اخلاص آتا ہے اور اس جذبے سے جو کچھ بھی تحریر کیا جاتا ہے یا تقریر کی جاتی ہے اس کا اثر بہت دیرپا ہوتا ہے۔ نظر ہمیشہ اپنے اخلاص پر رہے تو پھر لکھا،
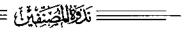
کہا، سنا، سب کچھ موثر ہو جاتا ہے۔ ہزاروں کی زندگیاں تبدیل ہوتی ہیں اور اثر بقدر اخلاص کی برکات سامنے آتی رہتی ہیں۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم تو اتنے عرصے سے تقریر کر رہے ہیں یا اتنی کتابیں لکھ دیں، قوم پر اثر ہی نہیں ہوا۔ یہ باتیں بالکل بے کار ہیں۔ اپنے اندر اخلاص پیدا کرنا چاہیے۔ مخلص آدمی کی ناؤ ڈوبتے ہوئے بھی ساحل پہ جالگتی ہے۔ غالب نے کیا اچھی بات کہی ہے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہوگئے

حضرت خواجہ صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے مستند حالات و واقعات کی مدت سے تلاش!

فرمایا حضرت خواجہ صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و واقعات کی تلاش ایک مدت سے ہے لیکن تاریخ میں گویا کہ ان کا تذکرہ ملتا ہی نہیں۔ چند مستند روایات تک نہیں ملتیں۔ انسان کیا تحریر کرے کہ وہ مبارک ہستی کیسی تھی؟ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو خود بہت بڑے صوفی، حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ کے قابل تکریم بزرگ تھے، انہوں نے سینکڑوں صوفیاء کرام رحمہم اللہ کے تذکرے تحریر فرمائے۔ ان کی کتابیں مشائخ کے تذکروں سے بھری پڑی ہیں اور یہ دلیل بھی ہے اس بات کی کہ انھیں اصحاب باطن سے کیسی عقیدت و محبت تھی لیکن انہوں نے بھی حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی مفصل تذکرہ نہیں لکھا۔ شاید ان کو بھی کوئی مستند مواد نہیں ملا، جو اپنی کتاب

''اخبار الاخیار مع مکتوبات'' میں اس قدر سرسری طور سے گذر گئے ہیں۔ صرف سات سطریں تحریر فرمائی ہیں۔ ان کے پاس بھی حضرت صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات تک رسائی کا کوئی مستند ذریعہ نہیں ہوگا۔ اور دوسری طرف صابری نسبت کی مقبولیت عنداللہ اور قبولیت عامہ کا اندازہ کرنا ہو تو پچھلی ڈیڑھ صدی کے مشائخ اور اولیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم اسی باب عالی کے دریوزہ گر ہیں۔ رحمھم اللہ تعالیٰ.

فلسفی اور صوفی میں فرق.

(فرمایا) فلسفی اور صوفی میں کیا فرق ہے؟ حضرت خواجہ ابو سعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کی بو علی سینا سے ملاقات ہوئی اور بو علی سینا کچھ دیر کے بعد تشریف لے گئے۔ کسی نے حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ نے بو علی سینا کو کیسا پایا تو ارشاد فرمایا

آنچہ من می بینم او می داند

ترجمہ: وہ جو کچھ جانتے ہیں، میں اس کا مشاہدہ کرتا ہوں۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا حالت مراقبہ میں مرزا تفتہ کی روح سے استفادہ.

(فرمایا) حضرت علامہ اقبال مرحوم خود ''مرد خود آ گاہ'' تھے، انہوں نے بہت سے عقدے ایسے چھوڑے، جواب حل نہیں ہوتے۔ یا تو ان کی زندگی ہی میں کوئی ان سے دریافت کر لیتا یا وہ خود تشریح فرمادیتے اور یا اب کوئی ''مرد خود آ گاہ'' ہو، تو شاید یہ عقدے حل

کرپائے۔ مراقبات اتنے قوی ہوں کہ عالم بالا تک رسائی ہو تو کچھ خبر ملے۔ لیکن مشکل یہ بھی تو ہے کہ جنہیں خبر ملتی ہے پھر ان کی خبر نہیں ملتی۔

؎ میان ما و بیت اللہ رمز یست
کہ جبریل امیں را ہم خبر نیست (علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ)

(ہمارے اور کعبۃ اللہ کے درمیان ایسے اشارے ہیں کہ حضرت جبریل امین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بھی ان باتوں کی خبر نہیں ہے۔)

یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ وہ فرماتے ہیں حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی روحِ مبارکہ مجسم صورت میں انھیں ملنے آئی، اور وہ ان کے علوم و معارف سے مستفید ہوئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ، ابن عربی، خود مولانا روم اور صوفیائے کرام رحمۃ اللہ علیہم اس طریق کے شدّ و مد سے قائل ہیں لیکن مسئلہ اس وقت اٹک جاتا ہے، جب حضرت علامہ اقبال مرحوم ایک غیر مسلم روح سے بھی ''نزول شعر'' کے قائل ہیں۔

خواجہ موتی لعل کے ہاں آٹھ بیٹے پیدا ہوئے اور یہ تمام بھائی ہندو مت پر یقین رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک بھائی کا نام منشی ہرگوپال تھا۔ انیسویں صدی کے سرے پر پیدا ہوئے اور ۱۸۷۹ء کو انتقال ہوا۔ صاحب دیوان شاعر تھے اور ''رامؔی'' تخلص تھا۔ جب مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کی شاگردی میں آئے تو انہوں نے تخلص بدل کر ''تفتہؔ'' کر دیا اور مرزا کا خطاب بھی دے ڈالا۔ اب یہ ''مرزا ہرگوپال تفتہؔ'' ہوئے اور مرزا غالب مرحوم کو اپنے اس شاگرد سے جو تعلق خاطر تھا، خطوط غالب اس کے گواہ ہیں۔ مرزا غالب نے ان کے ایک دیوان کا دیباچہ بھی تحریر فرمایا تھا اور یہ اتنے پُر گو شاعر تھے کہ اپنے بیٹے پیتمبر سنگھ

جواں مرگ کی موت پر جو مرثیہ لکھا دو سو بائیس (۲۲۲) اشعار پر مشتمل تھا۔ اپنی وفات کے بعد چار دیوان چھوڑے اور ان کا کریا کرم بھی ہندومت کے مطابق ہی ہوا۔ ہندومت کے یہ ایک منجھے ہوئے شاعر تھے اب مسئلہ یہاں پہنچ کر پیچیدہ ہوتا ہے جب حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم ۱۹۳۶ء میں (علامہ اقبال مرحوم کی وفات سے دو برس قبل) دہلی میں پہلی مرتبہ ''یوم غالب'' پر حضرت اقبال کو مدعو کرتے ہیں۔ دعوت نامے کے جواب میں علامہ اقبال مرحوم معذرت کا خط تحریر فرماتے ہیں۔ نہ جائیں دہلی علامہ مرحوم لیکن کم سے کم از رہ مروت کوئی پیغام ہی لکھ بھیجیں کہ ان کی غیر موجودگی میں حاضرین جلسہ کو سنایا جاسکے۔ علامہ اقبال مرحوم کے اس پیغام کی تحریر سے قبل کیا ہوا؟ اس کی عقدہ کشائی کرتے ہوئے حضرت خواجہ حسن نظامی مرحوم کو تحریر فرماتے ہیں کہ پیغام کا مضمون کیا ہوا؟ اس کے لیے مراقبہ کیا تو مرزا ہرگوپال تفتہ مرحوم کی روح سامنے آ گئی اور اہل دہلی کے لیے یہ دو شعر نازل کر کے غائب ہوگئی۔

؎ دریں محفل کہ افسونِ فرنگ از خود ربود او را
نگاہ پردہ سوز آور، ولے دانائے راز او را
مئے ایں ساقیان لالہ رو، ذوقے نمی بخشد
ز فیض حضرت غالبؔ ہماں پیمانہ باز آور

ترجمہ: (اب دلّی میں ایسی محفل سجی ہے کہ فرنگی جادو نے خود انھیں بے قابو کر دیا ہے اب ایسی پردہ سوز نگاہ چاہیے جو اس افسوں کا پردہ چاک کرے لیکن اس مقصد کے لیے ایک دانائے راز چاہیے۔ ان گل لالہ کی طرح چہرہ رکھنے والوں

کے لیے یہ شراب مزا نہیں دے رہی حضرت غالب کے ذوق کے مطابق والی شراب دوبارہ لا۔)

اور پھر اس کے بعد علامہ مرحوم یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ دہلی کے پنڈتوں کو میرا اسلام کہیے گا۔ مرزا ہر گوپال تفتہ کی روح ان کو مراقبے میں ملی کیسے؟ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی روح کے تجسد کو مانا جاسکتا ہے، ارشمیدس (Archimedes) کی روح کا تجسد بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ان کا دین و مسلک جاننے کا کوئی مستند ذریعہ نہیں ہے۔ حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی روح مبارکہ دیوبند میں بجسد اقدس وارد ہوئی، ایک دیہاتی کو بھی اس روح سے اس طرح فیض پہنچا کہ حضرت قدس سرہ عالم عنصری میں جسم کے روپ میں آئے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ حنفی ماتریدی تھے لیکن مرزا تفتہ کا دیان گیان تو سب کو معلوم تھا، ان کی روح سے علامہ مرحوم کیسے فیض یاب ہوئے اور وہ روح ان کے مراقبے میں کیسے آئی؟

پیدائشی طور پر ہی ذکر و مراقبات ذات وصفات میں مصروف رہنے والے۔
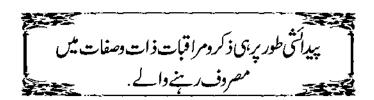
فرمایا بعض بچوں کو ریاضت و کسرت کا شوق ہوتا ہے۔ اپنے جسم کو بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ غذاؤں کا استعمال بہت احتیاط سے کرتے ہیں۔ صبح و شام ورزش (Exercise) کرتے ہیں حتیٰ کہ اب بعض بچے تو ان مقاصد کے لیے مختلف وٹامنز کی گولیاں بھی استعمال کرتے ہیں اور نتیجہ کیا نکلتا ہے یہ کہ بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

صحت عمدہ رہتی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اپنے فرائض ادا کرنے میں سستی سے کام نہیں لیتے اور کاہلی انھیں چھو کر نہیں گذرتی۔ کاہلی سے ایک لطیفہ یاد آیا اور وہ یہ کہ دو بھائی رات کو سونے کے لیے ایک ہی کمرے میں اپنی اپنی چارپائی پر لیٹے۔ دونوں بلا کے کاہل تھے۔ ایک نے دوسرے سے کہا کہ ذرا اُٹھ کر دیکھو تو باہر بارش ہو رہی ہے یا نہیں۔ دوسرے نے لیٹے لیٹے جواب دیا کہ برس رہا ہے۔ پہلے نے پوچھا کہ تمھیں کیسے معلوم ہے؟ اس نے کہا ابھی بلی آئی تھی میں نے اس پر ہاتھ پھیرا تو تر بتر تھی اس سے معلوم ہوا۔ پہلا پھر بولا کہ اچھا بھئی اُٹھو اور چراغ گل کر دو۔ دوسرا بولا روشنی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی نا تو مونھ لحاف میں دے لو۔ پہلا بولا ارے بھیا تم تو بہت سستی کے مارے ہوئے معلوم ہوتے ہو چلو اٹھو اور دروازہ بند کر دو۔ جواب ملا کہ بھائی جان آپ کے دو کام تو میں نے کر دیے اب آپ بھی تو کوئی کام کر دیں۔

سو یہ بچے اپنا جسم بناتے ہیں، کاہل نہیں ہوتے۔ صوفی بھی ایسے ہی ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کی فطرت ہی میں یہ خاص بات مزید اضافے کے ساتھ رکھ دیتے ہیں کہ وہ اس کی معرفت میں مصروف رہیں۔ ایسے لوگ پیدائشی طور پر ہی ذکر و مراقبات، ذات و صفات میں مصروف رہتے ہیں۔ اسم ذات سے لے کر مراقبہ ذات تک کی تمام منازل طے کرتے ہیں۔ ذات باری تعالیٰ انھیں اپنا قرب خاص عنایت فرماتی ہے اور ان کے نقوش عمل کو لافانی بنا دیتی ہے۔ یہ اپنی روح کو بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ روحانی کسرت و ریاضت کے شوق میں اپنے معاصرین سے کوئی اعتناء کیے بغیر منازل شوق طے کرتے ہیں اور ہر گناہ سے اس لیے بچتے ہیں کہ ان کی روحانیت تنزل کا شکا ہوتی ہے۔

حتیٰ کہ قرب فرائض کی منزل سے نکل کر قرب نوافل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہی ہیں جن کی زندگی قابل تعریف، جن کا عالم نزع قابل رشک اور جن کی آخرت کی منازل ان کے جسم کی موت سے پہلے ہی انھیں دکھا دی جاتی ہیں۔ جسم کی موت اس لیے کہا کہ فرشتے صرف جسم پر موت طاری کرتے ہیں روح تو ہر لمحہ ہر آن حالت حضوری میں رہتی ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

؎ فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

صحیح عقیدہ سے ناواقف صوفی کی صحبت سم قاتل ہے۔

فرمایا جو صوفیاء یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کی بنیاد صحبت شیخ یا ذکر الٰہی ہے، تو یہ ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ تفسیر ہو یا حدیث، فقہ ہو یا تصوف تمام علوم اور تقرب الٰہی کی بنیاد صحیح عقیدہ ہے۔ عقیدہ اگر رائی کے دانے کے برابر بھی فاسد ہے تو تصوف اور سلوک کی خوشبو تک نہیں پا سکتا اصل جوہر پانا تو ناممکن ہے۔ اس لیے سب کو، سب سے پہلے اپنے عقیدے کو درست کرنا چاہیے۔ یا تو عقیدہ وہ ہونا چاہیے جو ماتریدی حضرات رحمۃ اللہ علیہم نے کتاب وسنت سے اخذ کیا ہے اور فقہ اکبر یا عقیدہ طحاویہ میں تحریر فرما دیا ہے اور یا پھر عقیدہ اشعری حضرات کے مطابق ہونا چاہیے کہ وہ بھی اہل حق ہیں اور انہوں نے بھی عقیدے کا استنباط کتاب وسنت ہی سے کیا ہے۔ ماتریدی اور اشعری علماء کے عقائد کا اختلاف کچھ تو محض نزاع لفظی ہے اور کچھ اختلاف مبنی بر حقائق بھی ہے تو وہ ایسے حقائق نہیں

ہیں کہ ان کی بناء پر وہ دونوں ایک دوسرے کی تکفیر یا تفسیق کریں۔ جس صوفی کو عقیدے کا معلوم ہی نہیں کہ وہ کیا چیز ہے، اس صوفی کی صحبت سم قاتل ہے۔ اس سے ایسے ہی بچنا چاہیے جیسے کہ انسان اپنے آپ کو کسی سانپ، اژدھا، یا درندے سے محفوظ رکھتا ہے۔

جس صوفی کا عقیدہ درست نہ ہو
اس سے بیعت تو درکنار........!
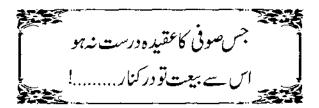
فرمایا: ضروریات دین کی بھی ایک فہرست ہے۔ اور ان ضروریات میں یہ بات بھی شامل ہے کہ جس صوفی کا عقیدہ درست نہ ہو اس سے بیعت تو درکنار، اس کی صحبت تک سے بچے۔ مثلاً صوفی کا عقیدہ اگر یہ ہو کہ حلال وحرام سب جائز ہے۔ وجود ایک ہی ہے اور جو حسن ہے وہ ذات اقدس ہے معاذ اللہ تو یہ صوفی تو خود گمراہ ہے معلوم نہیں کہ ایسے جملوں کے بعد مسلمان بھی رہے گا یا نہیں کجا یہ کہ وہ پیر مرشد ہو۔

اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں
وحدۃ الوجود کا غلبہ۔
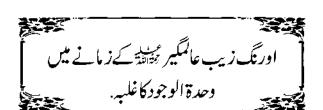
فرمایا: سلطان اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں وحدۃ الوجود کا بہت غلبہ ہو گیا تھا۔ بعض گمراہ صوفی خالق اور مخلوق کے اتحاد کے قائل تھے اور بعض عبد اور معبود میں کوئی فرق روا نہیں رکھتے تھے۔ اس وجہ سے اس زمانے میں چونکہ فتاویٰ عالمگیری مرتب ہو رہی تھی تو علماء کو یہ لکھنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ کبھی اتنا نزول نہیں فرماتے کہ بندہ بن جائے اور انسان

کو کبھی اتنا عروج نہیں ہوتا کہ وہ خدا بن جائے۔

جاہل مشائخ کا ایک آدھ صدی کے بعد نام بھی نہیں رہتا.

فرمایا جب کوئی شخص مرید ہونے آئے تو ہمیشہ غور وفکر سے کام لے کر بیعت کرنا چاہیے۔ سب سے زیادہ سوئے ظن تو اپنے نفس کی نسبت رکھنا چاہیے کہ میں سرے سے اس قابل ہی نہیں ہوں۔ اگر ذہن میں آئے کہ میں اس قابل ہوں یا یہ کہ شیخ نے کچھ سوچ کر ہی اجازت دی ہوگی وغیرہ وغیرہ تو ہرگز بیعت نہیں لینی چاہیے کہ ابھی تو یہ خود ناقص ہے اور ان لوگوں کا مرید ہونے کے لیے آنا استدراج ہے۔ یہ سمجھنا چاہیے کہ میرا نفس جو مختلف تاویلات کر کے مجھے پیر بنا رہا ہے یہ وہ باطل عمل ہے جس پر میں قائم ہوں اور لوگ جو آ رہے ہیں تو میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ قبولیت عند اللہ ہے جبکہ میں تو ابھی اپنے نفس کے مکر سے نجات حاصل نہیں کر سکا۔ یہ سب استدراج ہے۔ اور اگر لوگوں کو مرید کر کے خوشی محسوس ہوتی ہو تو پھر تو بالکل ہی بربادی ہے، ایسے شخص کو چاہیے کہ اپنی عاقبت کی فکر کرے۔ کیا فائدہ کہ لوگ تو اپنے اخلاص کے سبب جنت میں چلے جائیں اور یہ جہنم کا کندہ بنے۔ ہاں اگر اس لیے بیعت کرے کہ شیخ کا حکم ہے اس کا ادب اور امر معروف میں ان کی اطاعت ضروری ہے اور مرید کرتے وقت بھی خائف اور لرزاں رہے اور اللہ تعالیٰ سے التجا اور تضرع وزاری کرے کہ لوگ آپ تک پہنچنے کے لیے مجھے واسطہ بناتے ہیں، آپ ہی میرے اور ان کے دستگیر ہیں تو البتہ مرید کرنا جائز ہوگا۔ ایسے ہی حضرات کے سلاسل میں اللہ تعالیٰ برکتیں بھی عنایت فرماتے ہیں اور یہی سلاسل قائم

رہتے ہیں۔ وگرنہ جاہل اور مریدوں کے زیادہ ہونے سے خوش ہونے والے مشائخ کا سلسلہ اگرچہ بظاہر پھیل رہا ہو لیکن درحقیقت وہ مٹ رہا ہوتا ہے چنانچہ ایک آدھ صدی کے بعد ان کا نام ونشان بھی نہیں رہتا۔

صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے کشف والہام کو شریعت کے ترازو میں تولنا چاہیے.

(فرمایا) حضرات صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کو جو کشف والہام ہوتا ہے اسے شریعت کے ترازو میں تول کر قبول یا رد کرنا چاہیے۔ ان کی جو بات شریعت کے خلاف ہے، ایک ٹکے کے برابر نہیں ہے۔ ان کے خواب اور کشف اگر شریعت کے مطابق نہ ہوں تو انھیں دیوار پر دے مارنا چاہیے۔ تصوف کا اصل کام اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے وعدو وعید پر یقین ہونا اور پھر اس یقین میں دن بدن اضافہ ہے۔ یہ یقین اور اضافہ، شریعت پر عمل کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے اور بس۔ اگر کوئی شخص عمر بھر ذکر ومراقبہ میں مصروف رہے اور یہ یقین پیدا نہ ہو کہ حرام کام سے عذاب ہوگا اور نماز پڑھنے سے اللہ تعالیٰ خوش ہوگا، اس کی ذات سبحانہ وتعالیٰ نے اعمال صالحہ اور اپنے فضل سے جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ یقیناً ملے گی اور جن اعمال پر جہنم کا فرمایا ہے ان سے بچنا ہے کہ آخرت میں جہنم دیکھنی پڑے گی، تو پھر ایسے شخص کو پیر بننے سے زیادہ اپنے یقین کو پختہ کرنا چاہیے۔

اکثر صوفیاء کی نماز کے مسائل سے عدم واقفیت.

فرمایا ہمارے زمانے میں اکثر صوفیاء کی نماز سنت کے مطابق نہیں ہوتی۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ نمازوں کے مستحب اوقات کیا ہیں۔ چنانچہ نماز عشاء جلدی ادا کرتے ہیں اور نماز عصر بھی مستحب وقت سے پہلے پڑھ لیں گے۔ فرض نماز پڑھائیں گے اور پہلی دو رکعتوں میں دو مختلف سورتوں کی آخری آیات پڑھ کر نماز کو مکروہ کریں گے۔ دوسری، تیسری اور چوتھی رکعت کے آغاز میں تسمیہ نہیں پڑھیں گے اور نماز کو مکروہ کریں گے۔ انھیں چاہیے کہ سب سے پہلے اپنی نمازیں سنت کے مطابق کریں۔ تزکیہ نفس تو بہت بعد کی بات ہے۔ فقہ میں صرف طہارت اور نماز کے ابواب ہی پڑھ لیں تو بسا غنیمت ہے۔ اور ان کے مرید اُن سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔ ایسی نمازیں پڑھتے ہیں جیسا کہ ان کا شیخ پڑھتا ہے۔ اور اس جاہل شیخ کی نماز کو دلیل بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے حضرت ایسے ہی پڑھتے تھے یا پڑھتے ہیں۔ کیا ظلم مچا ہوا ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسے نماز پڑھی ہے ویسی پڑھنے کے لیے علم حاصل نہیں کرتے اور اپنے جاہل شیخ کی نماز کو دلیل بناتے ہیں حالانکہ دلیل تو سنت ہے۔ وہ نماز، سیکھ کر اور علم حاصل کر کے پڑھنی چاہیے اور اپنی اور اپنے شیخ کی نماز اس کسوٹی پر پرکھنی چاہیے۔ جاہل مرید الٹا معاملہ کرتے ہیں۔

❀ ❀ ❀
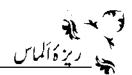
اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نقشبندیہ کو ہندوستان میں عروج نصیب فرمایا.

فرمایا اللہ تعالیٰ نے سلسلۂ نقشبندیہ کو ہندوستان میں جما دیا۔ پے در پے اتنے اکابر واعاظم اس سلسلے میں داخل ہوئے کہ ان کی چمک کے سامنے لعل یمن ماند پڑ گئے۔ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو بہت فکر تھی کہ ہندوستان میں اس سلسلے کا مستقبل کیا ہوگا؟ چنانچہ اپنے مکتوبات شریف میں بھی ایک مقام پر تحریر فرمایا ہے کہ

این نسبتِ عالیہ کہ دریں دیار بسیار غریب است

(سلسلۂ نقشبندیہ کی عالی نسبت ہندوستان میں بہت کم ہے)

اس مقصد کے لیے ہمیشہ دعا گو رہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت مرزا مظہر جانجاں، حضرت شاہ ولی اللہ، حضرت مولانا غلام علی صاحب دہلوی، قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی، حضرت شاہ علم اللہ، خواجہ آدم بنوری، حضرت سید احمد شہید، حضرت خواجہ دوست محمد صاحب قندہاری رحمۃ اللہ علیہم سے اس پاک سلسلے کو استقامت بخشی اور ان حضرات میں ماتریدی عقیدہ، اتباع سنت، صحیح علم، نماز، تلاوت، اپنے مریدین کو سلوک کے تمام اسباق طے کرانا، پختہ خانقاہیں بنانے کا ذوق، کتب خانوں کا اہتمام کرنا، ضبط احوال اور سکوت، برابر چلتا رہا۔ اور بحمدہ سبحانہ وتعالیٰ ان کی جن شاخوں میں بدعات نہیں آئیں، وہاں یہ خصوصیات اب تک قائم ہیں۔ ثبتنا اللّٰہ و ایا ھم علی الطریقۃ المرضیہ.

گمنامی ——— مشائخ چشت کا شیوہ.

(فرمایا) حضرات مشائخ چشت رحمۃ اللہ علیہم اپنے گاؤں چشت (جو کہ اب بھی افغانستان میں موجود ہے) سے ہندوستان وارد ہوئے۔ گمنامی ان کا ہمیشہ شیوہ رہا۔ نہ کبھی پختہ خانقاہیں بنائیں اور نہ کہیں نام ونشان کے لیے جدوجہد کی۔ اپنے آپ کو ہمیشہ مٹاتے رہے اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ انھیں مقامات ارفع عنایت فرماتے رہے۔ یہ اپنے آپ کو اللہ کے لیے خاک میں ملاتے رہے ہر دم اپنی نفی ان کا شعار رہا اور جو جتنا مٹا، رہ ہدایت اس پر اتنی ہی مرمٹی۔ ان خاک نشینوں کی تمام عمر داستان عشق بیاں کرنے میں گذری اور ہجر کے غم نے ان کی ہڈیوں تک کو گلا دیا۔ یادالٰہی کے غلبے میں گریہ وزاری ان کا حال رہی اور مخلوق خدا کا ظلم اور ابنائے زماں کا حسد، ان پر ہر دور میں ایسا برسا کہ ساون میں برکھا بھی کیا برسی ہوگی۔ تقدیرالٰہی پر صبر اور اپنے آپ کو مٹا دینا سلسلہ عالیہ کی پہچان تھی اور اب تک بھی ان کی جو شاخیں بدعات میں مبتلا نہیں ہوئیں، وہاں یہی صورتحال ہے۔ ان کے درویش ہمیشہ اس اصول کے قائل رہے کہ
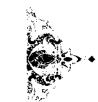
ہر کہ دادہ رنج مارا حقش بسیار باد

(جو ہمیں تکلیف دے اللہ تعالیٰ اس کی راحت میں اضافہ فرمائے)

ارباب حکومت سے بے نیازی اور اخفائے حال سلسلے کا خاصہ ہے۔ شیخ بدرالدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ سلسلۂ چشتیہ کے مشائخ اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کعکی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کبار میں سے تھے۔ ان کا تعلق دہلی میں امرائے سلطنت سے تھا اور انہوں نے سلسلۂ چشتیہ کی
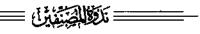
خدمت کی غرض سے ان کے لیے ایک پختہ خانقاہ تعمیر کر دی۔ حکومت جب تبدیل ہوئی تو یہ خانقاہ اور اس کے بانی معتوب قرار پائے۔ مصائب کا پہاڑ ٹوٹا اور شیخ بدرالدین غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خواجہ تاش حضرت فریدالدین مسعود رحمۃ اللہ علیہ کو اجودھن خط لکھا۔ عرضِ احوال کے بعد دعا کی درخواست کی تو شیخ وقت نے جو جواب تحریر فرمایا وہ سلسلۂ چشتیہ کے ذوق کا نمائندہ تھا۔ فرمایا:

> جو خود اپنی نئی روش بنائے گا ضرور مبتلائے مصیبت ہوگا اور بے چینی ہوگی۔ آپ تو پیران پاک کے دامن گرفتہ ہیں پھر ان کی روش کے برعکس خانقاہ کیوں بنوائی؟ اس میں کیوں بیٹھے؟ ہمارے شیخ حضرت خواجہ قطب الدین اور ان کے شیخ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہم کی یہ روش تو نہ تھی کہ اپنے لیے خانقاہ بنوائیں اور دُکان کھول لیں۔ ان کا طریقہ تو گمنامی و بے نشانی تھا۔

مولانا الطاف حسین حالؔی کا ایک شعر مشائخ سلسلۂ چشتیہ رحمۃ اللہ علیہم کے ذوق کا صحیح ترجمان ہے۔

؎ مال ہے نایاب اور گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے، دکاں سب سے الگ

سلسلۂ چشتیہ کے حالات سے آگاہی کے لیے اس وقت سب سے زیادہ مستند کتاب سیر الاولیاء ہے۔
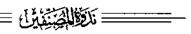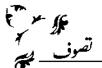
غالب کا عجز، بندگی اور اعتماد علی اللہ.

فرمایا غالب نے اپنے اس شعر میں اپنے عجز، اپنی بندگی اور اعتماد علی اللہ کی کیا خوب بات کہی ہے۔

جنس بازار معاصی، اسد اللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

اسی مضمون کا ہندی دوہا بھی کیا خوب ہے۔

دانت گرے اور کُھر گھسے پیٹھ بوجھ نہ لے
ایسے بوڑھے بیل کو، کون باندھ، بُھس دے

صوفیاء کے مکاشفات غلط ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں.
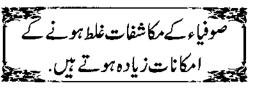
فرمایا شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اہل جہنم کے بھی شامل حال ہو جائے گی۔ کافروں کو عذاب دوزخ تین حُقُبَہ تک ہوگا۔ حُقُبَہ عربی زبان میں اَسّی سال کو کہتے ہیں اور ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہوگا۔(360×80=28800) سو ایک حقبہ جب اٹھائیس ہزار آٹھ سو دن کا ہوا (28800×3=86400) تو تین حصے چھیاسی ہزار چار سو دن کے ہوئے اور یہ کل مدت دو سو چالیس سال بنتی ہے اور اس مدت کے بعد دوزخ کی آگ کافروں کی ایسی ہی ٹھنڈی ہو جائے گی جیسے کہ وہ سیدنا ابرہیم علیہ السلام

کے لیے ٹھنڈی ہوگئی تھی اور اللہ تعالیٰ نے جو انھیں ہمیشہ عذاب دینے کا وعدہ فرمایا ہے تو اگر اللہ تعالیٰ کسی سے انعام کا وعدہ کر کے اسے عطا نہ فرمائیں تو یہ بات تو اس کی شان کے خلاف ہے اور اگر ہمیشہ عذاب دینے کا وعدہ فرمائیں اور کچھ مدت (دو سو چالیس سال) کے بعد وہ عذاب ہٹا دیں اور مزید عذاب نہ دیں تو یہ جو عذاب کا وعدہ پورا نہ کیا تو یہ تو مزید اس کا کرم ہے، کوئی بات اس کی شان کے خلاف نہیں اور حضرات صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم میں سے کسی کا بھی یہ مسلک نہیں ہے کہ کفار کو جہنم کا دائمی عذاب ہوگا۔

ہمارے شیخ و عارف باللہ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی نور اللہ مرقدہ نے شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے اس نظریے پر شدید تنقید کی ہے اور فرماتے ہیں کہ شیخ بہت سے دیگر مسائل کی طرح اس مسئلے میں بھی رہ صواب سے ہٹ گئے ہیں کیا انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت دونوں جہاں میں صرف ایمان والوں کے لیے ہے اور کافروں کے لیے تو اس کی رحمت صرف دنیا میں ہے آخرت میں نہیں۔ آخرت میں تو کافر خدا کی رحمت سے محروم ہوں گے۔ شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ جن قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہیں وہ ان آیات کے صرف ابتدائی حصے ہیں انہی کے آخری حصے کیوں نہیں پڑھتے جہاں اللہ تعالیٰ نے آخرت میں رحمت کو صرف مسلمانوں کے ساتھ مربوط کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کے مخالفین (کفار) کو ہمیشہ جہنم میں رکھے گا تو اگر اللہ تعالیٰ کسی موقع پر کافروں سے عذاب ہٹا کر وسعت رحمت سے کام لے گا تو اس وقت وہ اپنے اس وعدے کے خلاف بھی تو کرے گا جو اس نے اپنے دوستوں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہر طرح کے معائب سے منزہ اور پاک ہے اور یہ جو شیخ صوفیا کرام کا مسلک ذکر کرتے ہیں کہ کوئی صوفی بھی کافر کے ہمیشہ جہنم میں رہنے کا قائل نہیں ہے تو زیادہ سے زیادہ صوفیاء کو ایسا کشف ہوا ہوگا تو جب اجماع امت کافروں کے دائمی عذاب پر ہے تو اس اجماع کے مقابلے میں کسی صوفی کے کشف کی حیثیت ہی کیا ہے؟ صوفیاء کا کشف غلط ہونے کی امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

کمالات نبوت اور کمالات ولایت.

(فرمایا) کمالات نبوت کے مقابلے میں کمالات ولایت کی حیثیت اتنی بھی نہیں جتنی ایک ادنیٰ قطرے کو کسی چھوٹے سے ادنیٰ سمندر سے ہوتی ہے، اس لیے جو لوگ سلوک از راہ نبوت طے کرتے ہیں ان کے مقابلے میں جو لوگ سلوک از رہ ولایت طے کرتے ہیں، کاش اس درجے میں بھی ہوتے جو درجہ ذرے کا آفتاب سے ہے۔

سلاسل طریقت میں بدعات کو رائج کرنا ثمرات و برکات سے محرومی کا سبب ہے.

(فرمایا) وہ تمام مسائل جن میں حضرات صوفیائے کرام اور علمائے عظام رحمۃ اللہ علیہم کا اختلاف ہے، صحیح تر بات یہ ہے کہ حضرات علماء کرام رحمۃ اللہ علیہم کا مسلک بہت ٹھوس اور واضح ہے۔ ان کے فتاویٰ دوٹوک اور قابل تسلیم واتباع ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرات علماء کرام اپنے علم کو کتاب وسنت اور آئمہ مجتہدین کے دلائل کی بنیاد پر عمل میں تبدیل کرتے ہیں جب

کہ حضرات صوفیاء کرام اپنا علم کمالات ولایت سے اخذ کرتے ہیں۔ پھر کبھی اس میں اپنے مکشوفات کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور رہ صواب سے دور اور رہ خطا پر چل پڑتے ہیں۔ پھر ان صوفیاء کرام میں وہ گمراہ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو کتاب وسنت کی بجائے محض اپنے مشائخ کے طرز عمل کو دیکھ کر اسے ''صراط مستقیم'' کا نام دیتے ہیں۔ اپنے آپ کو اپنے مشائخ کے طرز عمل کا مردہ مقلد قرار دیتے ہیں اور چونکہ خود بھی علم سے واسطہ نہیں ہوتا، مطالعہ کرتے نہیں اور ان کے مشائخ بھی صاحبان علم نہیں ہوتے محض جاہل صوفی ہوتے ہیں، اس لیے یہ بھی ان کی جہالت کی راہ پر ان کے متبع ہو جاتے ہیں۔ اپنے مشائخ کے اعمال کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ تو ہمارے فلاں حضرت کی سنت ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْن. کیا یہ گمراہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ اصطلاحات میں یہ لفظ حضرت رسالت پناہ ﷺ کی غیر منسوخ شدہ احادیث پر عمل کرنے کا نام ہے اور اسی ذات اقدس کے لیے مخصوص ہے؟ اس گمراہ صوفی کو یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے یا ان کا فعل مبارک یہ ہے تو یہ اپنے مشائخ کے اعمال کو دلیل بناتا اور سنت کے مقابلے میں لاتا ہے۔ یہ شرک فی الرسالۃ نہیں تو اور کیا ہے؟ اس قسم کی باتیں جب سننے میں آتی ہیں تو غیرت ایمانی اور تعلق نبوی اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ان گمراہوں کے اعمال کی کوئی تاویل کریں۔ آئمہ مجتہدین کے اجتہاد پر اپنے مشائخ کے عمل کو ترجیح دیتے ہیں اور امت میں گمراہی اور فرقہ بندی کے در کھولتے ہیں اسی لیے تو اللہ تعالیٰ ان کو سلاسل طیبہ کی برکات سے محروم اور ان کے سلاسل کو معدوم کر دیتا ہے۔ بدعات پر تساہل برتتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ جیسے شریعت مطہرہ میں بدعات کو اختیار
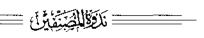
کرنا گمراہی ہے ایسے ہی سلاسل طریقت میں بھی، بدعات کو رائج کرنا ثمرات و برکات سے محرومی کا سبب ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صاحبزادہ والا تبار حضرت خواجہ محمد صادق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام جو گرامی نامہ تحریر فرمایا ہے، وہاں ان حقائق پر بھی قدرے روشنی ڈالی ہے۔ چاہیے کہ اس کا مطالعہ کریں۔

کافروں کی مذہبی رسومات سے دلی طور پر نفرت ہونی چاہیے۔

فرمایا کافروں کی جو بھی مذہبی رسومات ہیں ان سے دلی طور پر نفرت ہونی چاہیے۔ ان رسومات کو بُرا جانے اور ان کے لیے دعا مانگے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ان بد رسوم سے نجات دے۔ ان پر بھی ترس کھائے اور ان کافروں کو نرمی سے سمجھانا چاہیے تا کہ تبلیغ ہو جائے اور صحیح پیغام ان تک پہنچ جائے۔ ان کی تمام مذہبی رسومات میں کفر و شرک شامل ہے اور اگر ایمان بچانا ہو تو ان مذہبی رسومات سے برائت ضروری ہے۔ جس کافر کو اسلام کا پیغام، خود اس کی اپنی زبان میں پہنچا اور اس نے عاقل، بالغ اور بقائمی ہوش و حواس اس پیغام کو سمجھ کر پھر انکار کیا تو ایسے کفر کی سزا ابدی جہنم ہے اس لیے مسلمان ہونے کے باوجود کافروں کی مذہبی رسومات میں شرکت کرنا اور ان کا بجا لانا، اپنے ایمان کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ ایک ایسے مریض کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے جو عالم نزع کی کشمکش میں تھا۔ جان، جسم کا ساتھ نہیں چھوڑ رہی تھی۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اس صورتحال کو برداشت نہ فرما سکے اور حق عیادت نباہتے ہوئے اس
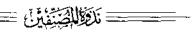
کے دل کی طرف متوجہ ہوئے۔ پایا تو یہ کہ وہ دل کفر کی تاریکیوں سے اٹا ہوا تھا۔ توجہ مبارکہ سے اس کا تزکیہ ممکن نہ تھا اور بتایا گیا کہ اس دل کی تاریکیوں کو اب جہنم کی آگ ہی دور کرے گی۔ پھر معلوم ہوا کہ اس دل میں اتنے کفر کے باوجود ایمان کا ایک ذرہ باقی ہے اس لیے اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ اس لیے کافر کو حق بات پہنچانے اور اسے حق سمجھانے میں تو نرمی مطلوب ہے لیکن کفر اور اس سے متعلقہ رسومات سے تنفر بھی مطلوب ہے۔

کیا ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ ارواح کاملین کے قِدم اور ازلیت کے قائل تھے؟

فرمایا حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے مکتوبات شریف میں اپنے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے یہ تحریر فرمایا ہے کہ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ ارواح کاملین کے قِدم اور ازلیت کے قائل تھے اور اگر اس جملے کی کوئی تاویل نہ کی جائے تو یہ عقیدہ موجب کفر ہے۔ ایک مدت تک یہ پریشانی اور جستجو رہی کہ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے آخر یہ عبارت کہاں تحریر فرمائی ہے، حتی الوسع تلاش جاری رکھی لیکن یہ عبارت نہ ملی۔ آخر مصر سے حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی جو تفسیر چھپی ہے، وہ ہاتھ لگی۔ اسے پڑھا تو معلوم ہوا کہ سورۂ دہر کی تفسیر میں یہ جملہ موجود ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے خود اس جملے کی تاویل بھی فرمائی ہے۔

اجماع امت کے مقابلے میں ناقص صوفیاء کے کشف کی حیثیت ہی کیا؟

فرمایا: جن صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کشف کی بنا پر امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو حضرات شیخین رضی اللہ عنہما پر فضیلت دی ہے ان کے ایسے کشف کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ارباب اہل السنۃ والجماعۃ نے عقائد کے باب میں حضرات شیخین تو کجا حضرت امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ تک کو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے افضل مانا ہے اور یہی صحیح عقیدہ اور نظریہ ہے۔ اجماع امت کے مقابلے میں ایسے ناقص صوفیاء کے کشف کی حیثیت ہی کیا ہے؟ صوفی کا کشف، غیر پر تو کیا حجت ہوتا، وہ اگر مسلمات اہل السنۃ والجماعۃ سے ٹکرائے تو خود اس صوفی کے لیے بھی حجت نہیں جب کہ غیر مجتہد پر مجتہد کی تقلید واجب ہے۔ ایسے صوفیاء کے دست و بازو کمالات انبیاء علیہم السلام سے کوتاہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کمالات ولایت، کمالات نبوت کے سامنے پرکاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔

دل کا اصل مرض اس کا غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہونا ہے.

فرمایا: دل کا اصل مرض اس کا غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہونا ہے۔ اولاد سے اس لیے محبت کہ یہ مجھے نفع دیں گے، مال سے اس لیے کہ دنیا میں کام آئے گا، عہدے سے اس لیے محبت کہ حب جاہ کی تسکین ہوگی، دوستوں سے اس لیے محبت کہ کام آئیں گے۔ الغرض جتنی بھی اشیاء سے محبت ہے محض اپنی ذات اور نفس کے لیے، تو اصل محبوب،

مطلوب اور معبود اپنا نفس ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی کہاں ہے؟ یہ سب غیر اللہ ہیں اور جب تک ان کی محبتوں اور اپنے نفس کی بندگی سے نجات نہ ملے، نجات کیونکر متصور ہے؟ اس لیے طالب نجات کو چاہیے کہ اپنا نقطۂ نظر بدلے۔ اولاد سے تعلق خاطر کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق تیرے ذمے رکھے ہیں یہ فرمانبردار رہوں یا نافرمان، ان کے ساتھ بھلائی کرنی ہی ہے۔ دوست ملنے آتے ہیں تو آنے والے کا حق بنتا ہے، اس کے حقوق کو بجالانا ہے۔ مال اللہ تعالیٰ نے دیا ہے تو اس کا صحیح مصرف تلاش کرکے اسے خرچ کرنا ہے۔ ان تمام اشیاء سے محبت نہیں بلکہ اپنے فرائض کی ادائیگی ہے اور بس۔ جو شخص یہ نقطہ نگاہ رکھے اور اپنے دل کو غیر کی محبت سے بچالے وہ نجات پائے گا۔ غیر اللہ کی محبت ایسا مرض ہے جس کا ازالہ ضروری ہے اور اسی ازالے کے لیے تصوف کی راہ پر چلا جاتا ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مختلف نظریات!
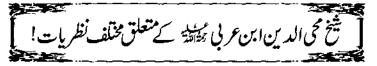
فرمایا حضرت شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ پیروکار تو ایسے تھے کہ جو کچھ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فتوحات، یا فصوص یا اپنی دیگر تصانیف میں لکھا، اسے بالکل برحق مانا اور ان افکار کی نشر واشاعت کرتے رہے۔ نہ یہ سوچا کہ ممکن ہے ان کی کتابوں میں تحریف یا ان کا کشف مشتمل بر خطا ہو یا ان کے الہامات وکشوف اگر نصوص سے ظاہراً ٹکراتے ہیں تو ان کی کیا تاویل وتوجیہہ کی جائے اور دوسرا گروہ ایسا تھا جس کو صرف یہ معلوم ہوجانا کافی تھا کہ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا ہے، وہ کیل کانٹے سے لیس ہوکر ایسے مسلح حملے کرتے
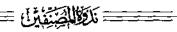
تھے کہ پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ حسن ظن اور تاویل سے بالکل نا آشنا ہیں اور ان کی ہر عبارت کو جامہ کفر پہنانے کو تیار۔ ادھار کھائے بیٹھے ہیں کہ ہر قیمت پر حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا ردّ کرنا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بھی بعض مقامات پر یہی رویہ اختیار کرتے ہیں لیکن پھر بھی بسا غنیمت ہیں کہ کئی مقامات پر عدل کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا لیکن جس گروہ نے انھیں اپنا قائد مانا ہے، وہ گروہ آج تک حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ سے زیادتی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ پھر ایک گروہ ان دو انتہاؤں کے درمیان ہے۔ یہ ہندوستان کے علماء کرام و صوفیان عظام رحمہم اللہ ہیں نہ غلطی کی تصویب کرتے ہیں اور نہ صحیح کی تغلیط کرتے ہیں۔ پھر ان میں بھی حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی شیخ سرہندی نور اللہ مرقدہ اور ارباب وحدۃ الشہود کے تو کیا کہنے۔ اعتدال کی راہ پر گامزن ہیں۔ مکتوبات شریف میں نہایت وضاحت سے بار بار یہ اقرار فرمایا ہے کہ ''ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ از اولیاء مقبولان است'' اور پھر جہاں ان کی عبارات نصوص سے ٹکراتی نظر آئی ہیں یا تو ان کی توجیہہ کی ہے اور یا پھر انھیں ''خطاء کشفی'' قرار دیا ہے۔ جو لوگ بھی حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں چاہیے کہ حضرت شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شیخ عبدالوہاب شعرانی اور حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمہم اللہ نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے بھی غافل نہ رہیں۔
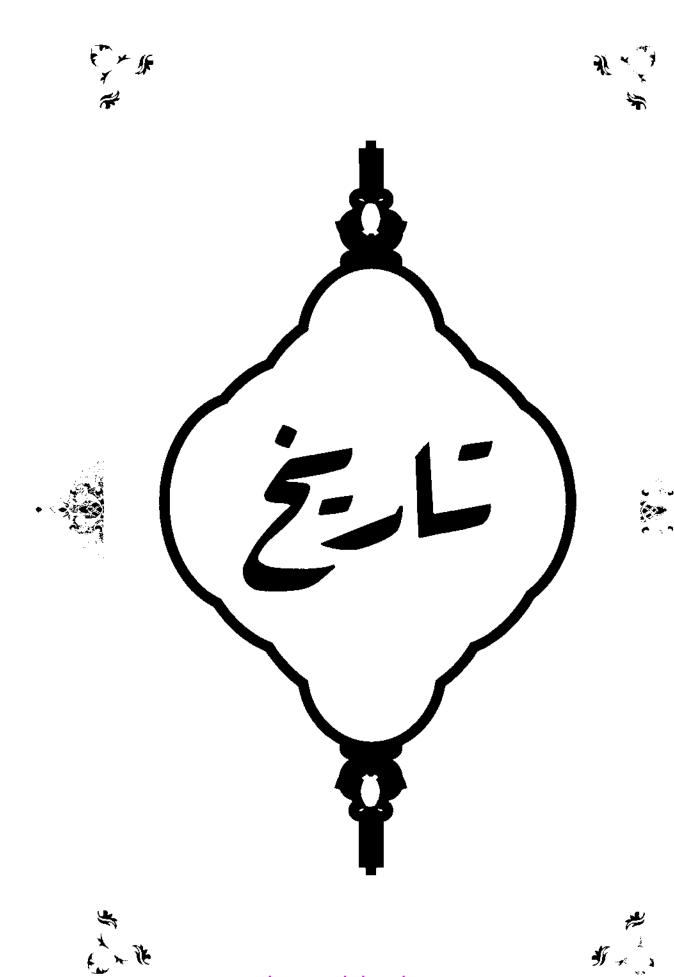
تاریخ

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ۔

(پ:۱۲، سورۂ ھود، آیت:۱۰۰)

یہ ان تباہ شدہ بستیوں کی کچھ داستانیں ہیں جو ہم آپ کو سنا رہے ہیں، اُن (برباد شدہ بستیوں) میں سے کچھ تو اب بھی باقی ہیں اور کچھ وہ، جن کی فصل کٹ چکی (اور وہ قصۂ پارینہ ہوگئیں۔)
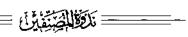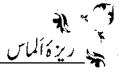
واقعہ حرّہ واقم اور اہل بیت نبوی ﷺ کی دور اندیشی.

(فرمایا) حَرّہ وَاقم کا مشہور واقعہ ۶۳ھ میں پیش آیا تھا۔ قصہ یہ تھا کہ حضرات اہل مدینہ میں سے انصار رضی اللہ عنہم کا ایک وفد یزید کے دربار میں دمشق گیا۔ یزید نے اگر چہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا لیکن انھوں نے جب یزید کی زندگی کو شریعت کے خلاف اعمال سے پُر پایا، تو صبر نہ کر سکے اور مدینہ منورہ واپس پہنچ کر ایسے فاسق وفاجر شخص کی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بغاوت برپا ہوگئی۔

حضرت عبداللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ انصاری رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی اور مروان بن حکم اور تمام بنو امیہ کو مدینہ منورہ سے نکال دیا گیا۔ یزید تک جب یہ خبر پہنچی تو اس نے اہل مدینہ کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے ایک لشکر بھیجا، جس کا امیر مسلم بن عقبہ کو مقرر کیا۔ مدینہ منورہ سے باہر ایک مقام ''حَرّہ وَاقم'' تھا، اس میدان میں اہل مدینہ جمع ہوئے اور یزیدی فوج اپنے کمانڈر مسلم بن عقبہ کی قیادت میں یہاں پہنچی تو بہت گھمسان پڑا۔ مہاجرین اور انصار صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اولادیں شہید ہوئیں، محمد بن ثابت بن قیس بن شماس، محمد بن ابی بن کعب، معاذ بن حارث ابوحلیمہ انصاری ـــــ انھیں امیر المومنین سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں تراویح کا امام مقرر کیا تھا ـــــ کثیر بن افلح ـــــ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے جن کاتبین سے مختلف مصاحف لکھوائے تھے ان میں سے ایک یہ بھی ہیں ـــــ معقل بن سنان، عبداللہ بن حنظلہ غسیل ملائکہ، عبداللہ بن زید ـــــ جنھوں

نے حضرت رسالت مآب ﷺ کے وضو کی بعض تفصیلات بیان کی ہیں اور مہاجرین وانصار کی اولاد رضی اللہ عنہم میں سے تقریباً سات سو افراد شہید ہوئے۔ تین دن، لوگ اپنے گھروں میں خائف وساکت بیٹھے رہے۔

اہل بیت نبوی علیہم السلام واقعہ کربلا سے ہی یہ سمجھ چکے تھے کہ اب حکومت سے ٹکراؤ کے نتیجے میں اصلاح نہیں ہوگی اس لیے حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ اس معاملے میں بالکل الگ تھلگ رہے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے، حضرت علی بن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم بھی اس میں شریک نہیں ہوئے کیونکہ یہ تمام حضرات سمجھتے تھے کہ ایک جمی ہوئی حکومت کے خلاف بغاوت سے کچھ مثبت نتائج تو برآمد ہونے کے نہیں، کیوں نہ علم کے پھیلاؤ اور عوامی فلاح و بہبود کے کام کیے جائیں۔

تاریخ یمن ''روح الروح'' کا قلمی نسخہ اور اس پر کام کی ضرورت.

فرمایا تاریخ سے شغف رکھنے والے حضرات کو چاہیے کہ تاریخ یمن ''روح الروح'' پر کام کریں۔ اس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے۔ تاریخ کا یہ عظیم سرمایہ حاجی عبدالکریم صاحب مرحوم ومغفور، جو کہ رشتے میں مولانا شبلی مرحوم کے ماموں ہوتے تھے، ہندوستان لائے تھے۔ اب یہ تاریخ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ نویں صدی ہجری کی یمن اور خلافت عثمانیہ کی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات اور نوادرات اس کتاب میں ہیں۔ یمن کے سفر میں، وہاں کے علماء سے بھی اس کا تذکرہ ہوا تو بعض علماء کرام اس سے واقف تھے لیکن کسی ایسے کتب خانے کی نشاندہی

نہ کر سکے جہاں سے اس کا کوئی قلمی نسخہ ہی سہی، مل تو جاتا۔ عیسیٰ بن لطف اللہ بن مطہر بن شرف الدین اس کے مصنف ہیں اور ۱۰۹۰ھ سے لے کر ۱۰۲۸ھ تک کے واقعات اور خلافت عثمانیہ اور یمن کی حکومت کے درمیان خط و کتابت کی بعض اہم دستاویزات بھی اس میں شامل ہیں۔

شیعہ سنی اتحاد کے لیے شرائط اور ”تاریخ نادری“.

(فرمایا) محمد مہدی استر آبادی کی ”تاریخ نادری“ بھی ضرور پڑھنی چاہیے۔ نادر شاہ درانی نے خلافت عثمانیہ سے شیعہ سنی اتحاد کے لیے جو شرائط پیش کی تھیں، اس کے متعلق اہم مواد اس میں موجود ہے، لیکن افسوس کہ یہ تاریخ اب عام طور پر ملتی نہیں۔

ابن خلدون اور امیر تیمور کی ملاقات.

(فرمایا) مشہور مؤرخ اور فلسفی ابن خلدون اور حضرت امیر تیمور گورگانی کی ملاقاتیں ۱۴۰۱ء میں دمشق میں ہوئیں۔ امیر تیمور نے دمشق کو فتح بھی اسی سال کیا تھا اور بارہ برس کے ایک لڑکے ـــــ ابن عرب شاہ ـــــ میں انھیں نہ معلوم کیا خوبی نظر آئی کہ اسے اس کی والدہ اور بھائیوں سمیت سمرقند بھیج دیا۔ اس بچے ابن عرب شاہ نے جب ہوش سنبھالا تو امیر تیمور کے خاندان کے متعلق معلومات حاصل کیں، پھر اپنے دائرہ علم کو اور بڑھایا اور اس خاندان کی تاریخ اور اپنے دور کے حالات عربی زبان میں تحریر کیے ان کی یہ تصنیف ـــــ امیر تیمور کی سوانح عمری ـــــ تقریباً دو سو سال تک گوشہ گمنامی میں

پڑی رہی۔ مشہور مستشرق جیکب گولیس نے اس مخطوطے کو ایڈٹ کیا پھر عربی سے انگلش میں منتقل کی، 1636ء میں غالبًا ہالینڈ سے اس کی یہ کاوش طبع ہوئی اور پھر مسلمان دنیا اور مغربی فضلاء نے ابن خلدون کا حقیقی مقام جانا۔

ایک اور مغربی فاضل اور مستشرق ڈاکٹر فشل (Walter J.Fischel)، جو کیلی فورنیا یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھے انھوں نے جب اس کتاب میں یہ پڑھا کہ حضرت امیر تیمور گورگانی اور علامہ ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ کی آپس میں ملاقات ہوئی تھی تو انھوں نے یہ جستجو شروع کی کہ کسی طرح یہ معلوم ہو سکے کہ ان دو عظیم ہستیوں کی باہمی ملاقاتوں کی تفاصیل کیا ہیں۔ وہ واحد شخص جو حضرت امیر تیمور گورگانی کی طرف سے شاہی ترجمان مقرر کیا گیا تھا اور ان دو ہستیوں کی گفتگو ایک دوسرے تک پہنچا رہا تھا، عبد الجبار نعمان تھا۔ ڈاکٹر فشل نے اس کی باقیات کی طرف رجوع کیا لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ڈاکٹر فشل نے ہر طرف سے مایوس ہوکر ''تاریخ ابن خلدون'' کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ابن خلدون نے اس تاریخ کے آخر پر اپنی سوانح عمری لکھی ہے لیکن 1395ء کے سال پر پہنچ کر ان کا قلم رُک اور خود نوشت کے صفحات خشک ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر فشل نے ہمت نہیں ہاری اور یہ طے کیا کہ اس تاریخ کے قلمی نسخے تلاش کرنے چاہئیں شاید کوئی ایسا نسخہ مل جائے جس کے آخر پر 1395ء کے بعد کے حالات بھی درج ہوں کیونکہ ان دو بڑی ہستیوں کی ملاقات تو 1401ء میں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر فشل نے اسی غرض سے 1950ء میں ترکی کا سفر کیا اور اسی مقصد کے تحت وہاں کے کتب خانوں کی خاک چھانی۔ آخر کار انھیں اسعد آفندی کی لائبریری اور آیا صوفیا کے کتب خانے

میں تاریخ ابن خلدون کے دو ایسے نسخے مل گئے جن پر ابھی تک کام نہیں ہوا تھا اور ان میں ان تاریخی ملاقاتوں کا ذکر اور تفصیلات خود ابن خلدون کے قلم سے مرتب تھیں۔ اسی طرح کا ایک تیسرا نسخہ انھیں قاہرہ مصر میں ملا اور انہوں نے ان تینوں مخطوطات کو سامنے رکھ کر تاریخ ابن خلدون کے حواشی مرتب کیے اور تنقیدی اشارات بھی لکھے۔ عربی سے انگلش میں ترجمہ کیا اور اپنی انگلش کتاب ''ابن خلدون اور امیر تیمور'' (Ibn Khaldun and Tamer Lane) کو 1952ء میں کیلی فورنیا یونیورسٹی سے پہلی مرتبہ طبع کروایا۔

خارجیت اور ناصبیت

فرمایا: خارجیت اور ناصبیت ایسے فتنے نہیں ہیں جو کبھی ختم ہو جائیں گے۔ ناصبیت کا اصل مقصد حضرات اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم کی توہین اور ان پر سب وشتم ہے اور خارجیت نام ہے اس دہشت گردی کا جو ہر مذہب میں، اپنے مذہب کے نام پر کی جاتی ہے۔ جور وظلم، جبر، تشدد، خون ریزی اور ہر ایک کی توہین یہ خاص اجزاء ہیں خارجیت کے۔

محمد بن عبدالوہاب نے توحید وسنت کے نام پر جو پرتشدد تحریک برپا کی تھی وہ بھی تو خارجیت ہی تھی، اسی لیے علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اور اس کے پیروکاروں کو خارجی قرار دیا تھا۔ پاکستان میں ''طالبان'' اور ''پنج پیری'' حضرات کی پرتشدد جدوجہد بھی خارجیت ہی ہے اسی لیے تو یہ حضرات اپنے علاوہ کسی کو مسلمان بھی نہیں سمجھتے اور برملا شعائر کی توہین کرتے ہیں۔ والعیاذ باللہ. خواتین اور بچوں کو قتل کرنا، دھوکہ دینا، من گھڑت داستانیں سنانا، جھوٹ بولنا، اپنے کو مظلوم بنا کر پیش کرنا اور اپنے اوپر مصنوعی مظلومیت کا لبادہ اوڑھنا،

اپنے خارجی اور ناصبی دہشت گرد دوستوں کی قبروں سے خوشبو کا اُٹھنا، ذرا ذرا سی بات پر مسلمانوں سے بدگمانی اور پھر انھیں اغوا کر کے قتل اور تاوان وصول کرنا، یہ سب کچھ خارجیت نہیں تو اور کیا ہے؟

پہلے بھی تو ان خارجیوں نے ہی خلافت اسلامیہ کو تار تار کیا تھا۔ تین خارجی مکہ مکرمہ میں ملے اور اس وقت کے سیاسی حالات پر غور کر کے اس نتیجے پر پہنچے کہ اس وقت امت کے تمام مسائل کے ذمے دار

① امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ

② حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ

③ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، ہیں۔

لہٰذا اگر اسلام کی خدمت کرنی ہے اور اُمت مسلمہ کو آرام پہنچانا ہے تو ان تین افراد کو قتل کر دینا چاہیے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن ملجم مرادی نے کہا کہ وہ حضرت امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شہید کر دے گا۔ برک بن عبداللہ تمیمی نے کہا کہ میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو شہید کروں گا اور عمرو بن بکیر التمیمی نے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کو ختم کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ تینوں نے طے کیا کہ یہ کام ایک ہی رات میں کر دینا چاہیے۔ خواہ اکیس رمضان ہو اور خواہ ستائیس رمضان، یہ کارِ خیر سرانجام دے دینا چاہیے۔

دو بدبخت مصر چلے گئے کہ حضرت امیر معاویہ اور حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما وہیں تھے اور ایک بدبخت نے کوفہ کا رُخ کیا جو اس وقت دارالخلافہ تھا اور حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ خود وہاں تشریف فرما تھے۔

عبدالرحمٰن بن ملجم فاسق اپنے خارجی دوستوں سے ملا اور حضرت خلیفہ راشد امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ کو شہید کرنے کے لیے مسجد کوفہ میں آ گیا۔

ادھر حضرت امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے تو اپنے صاحبزادے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ بیٹے مجھے ابھی خواب میں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور میں نے ان سے امت کی شکایت کی ہے کہ ان لوگوں نے مجھے بہت تکلیف دی ہے اور میری دشمنی میں انہوں نے صدق وصفا کا رستہ ترک کر دیا ہے۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا علی پھر ان کے لیے بددعا مانگو۔ تو میں نے دعا مانگی کہ اے پروردگار مجھے اس امت سے بہتر لوگ عنایت فرما اور اس امت کو میرے بعد مجھ سے کم درجے کے لوگ مقدر فرما۔

پھر حضرت امیر المومنین سیدنا علی رضی اللہ عنہ مسجد تشریف لے گئے۔ ابن ذباح موذن آیا اور اس نے اذان دی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ لوگوں کو نیند سے اُٹھا رہے تھے اور بار بار نماز کے لیے فرما رہے تھے کہ عبدالرحمٰن بن ملجم اُٹھا، آگے بڑھا اور تلوار سیدھی حضرت رضی اللہ عنہ کے سر مبارک پر دے ماری۔ اس قدر شدید وار تھا کہ تلوار دماغ تک پہنچ گئی۔ لوگ چاروں طرف سے دوڑ پڑے اور اس بدبخت کو پکڑ لیا گیا۔ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو جمعہ کی صبح ایسے زخمی کیا گیا پھر وہ ہفتہ کے دن بھی حیات رہے اور اتوار کی رات کو شہید ہو کر واصل بحق ہوئے۔ حضرات حسنین اور عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہم نے غسل دیا۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور عبدالرحمٰن بن ملجم جو قید میں تھا، اس کے چاروں ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے گئے۔ کھجوروں کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک بڑا ڈبہ (قوصرہ) جو کہ شاخوں سے بنایا جاتا تھا، اس میں اسے بند کیا گیا تھا، اسے نکالا گیا اور بالآخر اس بدبخت فاسق جہنمی کو زندہ جلا دیا گیا۔

شہر قنسرین، جسے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے فتح کیا تھا.

فرمایا تاریخ کی کتابوں میں ایک شہر ''قنسرین'' کا نام بہت ملتا ہے۔ یہ شام کا ایک شہر تھا اور ماضی قدیم میں تجارت وصنعت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ شام ہی کے مشہور شہر حلب کے جنوب میں ہے اور اب جب ہم اسے دیکھنے گئے تو بالکل ایک قصبے کی مانند دیکھا۔ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حمص کے بعد اسے فتح فرمایا تھا۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی یہاں تشریف لاتے رہے ہیں۔

قرامطہ کی تاریخ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''فضائح الباطنیہ''.

فرمایا مسلمانوں کی تاریخ میں جو ہم ایک فرقہ ''قرامطہ'' یا ''قرمطیہ'' کے نام سے پڑھتے ہیں یہ فرقہ دراصل ان اسمٰعیلی شیعہ ہی کی ایک شاخ ہے، جو اسمٰعیلی شیعہ اب بھی پائے جاتے ہیں۔ ''حمدان قرمط'' ایک جاہل صوفی تھا اور اس کی طبیعت میں فطری طور پر یہ بات تھی کہ وہ کوئی ایسا علم ڈھونڈنا چاہتا تھا جس میں ''اسرار ورموز'' پائے جاتے ہوں۔ کثرت عبادت کی وجہ سے اس میں زہد اور ورع کے آثار تھے اور کوفہ میں رہتا تھا۔ ایک دن اس کی ملاقات ایک باطنی شیعہ سے ہوئی اور باطنی شیعہ ہمیشہ اس بات کے قائل رہے ہیں کہ نصوص شرعیہ میں ضرور رموز واشارات پائے جاتے ہیں جو کہ عوام کو معلوم نہیں ہوتے، صرف خواص ہی جانتے ہیں۔ جنت، جہنم، وضو، نماز، جنابت یہ ان اعمال کا نام

نہیں ہے، جو یہ عوام کرتے ہیں بلکہ ان تمام الفاظ کی مراد کچھ اور ہی ہے جو کہ صرف باطنی جانتے ہیں۔

اس جاہل صوفی ''حمدان قرمط'' کی ملاقات جب اس اسماعیلی، باطنی شیعہ سے ہوئی تو وہ نہایت خوش ہوا کہ جن اسرار و رموز کی تلاش اسے تھی، ان کا خزانہ تو اس باطنی داعی کے باطن میں پوشیدہ ہے۔ اس نے بار بار التجا کی کہ وہ خزانہ اس کے سینے میں منتقل کر دیا جائے تو آخر کار اس باطنی اسمٰعیلی شیعہ نے اس سے کہا کہ ایک ''سرِّ مخزون'' (نہایت گہرا راز) ہے جو صرف ثقہ آدمیوں ہی کو بتایا جا سکتا ہے پھر وہ ثقہ آدمی بننے کے لیے عہد و پیمان ہوئے۔ اس ''سرِ مخزون'' کا القاء اس پر کیا گیا۔ اس جاہل داعی نے اس ان پڑھ صوفی کو اسرار و رموز سکھائے اور ''حمدان قرمط'' کو خلافت ملی۔ اس نے اپنا حلقہ جمایا اور شیاطین اپنے انسان دوستوں کو یہ القاء کرتے رہے کہ اس حلقے میں داخل ہو جاؤ۔ اس حلقے کا نام آہستہ آہستہ ''قرامطہ'' ہوا اور پھر عالم اسلام میں ان قرامطیوں نے اس قدر زور پکڑا کہ بغداد کی خلافت ان کی بیخ کنی میں ناکام ہوگئی۔ خلافت نے اس مقصد کے لیے حضرت یمین الدولۃ سلطان محمود غزنوی کو درخواست بھیجی۔ وہ غزنی (افغانستان) سے اُٹھے اور اس وقت قرامطہ کا اہم مرکز ملتان تھا، اس پر حملہ کر کے قرامطہ کا قتل عام کیا اور برصغیر کو ان باطنی ''اسرار و رموز'' کے مدعیان سے نجات دلائی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولوی جس کے دل سے مال اور عہدے کے محبت نہ ختم ہوئی ہو اور اس کا تزکیہ باطن نہ ہوا ہو اور صوفی جس نے باقاعدہ علم حاصل نہ کیا ہو، اس اُمت کے بہت بڑے فتنے ہیں۔ مسلمانوں کا دین اور دنیا انہی دو طبقوں کے ہاتھ سے برباد ہوا ہے۔ اس

لیے مسئلہ کبھی ایسے مولوی سے دریافت نہیں کرنا چاہیے جو مال اور عہدے کی محبت میں گرفتار ہے۔ حب دنیا اس کے رگ و ریشے میں سمائی ہوئی ہے۔ مال اور عہدہ یقیناً ضرورت ہے لیکن ''محبوبہ'' نہیں ہے کہ اس کی خاطر دین، عاقبت، ایمان اور زندگی گذارنے کے شریفانہ اصول سب نذرِ طاقِ نسیاں کر دیے جائیں اور اصلاح نفس کے لیے اپنا ہاتھ کبھی ایسے صوفی کے ہاتھ میں نہیں دینا چاہیے جو جاہل ہو۔

مدینہ منورہ میں کئی ایک صوفی ایسے دیکھے جنھیں ''حضوری'' کہا جاتا تھا یعنی وہ ایسے بزرگ تھے کہ ہر لمحہ، ہر آن، حضور اقدس ﷺ کے دربار میں حاضر رہتے تھے۔ معلوم نہیں وہ اس دولت سے مشرف تھے یا نہیں لیکن انھیں مسجد نبوی میں نماز پڑھتے ہوئے بارہا دیکھا اور ان کی نماز سنت کے مطابق نہیں تھی۔ سو جنھیں نماز تک سنت کے مطابق نہ پڑھنی آتی ہو، وہ اس درجے پر کیسے فائز تھے واللہ اعلم. کُل دنیا میں ان کے بدعتی مرید اُن کے گن گاتے ہیں اور بدعات کی ترویج میں خوش ہیں۔ انکار اس سے نہیں کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ کے ہاں حاضری نہیں ہوتی، انکار اس سے ہے کہ جاہل صوفی اس مقام پر نہیں پہنچتا۔ وہ اپنی قوت خیال ہی کے الجھاؤ میں مبتلا ہوتا ہے اور ایسا گم ہوتا ہے کہ عالم خیال سے باہر اس کی دنیا کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ہر وقت حضرت رسالت پناہ ﷺ کے تصور میں ڈوبا رہتا ہے اور اس کا یہی خیال کبھی کبھی جسم کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ کی زیارت ہو رہی ہے اور در حقیقت وہ اپنے خیال ہی کو مجسم صورت میں دیکھ رہا ہوتا ہے۔ اصل جسد مبارک اور چہرۂ انور جو مرقد منورہ میں موجود اور خوش و خرم و تازہ بتازہ ہے اس کو، اور جو کچھ یہ جاہل، اپنے خیالات میں الجھا ہوا، صوفی

دیکھتا ہے ان دونوں چہروں میں زمین وآسمان کا فرق ہوتا ہے، ایک حقیقت ہے اور ایک محض خیال ہے۔ ایک کا تعلق عقیدے سے ہے اور دوسرے کا تعلق قوت واہمہ سے ہے۔

ایسے جاہل صوفیوں کو کشف بھی ہوتے ہیں۔ اور کرامات بھی بظاہر سرزد ہوتی ہیں لیکن یہ ایک جہان کو ڈبو دیتے ہیں۔ عوام الناس اس ''حمدان قرمط'' کے ویسے ہی پیرو کار نہیں بن گئے تھے اور وہ بھی اتنی بڑی تعداد میں کہ ایک پورا فرقہ ''قرامطہ'' وجود پذیر ہوا۔ ان لوگوں نے بھی اس جاہل صوفی ''حمدان قرمط'' میں کچھ کرامتیں دیکھی تھیں جو درحقیقت اِستدراج تھا۔ ایسے ہی یہ اپنے آپ کو ''حضوری'' کہنے والے صوفی، انھیں اشاعرہ، ماتریدیہ کے عقائد تک کی خبر نہیں ہوتی، نماز فقہی اعتبار سے درست نہیں ہوتی، لیکن یہ ''حضوری'' ہوتے ہیں اور دین کے ''اسرار ورموز'' انہی کی مجالس میں ملتے ہیں۔ ایسے مولوی اور صوفی خود بھی گمراہ اور ان کی پیروی کرنے والے بھی گمراہ۔ اعاذنا اللّٰہ من علماء السّو و صوفیاء السّو.

ایسے گمراہوں سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''فضائح الباطنیہ'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا لونڈوں کی حکومت سے پناہ مانگنا.

فرمایا کتب احادیث و اسماء الرجال میں بہت صراحت سے یہ بات آئی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بکثرت یہ دعا مانگتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انھیں لونڈوں کی حکومت اور ٦٠ھ کے سال سے اپنی پناہ میں رکھے۔ چنانچہ وہ ٦٠ھ کا چاند نہیں دیکھنے پائے اور

۵۹ھ ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور کوئی مؤرخ اس بات کی تردید نہیں کرسکتا کہ یہ پہلا لونڈا جو حکومت میں آیا ہے وہ یزید بن معاویہ تھا اور اس نے ۶۰ھ میں حکومت سنبھالی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ پیش گوئی یا اس سال کے متعلق حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر نہ سنا ہوتا تو پھر ان کے پاس اور کون سا ذریعہ علم تھا کہ وہ اس سال اور لونڈوں کی حکومت سے پناہ مانگتے تھے۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں جو علم کے دو برتن عنایت فرمائے تھے یہ پیشین گوئی بھی دوسرے برتن ہی سے ظاہر کی جاتی تھی۔ اس لیے اہل السنۃ والجماعۃ کے آئمہ اور اہل علم نے جو یزید کی مسلسل مذمت اور اس کے فسق کی تصریحات کی ہیں وہ بے بنیاد اور بے سبب نہیں ہیں۔

کیا جنت البقیع اور جنت المعلیٰ میں تدفین قابل فخر ہے؟
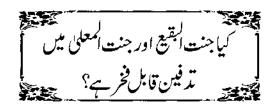
(فرمایا) تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت البقیع اور جنت المعلیٰ میں منافقین، معتزلہ، قدریہ، خوارج اور روافض تک کی تدفین ہوئی ہے۔ اس لیے کسی بھی فرقے کا یہ فخر کرنا کہ ہمارے اتنے اکابر پیوندِ بقیع اور جنت المعلیٰ ہوئے، بے جا فخر اور بے کار کی بات ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مدفون کا عقیدہ کیا تھا؟ اعمال اہل السنۃ والجماعۃ کے مطابق تھے یا پھر عمر بھر بدعتی رہے اور اپنے پیچھے بھی بدعات کا ایک سلسلہ چھوڑ گئے۔ جو رافضی یا معتزلی عمر بھر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو برا کہتا رہا، جنت البقیع یا جنت المعلیٰ کی تدفین اس کے عذاب میں کس حد تک کمی کرسکے گی؟ جاہل صوفی
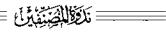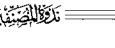
کتاب وسنت کی نصوص ہونے کے باوجود بدعات کی ترویج کرتا رہا تو مدینہ منورہ یا مکہ مکرمہ کا قیام اور تدفین اسے کیا نفع پہنچائے گی۔ اس لیے اصل بات صحیح عقیدہ، پھر صحیح علم اور پھر اس صحیح علم پر صحیح عمل اور پھر عمل میں بھی اخلاص ہے۔ راہ صاف لیکن پیچ در پیچ ہے، خطر در خطر ہے۔ محض جنت البقیع یا جنت المعلیٰ کی تدفین پر سہارا کر لینا اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

۶ خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

(فرمایا) تاریخ بتاتی ہے کہ وہ علمی مراکز اور خانقاہیں بالآخر اُجڑ کر رہیں جہاں رِیت یہ چلی کہ باپ کے بعد بیٹے کو جانشین بنایا جائے۔ اس بات سے قطع نظر کہ شریعت کا ایک بالکل واضح حکم موجود ہے کہ امانتیں اہل لوگوں کے سپرد کی جائیں لیکن اس حکم کی خلاف ورزی کی گئی۔ خلفاء اہل تھے کہ گدی اور خانقاہ سنبھالیں۔ شاگرد اس لائق تھے کہ جائے استاد کو بحسن و خوبی پُر کر دیں لیکن کہیں تو صاحبِ مدرسہ وسجادہ خود نااہل تھے یہ وصیت کر کے مرے کہ میرے بیٹے کو میرا جانشین بنایا جائے اور کہیں علماء و مشائخ نے فیصلہ نہیں کیا تو ان کے بعد مدرسہ و خانقاہ کا فیصلہ بد دیانت افراد نے کیا اور صاحبزادگان کے حوالے علمی مراکز اور خانقاہیں کر دی گئیں اور یہ کچھ برباد ہو کر رہ گیا۔ صاحبزادے جو اس مثل کا مصداق تھے ''پڑھا نہ لکھا اور نام محمد فاضل'' اور صاحبزادے جو اس شعر کا مصداق تھے:

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے

خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

فضلاء و متوسلین کے مرجع و ماویٰ بن گئے اور تاریخ اس بات کی گواہ بنی کہ علم کے منابع اور اخلاقیات کے گہوارے، بازیچہ اطفال ہوئے۔

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ان کے کئی سو خلفاء میں سے حضرت نصیر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، جانشین و سجادہ نشین قرار پائے۔ وہ بہت بلند ہمت اور معتدل آدمی تھے۔ خانقاہ والوں نے کوئی کام کرنا چاہا تو انھوں نے منع فرمادیا۔ اہل خانقاہ نے کہا کہ یہ رسم تو مشائخ کرام رحمۃ اللہ علیہم کے دور سے چلی آتی ہے تو شیخ نے فرمایا دین کتاب و سنت سے ثابت ہوتا ہے نہ کہ مشائخ کے عمل سے۔ان کا عمل کوئی شرعی دلیل نہیں اس لیے اس رسم ہی کو ختم کر دیا۔ ان کا انتقال 757ھ میں ہوا۔ ان کے زمانے میں بھی نااہل صاحبزادوں کی سجادہ نشینی ہوا کرتی تھی اور تصوف جو ''بازیچۂ اطفال'' بنا تھا اس کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا۔ حضرت نصیر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ان حالات سے بہت کبیدہ خاطر تھے اور فرماتے تھے:

من چہ لائقم کہ شیخی کنم ، امروز خود ایں کار بازی بچگان شد

(میں کہاں اس بات کا اہل ہوں کہ شیخ بن کر خانقاہ میں بیٹھوں حالت یہ ہے کہ ہمارے دور میں تصوف بچوں کا کھیل بن کر رہ گیا ہے)

ہمارے شیخ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں بھی یہی فساد تھا کہ بلند ہمت صوفی ناپید ہو گئے تھے۔ خانقاہوں میں محض موروثی سلسلے تھے اور
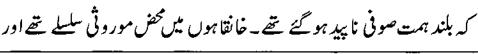
مشائخ سلسلہ چشتیہ، قادریہ اور سہروردیہ رحمۃ اللہ علیہم کی خانقاہیں اس مرض کا شکار تھیں۔ تاریخ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ماتم پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے کہ حضرت ان الفاظ میں نالہ کناں تھے:

فقراء ایں زمانہ اکثر در مقام ربّی و اکتفا اقامت دارند صحبت ایشان سمّ قاتل است فر منہم کما تفر من الاسد۔

ترجمہ: ہمارے زمانے کے اکثر صوفی اس مقام پر اکتفاء کر کے بیٹھ گئے ہیں جو انھیں (موروثی طور پر) ملا ہے۔ قرب الٰہی میں ترقی کی نہ انھیں طلب ہے اور نہ وہ بلند ہمت ہیں۔ ایسے صوفیوں کی صحبت وہ زہر ہے جو زندگی کو ختم کر دیتا ہے۔ ان نااہل صوفیوں کی صحبت سے ایسے بچو جیسے کہ آدمی شیر (درندے) کی درندگی سے بچتا ہے۔

حضرت نصیر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس صورتحال سے تنگ آ کر عجیب طریقے سے احتجاج کیا۔ مشائخ چشتیہ کے تبرکات ہی کو اپنے ساتھ لے کر چل دیے کہ اس زمانے کے فقراء ان انعامات کے اہل ہی نہیں ہیں۔ ان کے مشائخ سے جو اشیاء انھیں ملی تھیں، فرمایا کہ میری تدفین کے وقت میرے شیخ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کا خرقہ میرے سینے پر، انہوں نے جو عبا عنایت فرمائی تھی میرے برابر، ان کی تسبیح میری انگشت شہادت پر لپیٹ، ان کا لکڑی کا پیالہ جس میں وہ پانی پیتے تھے میرے سر کے نیچے اور ان کے مبارک جوتے میری آغوش میں رکھ کر میری قبر کو بند کر دیں۔ ان کے خلفاء اگرچہ علم و عمل میں اپنے دور کے بے مثال افراد تھے

لیکن وہ اس دور کے نالائق صاحبزادوں اور نااہل خلفاء کے میدان تصوف میں گھس آنے کے سخت خلاف اور ان موروثی خانقاہوں کی جانشینی کی روش سے نالاں تھے۔

حضرت فخرالدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی مشہور خانقاہیں جنہوں نے اپنے دور میں تزکیہ وتصوف کے بازار گرم کیے رکھے اور جن کے نفوس قدسیہ نے امت کی مسیحائی کی وہ کیوں اُجڑ کر رہ گئیں؟

گولڑہ شریف، سیال شریف اور حضرت شاہ سلیمان تونسوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ، تونسہ شریف جہاں سے سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں افراد نے اپنی نفسیاتی بیماریوں سے نجات پائی، یہ شفا کے مراکز کیوں برباد ہوئے؟ اس لیے کہ صاحبزادگی کی روش شروع ہوئی، نااہل صاحبزادوں نے ان خانقاہوں کو سنبھالا اورخود ان مشائخ کرام رحمۃ اللہ علیہم کا قصور بھی تھا کہ انھوں نے دھڑا دھڑ نااہل لوگوں کو خلافتیں دیں۔ ان کا قصور بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ وہ حضرات بشر تھے، امتی تھے، معصوم عن الخطاء نہ تھے۔ اہل السنہ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت خاتم النبیین، سیدالکونین، رسالت مآب وعصمت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم المعصومین بھی تھے۔ اپنے مشائخ کو معصوم جاننا یا ان کی غلطیوں کی تاویل اس لیے کرنا کہ انھیں معصوم ثابت کیا جائے یا اپنی زبان وعمل سے یہ تاثر دینا کہ ہمارے اکابر معصوم تھے، یہ سب کچھ عقیدۂ اہل السنۃ والجماعۃ کے خلاف ہے۔

مدارس وخانقاہیں جب بھی نااہل لوگوں کے سپرد کی جائیں گی خلافتوں کو بغیر

سلوک طے کیسے دیا جائے گا۔ اپنے اپنے سلسلے کے اسباق طے کرائے بغیر دستار بندیاں ہوں گی۔ ذکر، اذکار اور مراقبات میں انہماک وثبات آئے بغیر لوگوں کو خلافتیں ملیں گی تو پھر تصوف کا وہی حشر ہوگا جو کہ آج گولڑہ شریف، سیال شریف اور تونسہ شریف میں ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلسلۂ چشتیہ نظامیہ ان وجوہ سے برباد ہوا اور پھر سلسلۂ چشتیہ صابریہ کا عروج شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آخر اس نظام کو قائم تو رکھنا ہے اور اس مبارک کام کے لیے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کو چنا گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء نے میدان تصوف کا معرکہ مارا وہ حضرات بہت بلند ہمت اور قرب الٰہی کے سمندروں کو پی جانے والے تھے ان کی طلب استسقاء کی پیاس تھی ہر صبح اور ہر شام وہ قرب الٰہی کے نئے میدان چاہتے تھے اور اپنے سلسلے کے اذکار و مراقبات میں ہمہ تن محو تھے۔ ان کی مستی وسوز دروں نے انھیں اوج ثریا پر مقیم کیا۔ علامہ اقبال کی رباعی ان کی تصویر ہے۔

ز رازی حکمت قرآں بیاموز   چراغے از چراغ او بر افروز
ولے ایں نکتہ را از من فرا گیر   کہ نتواں زیستن بے مستی وسوز

لیکن اللہ تعالیٰ کے قانون زوال سے کوئی مسند علم یا سلسلۂ تصوف مستثنیٰ نہیں ہے۔ اب سلسلۂ چشتیہ صابریہ اور دیوبندی مکتبۂ فکر کا زوال بھی شروع ہو چکا۔ ملاء اعلیٰ کا فیصلہ اب شاید ان کے خلاف ہے۔ سطوت علم ان کے مدارس سے ختم ہوتی جارہی ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سے لے کر آج تک یہ اپنے پاکستانی مدارس

صرف اور صرف ایک عالم دین ایسا پیدا نہیں کر سکے جو اپنے تبحر علمی کے ساتھ آئندہ آنے والی نسل کے لیے صرف اور صرف کوئی ایک ڈھنگ کی تفسیر ہی لکھ دیتا۔ کوئی فقہ حنفی کی تائید کے لیے صحاح ستہ کی کسی کتاب کی کوئی گراں مایہ شرح ہی لکھ دیتا۔ احادیث نبویہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی پر کوئی تحقیقی کتاب سامنے آتی اور ثلج الصدر کا کام دیتی۔ ان کا جو سرمایہ تھا ہندوستان ہی سے آیا تھا، وہیں کے فارغ التحصیل علماء کرام رحمہم اللہ باعث افتخار تھے۔ ''معارف القرآن'' نام کی تفاسیر انھوں نے ہی لکھی تھیں، صحیح بخاری اور مسلم کی شرح انہی کا کام تھا۔ فقہ حنفی کی تائید میں ''اعلاء السنن'' جیسی بے مثال کتاب انہی کا کارنامہ تھا۔ اس ملک میں پڑھنے والے علماء نے ایسے کارنامے انجام نہیں دیے جو کارنامے ان کے اسلاف کے تھے۔ انصاف شرط ہے، تعصب نہیں اور اس پر مزید یہ کہ ان کے اکابر جب تک کوئی شخص اپنے سلسلے کے اسباق اور مراقبات کی تکمیل نہ کر لیتا تھا اور بسا اوقات تکمیل کے باوجود جب تک رسوخ نہ آجاتا تھا خلافت کے نام سے کوسوں دور تھے، اور اب انہی اصاغر دیوبندی مشائخ کے ہاں خلافتوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ عہدوں کی وجہ سے خلافتیں مل رہی ہیں، خاندانوں کی وجہ سے نوازا جا رہا ہے۔ ملکوں اور مالی و مادی، اسباب و وسائل کی وجہ سے خلفاء کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ سفارشوں پر خلیفے بنائے جا رہے ہیں۔ موروثیت کے مرض کا شکار تو یہ بھی پچھلی چند دھائیوں سے ہیں اور ان تمام علاماتِ زوال کے باوجود یہ خوش فہمی ہے کہ ہم ''نِکو نامِ اکابر'' ہیں۔

؎ تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

شیخ فریدالدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کا فیض روحانی اور حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ

فرمایا حضرت شیخ شیوخِ عالم فرید الدین مسعود شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ اپنے سلسلۂ عالیہ چشتیہ کے مجدد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں دو خلفاء ایسے عنایت فرمائے کہ ان کا فیض اب تک تمام عالم میں جاری ہے۔ ایک تو حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ تھے ان سے سلسلہ چشتیہ نظامیہ کا ظہور ہوا اور دوسرا مبارک سلسلہ حضرت خواجہ صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو کہ سلسلہ چشتیہ صابریہ کہلاتا ہے اور ہمارے دور کے چنیدہ رجال کا راس سلسلے سے وابستہ ہیں۔ حضرت، شیخِ شیوخِ عالم مسعود شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کا مرض وفات چل رہا تھا کہ ان کے ایک خلیفہ سید محمد کرمانی رحمۃ اللہ علیہ مزاج پرسی کے لیے حاضر ہوئے۔ دیکھا تو جس کمرے میں حضرت صاحب فراش ہیں اس کے دروازے پر صاحبزادگان اور معتقدین کا ایک گروہ جمع ہے اور ان کی خواہش ہے کہ حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ ان تمام افراد میں سے کسی کو اپنا سجادہ نشین قرار دے دیں۔ چنانچہ اسی غرض سے یہ صاحبزادگان کسی کو بھی حجرے میں نہیں جانے دے

رہے۔ سید محمد کرمانی رحمۃ اللہ علیہ کا راستہ بھی روکا گیا لیکن وہ چونکہ خلفاء میں سے تھے اور ابھی دور دراز کا سفر کر کے دہلی سے آرہے تھے، اس لیے زیادہ مزاحمت نہ کی گئی اور وہ منع کرنے کا باوجود نہ رکے اور دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ کی قدم بوسی کی اور مزاج پرسی کی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مشائخ دہلی کے احوال دریافت فرمائے اور ان کے جی میں آیا کہ کہہ دیں کہ آپ کی علالت کی خبر دہلی پہنچ چکی ہے اور آپ کے چہیتے اور محبوب مرید حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے سلام بھی بھیجا ہے اور یہ عرض کیا ہے کہ آپ کی صحت یابی کے لیے دعا گو ہیں، لیکن رُک گئے اور تامل فرمایا کہ اگر میں نے یہ کہا اور حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ نے انھیں اپنا جانشین قرار دے دیا تو صاحبزادگان ناراض ہو جائیں گے اس لیے انہوں نے نہایت دانشمندی سے گفتگو کا آغاز کیا کہ حضرت دہلی کے فلاں فلاں مشائخ نے سلام پیش کیا ہے اور آپ کی صحت کے بارے میں متفکر ہیں اور سب سے آخر میں کہا کہ مولانا نظام الدین نے بھی سلام عرض کیا ہے۔ اور یہ کہ آپ کے لیے دعا مانگتے رہتے ہیں، تو حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ بزرگان چشت کے تبرکات یہاں سے لے کر دہلی انھیں دے دینا۔ گویا کہ حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا جانشین حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو بنا دیا۔ یہ اطلاع فوراً دروازے سے باہر نکلی اور سید محمد کرمانی رحمۃ اللہ علیہ مزاج پرسی سے فارغ ہو کر جونہی حجرے سے باہر آئے تو صاحبزادگان شدید ناراض ہوئے اور لڑ پڑے کہ یہ تم نے کیا کیا۔ سجادہ نشین تو ہم نے بننا ہے، مشائخ چشت کے تبرکات

تمھیں ہرگز نہیں دیے جائیں گے اور نہ ہی یہ سجادہ نشینی دہلی جائے گی۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے تو صرف دہلی کے مشائخ کا سلام اور دعا عرض کی تھی اور آخر پر حضرت نظام الدین کا تذکرہ بھی کیا تھا، سجادہ نشینی کا تو کوئی ذکر ہی نہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ اگر کسی پر کرم فرمائے تو میں کون ہوتا ہوں کہ اس راہ میں رکاوٹ بنوں۔ اسی اثنا میں حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا اور دہلی یہ خبر پہنچی تو حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ بغرض تعزیت اجودھن حاضر ہوئے۔ صاحبزادگان تو کسی صورت تبرکات مشائخ چشت انھیں سپرد کرنے کو تیار نہ تھے لیکن حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ کے داماد اور ممتاز خلیفہ شیخ بدرالدین اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ نے ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ کا عصا، خرقہ اور مصلیٰ ان کے حوالے کیا۔

صاحبزادگان اس حرکت پر سخت ناراض ہوئے اور اس جرم کی پاداش میں اپنے بہنوئی حضرت بدرالدین اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کو خانقاہ سے نکال باہر کیا۔ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تبرکات بسروچشم قبول کیے اور خاموشی سے خانقاہ چھوڑ، دہلی روانہ ہوگئے۔ خانقاہ میں جانشینی ہوئی اور حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے سلیمان کو بدرالدین کا لقب دے کر سجادہ نشین قرار دے دیا گیا۔ حضرت بدرالدین اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ اجودھن کی جامع مسجد میں تعلیم وتدریس میں مصروف ہوگئے اور خانقاہ اجودھن کے دروازے ان کے لیے اور ان کی اولاد کے لیے بند ہوگئے حتیٰ کہ حضرت اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا۔ صاحبزادگان کو چونکہ سجادہ نشینی عزیز تھی اس لیے اس انتقال کے بعد اپنی بیوہ بہن اور یتیم بھانجوں کے لیے بھی

یہ دروازے نہ کھلے۔

ان تمام حالات کی اطلاع دہلی پہنچ رہی تھی۔حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ تک جب یہ خبر پہنچی تو آپ نے اپنے شیخ کی صاحبزادی اور یتیم بچوں کو دہلی بلوالیا۔اور ان کی ایسی شاندار تعلیم وتربیت کی کہ وہ بچے جب اپنی جوانی کو پہنچے تو اپنے دور کے جید علماء قرار پائے۔
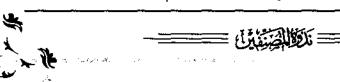
صاحبزادوں کو جس موروثی سجادہ نشینی پر ناز تھا اس کا قصہ یہ ہوا کہ شیخ بدرالدین کا انتقال ہوگیا۔اور حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ شیخ سلیمان کے بیٹے اور حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے شیخ علاء الدین کے تصرف میں چلی گئی۔سلسلہ وراثت ہونے کی وجہ سے وہ شیخ قرار پائے اور بیعت وارشاد کا سلسلہ جاری ہوا۔جب کہ ان سجادہ نشین شیخ علاء الدین صاحب کی عمر محض سولہ (16) برس کی تھی۔ تصوف کی ابجد بھی نہ جانتے تھے اور خانقاہ کو اس وراثت نے اجاڑ کرر کھ دیا۔پھر ان کے بیٹے شیخ معز الدین نے دہلی جا کر اپنے اثرات کا فائدہ اٹھایا اور سلطان محمد تغلق نے انھیں گجرات کا گورنر مقرر کردیا۔یہ اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر اپنے مخالفین کے ہاتھوں قتل ہوگئے اور ان کے بیٹے افضل الدین نے اجڑی خانقاہ سنبھال لی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

صاحبزادگان کے سلسلہ کا فیض تو جہاں تھا وہیں ختم ہوا اور چند ایک انتہائی معدود افراد کے علاوہ یہ سلسلہ کبھی اپنے برگ و بار نہ لا سکا اور وہ نظام الدین جو متبرکات مشائخ چشت کا نااہل سمجھا گیا اور جسے خاموشی سے خانقاہ چھوڑنی پڑی
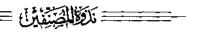
اس کے سلسلے کی دھوم کُل جگ میں رچی، بادشاہوں نے اس در پر اپنا سر رکھا، لاکھوں اس آستانے سے فیض یاب ہوئے اور کون شمار کرسکتا ہے اس مخلوق کو جس کے لیے سلسلہ چشتیہ نظامیہ ایمان اور عملِ صالح کا موجب بنا اور کون گن سکتا ہے ان گنہگاروں کو جو اس پاک سلسلے میں داخل ہوئے، معصیتِ خداوندی سے توبہ کی اور اپنے پروردگار کی رضا کے مستحق ٹھہرے۔ تجاوز اللّٰہ عنّا وعنھم.

وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نظریات کا تاریخی پس منظر

فرمایا وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود ان دو عظیم نظریات کو اگر تاریخ کے تناظر میں دیکھا جائے تو وحدۃ الوجود کا نظریہ قدیم صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے ہاں بھی پایا جاتا تھا۔ اس زمانے میں تصوف کے موضوع کی تحریرات اس حقیقت کی عکاسی کرتی ہیں لیکن غالباً سب سے پہلے حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے وحدۃ الوجود کے فلسفے کو علمی سطح پر، ببانگ دہل اس طرح بیان کیا کہ پوری عرب دنیا میں یہ آواز نہایت توجہ سے سنی گئی۔ ان کے معاصرین نے بھی ان کے اس نظریے کی تائید کی اور اس موضوع پر ان کی کتابیں بہت کثرت سے نقل ہوکر دنیا میں پھیل گئیں۔ پھر حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ بھی اسی فلسفۂ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ مثنوی مولانا روم میں انہوں نے جا بجا اس نظریے کی وکالت کی ہے اور مثنوی کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ اِدھر ان کے منہ سے نکلی اور اُدھر لوگوں کی

زبان پہ چڑھی۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے وحدتِ وجود پہ جو کچھ اپنی کتابوں میں تحریر فرمایا ہے، وہی مثنوی میں ہے، فرق صرف نظم اور نثر کا ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں مثنوی پھیلتی گئی وہاں وہاں یہ نظریات فروغ پاتے چلے گئے اور اس دور میں ہندوستان میں مشائخ چشت رحمۃ اللہ علیہم کا ڈنکا پٹ رہا تھا اور ان کے ہاں تو یہ آواز نا آشنا تھی۔ حضرت معین الدین چشتی اجمیری، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء اور حضرت خواجہ صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہم کے جتنے بھی مستند حالات میسر ہیں ان میں وحدۃ الوجود کی کوئی قابل ذکر بحث نہیں ملتی۔ حضرت خواجہ فرید الدین مسعود رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ان کیفیات کا تذکرہ ضرور ہے لیکن وحدۃ الوجود بطور کسی نظریے کے نہیں ہے۔

حضرت مسعود رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر سلسلہ سہروردیہ کے بہت بلند پایہ شیخِ وقت حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، ان کے ہاں بھی یہ بات نہیں ہے البتہ ان کے داماد اور خلیفہ شیخ فخر الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ فلسفہ وحدۃ الوجود میں فنا ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انہوں نے شام، عراق اور بلادِ عربیہ کا سفر کیا تھا اور اس وقت ان دیار میں سند تصوف کے صدر نشین شیخ صدر الدین قونوی رحمۃ اللہ علیہ تھے جو حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اجل، جانشین اور ان کی وجودی فکر کے ترجمان اور داعی تھے۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین اور ان کے معتقدین وحدۃ الوجود کے بحرِ محیط میں غرق تھے اور پورے عالم اسلام میں اس نظریے کی تائید میں کتابیں لکھی جا رہی تھیں اور مجالس گرم تھیں۔

ان حالات میں شیخ فخر الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیفات
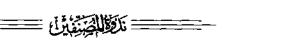
کو براہ راست شیخ صدرالدین قونوی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھا پھر اسی موضوع پر ان کی خط و کتابت اپنے برادر نسبتی (سالا) شیخ صدرالدین عارف ملتانی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ہوئی۔ ان تحریرات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فخر الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ پر وحدۃ الوجود کا رنگ جما اور ایسا رچا کہ انہوں نے اس کے جماؤ میں ''لمعات'' تحریر کی۔ وہ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے دیوانے ہوئے کہ بعد از مرگ دمشق میں انہی کے پہلو میں جگہ پائی۔ اب حضرت عراقی کے بیٹے شیخ کبیر الدین اپنے خاندانی مراسم نبھانے اور سیاحت کی غرض سے ملتان تشریف لاتے رہے اور پھر انہی کے ذریعے وحدۃ الوجود پر لکھی جانے والی حضرت ابن عربی، عراقی اور صدر الدین قونوی رحمہم اللہ کی کتابیں اور افکار یہاں پہنچے۔ حضرت نصیر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ خواجہ سید محمد گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ نے وحدۃ الوجود کے اثر کو قبول کیا اور حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی ''فصوص الحکم'' کی شرح بھی لکھی۔ نام گنوانے سے حیا مانع ہے لیکن وجودی مشائخ رحمہم اللہ نے اس فلسفے کو اتنا عام کیا کہ اس سے اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ بہت بری طرح متاثر ہوا۔ بہاری نے خدائی کا دعویٰ کیا اور سادہ لوح مریدوں نے اس میں تجلیات الٰہی کا دیدار کیا اور یہی وحدۃ الوجود ـــــ جو اپنے مقام پر ایک بالکل صحیح نظریہ تھا ـــــ کفر کا سبب بنا۔ مُسلّم مشائخ طریقت رحمہم اللہ کو ان کے عقیدے کی وضاحت کے لیے، فیروز شاہ تغلق نے دہلی طلب کیا۔ یہ وحدۃ الوجود، کچھ صوفیوں نے خالق و مخلوق کے اتحاد کا فلسفہ بنا دیا اور کثیر تعداد میں مخلوق خدا گمراہ ہوئی۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

کی کتاب ''اخبار الاخیار'' ان تمام گمراہ، کچے صوفیوں، بغیر سلوک کے اسباق طے ہوئے خلافتوں کے مدعیان اوران گمراہ مشائخ کے خلفاء کے حالات بیان کرتی ہے جنہوں نے خلافتیں تھوک کے حساب سے تقسیم کیں اور خلق کے عقیدے کو برباد کیا۔ عَرَفْتُ رَبِّیْ بِرَبِّیْ (میں نے اپنے پروردگار کو پروردگار ہی سے پہچانا) کے نعرے لگانے والوں نے صفات باری تعالیٰ کو اتحاد وحلول کے درجے میں پہنچادیا۔ صرف ہندوستان ہی نہیں شام، مصر، اردن، عراق، حرمین شریفین اور ترکی تک میں یہی نعرے بلند ہورہے تھے۔ ان گمراہ صوفیاء خذلھم اللّٰہ سے حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا واسطہ پڑا تھا تو وہ ان کی جتنی بھی مذمت کرتے، بجا تھا اورانہوں نے وہی کیا۔ اسی اتحاد وحلول کی ایک آواز، آخری دور میں دارا کی بھی سنائی دیتی ہے اس نے بھی تصوف ہی کے پردے میں گمراہی کی دعوت دی اور کفر اور اسلام کو یکجا کرنا چاہا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وحدۃ الوجود کا مسلک برحق اور بہت سے متبع سنت مشائخ کرام اور جلیل القدر اولیاء اللہ رحمۃ اللہ علیہم کا مسلک تھا اور اب تک ہے۔ لیکن اس مسلک حقہ کا پردہ اوڑھ کر گمراہوں نے اپنی گمراہی کو بھی خوب پھیلایا۔

وحدۃ الوجود کے علاوہ ایک مسلک وحدۃ الشہود کا بھی ہے۔ بات یہ نہیں ہے کہ حضرات صوفیاء متقدمین رحمۃ اللہ علیہم میں یہ مسلک نہیں تھا، بالکل تھا لیکن اس کی ایسی شہرت نہ تھی۔ حضرت شیخ علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۷۳۶ھ نے اس مسلک کو باقاعدہ اپنی کتابوں میں تحریر فرمایا۔ ان کی کتابیں العروۃ الوثقیٰ، چہل مجالس

جو کہ ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، دیوان کامل، آتشکدۂ وحدت پھر ان کے اور شیخ عبدالرزاق کاشانی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی ہے، اور ''مرشدومرید'' کے نام سے چھپی ہے، مجموعہ مصنفات شیخ سمنانی جو چھپا ہے، ان سب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحدۃ الشہود کی کیسی ترجمانی کرتے ہیں۔ انھیں وحدۃ الشہود سے ایسا تعلق تھا کہ اپنے ہم مشرب صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وفد ہندوستان بھجوایا تاکہ یہاں کے مشائخ کے سامنے اپنا نقطۂ نگاہ رکھیں اور اس کی تصدیق یا تردید کروائیں۔ ہرات، افغانستان سے جو راستہ ایران کو جاتا ہے، اس راہ پر ایران میں ایک مقام آتا ہے جس کا نام سِمْنَانْ ہے۔ حضرت علاء الدولہ اسی نسبت سے سِمْنَانی کہلاتے ہیں۔ رحمہ اللّٰہ رحمۃ کاملۃ واسعۃ . اس دور میں سمنان سے مُنیر صوبہ بہار ہندوستان آنا، کیا دشوار تھا، چنانچہ شہودی مشرب کے یہ اصحاب رحمۃ اللہ علیہم حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے اس مسلک کی تصویب فرمائی۔

حیرت ہے کہ یہ تصویب کیسے ہوئی یا اس وجہ سے کہ وہ نہایت وسیع القلب صوفی صافی تھے؟ وجہ حیرت یہ کہ شیخ منیری رحمۃ اللہ علیہ وحدۃ الوجود میں فنا تھے۔ اس فنائیت ہی کی وجہ سے تو شاہ فیروز تغلق کو انھیں دہلی بلانا پڑا تھا کہ ان کے عقیدے کی جانچ کریں۔ ان کے حاسدین نے سلطان فیروز تغلق کو جاکر یہ شکایت کی تھی کہ وہ اتحاد اور حلول کے قائل ہیں، حالانکہ یہ مطلقاً ان خرافات کے قائل نہ تھے البتہ وحدۃ الوجود کا ان پر غلبہ تھا اور حاسدوں کو تو پَر چاہیے ہوتا ہے تاکہ کوا بنا سکیں۔

سلطان فیروز تغلق کو اطمینان ہوا کہ یہ محض وجودی ہیں اور گمراہی نہیں پھیلا رہے تو پھر انھیں رخصت ملی۔ ایسے ہی وجہ حیرت یہ بھی ہے کہ کہاں تو حضرت منیری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ایسے شخص کے قتل پر احتجاج کیا جو اتحاد و حلول کا مدعی تھا اور سلطان فیروز تغلق نے حد شرعی کے تحت اسے قتل کرا دیا تھا اور کہاں یہ کہ انھوں نے وحدۃ الشہود کے نظریے کو بھی سر آنکھوں پر رکھ کر قبول فرمایا، یا پھر شاید یہ وجہ ہو کہ حضرت منیری رحمۃ اللہ علیہ نہایت وسیع المشرب تھے۔ تنگ نظر علماء کے گروہ سے نہ تھے۔ ان کی وفات کے جو حالات ان کے مسترشدین نے قلمبند کیے ہیں ان کے مطالعے سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے۔ سو شیخ علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریرات میں وحدۃ الشہود کو بیان کیا ہے ان کی یہی کتابیں ہندوستان اور افغانستان پہنچی ہیں اور یہاں کے مشائخ نے بھی ان کا مطالعہ فرمایا تھا۔ اسی لیے تو ہم جب حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں وہاں شیخ علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے کہ وحدۃ الوجود کے بعد راہ اور بھی ہے۔ انھیں خبر تھی کہ شاہسوار کو ابھی مزید گھڑ دوڑ میں حصہ لینا ہے، ان کی طلب ہر لحہ انھیں یہ کہتی تھی کہ

ع　مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

اور ان کی طلب بلا کی تھی۔ جتنی سیرابی ہوتی تھی اتنی ہی طلب بڑھتی تھی۔ ان کے اپنے خلیفہ اور مجدد دوراں حضرت سرہندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کے جو خلفاء و مریدین ان کے انتقال کے وقت موجود تھے، ان ثقات کی روایت

ہے کہ حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ نے وفات سے صرف ایک ہفتہ قبل دوران مرض یہ فرمایا:

مرا بعین الیقین معلوم شد کہ توحید کوچہ ایست تنگ، شاہراہ دیگر است۔

(میں عینی مشاہدے کے یقین کی طرح سے جانتا ہوں کہ وحدۃ الوجود ایک تنگ کوچہ ہے اور شاہراہ اس کے بعد ہے۔)

یہی بات حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ان سے پہلے کے جو مشائخ وحدۃ الشہود کے قائل تھے ان کی تصنیفات بھی کچھ عام نہ ہوئیں اور ان کے خلفاء نے اپنے اپنے سلاسل میں اس نظریے کی اشاعت بھی نہیں کی اور اگر کی بھی تو اس تاریخ تک تا حال رسائی نہیں ہو سکی، لیکن حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے اس نظریے کی اشاعت خوب ہوئی۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے درحقیقت اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ سے جو سلسلۂ چشتیہ یا قادریہ کا سلوک طے کیا تھا اسی میں وہ وحدۃ الوجود کی حقیقت کو پہنچ گئے تھے اور آپ جس قرب الٰہی کے متمنی و ملتمس تھے وہ استقصائے روحانیت تھا۔ آپ حضرت شیخ علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتب کا مطالعہ کرتے تھے۔ چنانچہ ہم ذات باری تعالیٰ کے متعلق مکتوبات شریف میں یہ جو اصطلاح پڑھتے ہیں کہ ذات اقدس وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے اس اصطلاح کا ترجمہ اگر اردو میں ہو تو ''اللہ تعالیٰ کی ذات عقل وفہم کی رسائی سے بالا و برتر اور ماورائے عقل'' سے ہوگا اور پنجابی میں ہو تو حضرت مولانا نور احمد صاحب پسروری ثم امرتسری محشی مکتوبات امام ربانی رحمۃ اللہ علیہ، امرتسر کی ٹھیٹھ پنجابی میں اس طرح فرمایا کرتے تھے ''اُتّے نالوں اُتوں اُتّے، پَریوں پَرے پَرے پَرے'' تو یہ

اصطلاح درحقیقت حضرت علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، جو انہوں نے اپنی کتابوں میں استعمال فرمائی ہے اور وہیں سے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے اخذ کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص انعام فرمایا اور ایسا انعام جو وہ صرف اپنے مقربان بارگاہ ہی پر فرماتے ہیں، حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی حاضری حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں ہوگئی۔ اب یہاں حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ وحدۃ الوجود (یکے میداند) سے وحدۃ الشہود (یکے می بیند) کی طرف منتقل ہوئے ہیں۔ اب یہاں پہنچ کر وہ جو خطوط اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کو تحریر فرماتے ہیں تو حضرت شیخ علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> کہ خودرا درین باب بحضرت شیخ علاؤالدولہ بسیار مناسب میبابد و در ذوق و حال درین مسئلہ بیشم مشارالیہ متفق است
>
> (اس عاجز نے اس راہ سلوک میں اپنے آپ کو حضرت شیخ علاؤالدولہ رحمۃ اللہ علیہ سے بہت ہم رنگ پایا ہے اور اس مسئلہ وحدۃ الشہود میں میرا ذوق اور حال حضرت شیخ علاؤالدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ سے بالکل متفق ہے۔)

اس مقام کے علاوہ بھی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ مختلف مقامات پر شیخ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کے جو حوالے دیتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اول تو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے رسائل پڑھے اور انھیں علمی انداز میں اپنایا اور پھر حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اور اسباقِ سلوک نے اس علم کو ان کا حال اور ذوق بنا دیا اور پھر حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے وحدۃ الشہود کا علم تھاما۔ اس میدان میں اس مقام تک پہنچے کہ ان

کے شیخ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی انگشت مبارک سے اشارہ کر کے فرماتے تھے کہ اس وحدۃ الشہود سے تو ہمیں اس نوجوان نے آگاہ کیا ہے۔

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور ان کے خطوط کے مطالعے سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہوتی ہے کہ وہ وحدۃ الشہود سے بھی بلند تر مقام پر پہنچ گئے تھے اور بذریعہ مراقبات ان کی رسائی ان مقامات تک ہوگئی تھی کہ غالباً اب تک کسی کو اس جہان کی خبر نہیں ہوئی۔ اگرچہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ نے ان مراقبات کو کوئی نام نہیں دیا لیکن ان کی تحریرات کو جو بھی غور سے پڑھے گا، اس بات کا اعتراف کرے گا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے قرب حقیقی سے انھیں نوازا تھا اور کچھ ایسی دنیاؤں سے بھی انھیں روشناس کرایا تھا، جن کا وجود بجز حضرات انبیاء علیہم السلام کے کوئی نہیں جانتا تھا۔ قرب الٰہی کی راہ بے انتہاء ہے اور وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود اس راہ کے سنگ میل ہیں، منزل نہیں کہ یہ دریائے ناپید ہے۔

ترقی طلب کیجئے ہر گھڑی
خدا بے نہایت ہے، راہ اس کی بڑی

اب تو خیر اس کام کو کون کرے گا لیکن ایک کرنے کا کام یہ ہے —— شاید کہ توفیق الٰہی کسی کے شامل حال ہو —— کوئی شخص حضرت خواجہ علاؤ الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کی تمام کتابوں کا مطالعہ کرے اور جو کچھ انہوں نے عالم کشف میں دیکھا یا جو جہان دریافت فرمایا ہے، اسے لکھے، پھر وہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے دریافت کردہ حقائق کو بھی ان کی تصانیف اور خاص طور سے مکتوبات شریف سے الگ کرے۔ پھر ان دونوں کا تقابل کر کے یہ لکھے کہ حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ علاؤ الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ
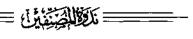
کے کشوف وحقائق پر کیا اضافے کیے ہیں؟ کون سی نئی دریافت ہے جو حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے قبل ہمیں نہیں ملتی؟ وحدۃ الشہود کی تاریخ میں اس سے قابلِ قدر اضافے ہوسکتے ہیں۔ اس لیے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ وحدۃ الشہود کا آغاز اور اس فلسفے کی دریافت حضرت مجدد الف ثانی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ سے ہی نہیں ہوئی بلکہ ان سے پہلے بھی صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے ہاں یہ حقائق ملتے ہیں لیکن اس نظریے کی اشاعت عوامی اور علمی سطح پر سب سے پہلے حضرت خواجہ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے سے ہوئی۔

بیت اللہ کے مقابلے میں بیت المقدس کی عظمت وشان بڑھانے والے اور ان کا انجام.

فرمایا تاریخ یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ جو عمارتیں اور مناسک اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتے ہیں، وہ ان کی حفاظت بھی کرتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کی تعظیم اور احترام بھی پیدا ہوتا ہے اور جو عمارات اور عبادت کے طریقے مصنوعی ہوتے ہیں، ان کی اساس وحی اور اخلاص نہیں ہوتا اور کسی کو نیچا دکھانے یا اپنے تفوق اور برتری کی بنا پر بنائے جاتے ہیں وہ جلد یا بدیر، تدریجاً مٹ جاتے ہیں۔ بنائے کعبۃ اللہ کا آغاز فرشتوں سے ہوا۔ پہلا گھر جو عبادت باری تعالیٰ کے لیے قائم ہوا، یہی تھا۔ نامعلوم صدیوں سے اس گھر میں عبادت ہو رہی ہے اور آج بھی لوگوں کے دل اس کی محبت سے معمور ہیں۔ اس کے مقابلے میں بنوامیہ نے یہ سعیِ مذموم کی کہ بیت المقدس کی شان کو بڑھائیں اور مسلمان بغرض عبادت اس

کی طرف متوجہ ہوں لیکن ان کا یہ ناٹک بہت جلد اپنے انجام کو پہنچ گیا۔
قصے کا آغاز یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی خلافت تھی اور اپنے ۹ سالہ دورِ حکومت میں وہی امیر حج ہوتے تھے۔ مکہ مکرمہ، منیٰ اور عرفات کے اجتماعات میں وہ خطبہ دیتے تھے اور برسر منبر بنوامیہ کے مظالم اور حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ان کا ''لعین وطرید'' ہونا بتاتے تھے۔ چونکہ ان کی خطابت بھی بلا کی تھی اور مسلمان بھی حج کی غرض سے مسلم دنیا کے اطراف واکناف سے حاضر ہوتے تھے، تو وہ ان تقاریر کا اثر لے کر لوٹتے تھے۔ اہل شام نے جب تسلسل کے ساتھ ان احادیث کو سنا تو ان کے دل بنوامیہ کی محبت کی بجائے نفرت سے بھرنے لگے۔ عبدالملک بن مروان نے اس صورتحال سے تنگ آ کر حجاج کرام کے قافلے روکے اور لوگوں کو حج کرنے سے منع کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان اُمویوں نے مسجد اقصیٰ اور صخرۂ سلیمانی پر گنبد بنانا شروع کر دیا۔ دنیا بھر کے معروف کاریگر بلائے گئے، خزانوں کا منہ کھول دیا گیا۔ حضرت رجاء بن حیوٰۃ اور یزید بن سلام کو نگران مقرر کیا گیا کہ کوئی مالی بدعنوانی نہ ہونے پائے اور تعمیرات اعلیٰ درجے کی ہوں۔ رنگین سنگِ مرمر، اس کے ستون اور نہایت قیمتی ہیرے اور جواہرات اس عمارت میں جڑے گئے۔ اعلیٰ نوع کے ریشمی پردے لٹکائے گئے۔ نوکروں کی فوج بھرتی ہوئی اور خوشبودار لکڑیوں کا بخور تو اس قدر جلایا گیا کہ جب ہوا چلتی تو یہ مہک میلوں تک پھیل جاتی۔ جو کوئی یہاں نماز ادا کرتا یہ بخور اس کے کپڑوں میں اتنا مہک جاتا کہ دور دراز کا سفر کر

کے جب گھر واپس پہنچتا تو اس کے اہل خانہ بھی اس خوشبو سے اپنا نصیب حاصل کرتے۔ سونے اور چاندی کی شمعیں روشن کی گئیں اور انہی سے بنی ہوئی زنجیروں سے ان قنادیل کو لٹکایا گیا۔ اعلیٰ درجے کے قالین بچھے اور ایسے ''علماء و مشائخ'' بھی تیار کیے گئے جنہوں نے یہاں آنے کے فضائل پر خوب جھوٹی روایات گھڑیں اور پھیلائیں۔

دنیا میں یہ بات ہوتی چلی آئی ہے کہ کسی بھی تحریک کے اصل مقاصد جب نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور جماعت بغیر روح کے صرف ایک ڈھانچہ رہ جاتی ہے تو پھر اس میں نئی زندگی پیدا کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ ان کی آنے والی نسلیں صرف جھوٹی احادیث بیان کرتی ہیں تاکہ کسی طرح سے لوگ تحقیق کا دامن چھوڑ کر محض ان کے پھیلائے، سنے سنائے اور خود گھڑے ہوئے جھوٹے قصوں پر اعتبار کر کے اس فرد یا جماعت یا تحریک یا عمارت کو عارضی سہارا دے سکیں۔

جھوٹی روایات کے اَنبار لگائے گئے اور اس وقت کی مسلمان دنیا میں شاید اس سے زیادہ خوبصورت، دلکش، دیدہ زیب اور پرکشش عمارت، کوئی نہ تھی۔ ایک پتھر بھی لا کر رکھا گیا اور جیسے ہمارے دور میں دہلی میں ایک پاؤں کے نشان کے متعلق یہ جھوٹ بولا جاتا ہے کہ اس پتھر میں یہ جو نقش قدم ہے، یہ حضرت رسالت مآب ﷺ کا ہے، ایسے ہی ایک پتھر رکھا گیا اور اس میں پورا پاؤں جو ثبت تھا اس کے متعلق لوگوں کو یہ باور کرایا گیا کہ یہ نقش قدم، حضرت رسالت پناہ ﷺ کا ہے اور ہر

طرح کی دلکشی کے سامان اور روایات پھیلائی گئیں۔

اس دور کے بعض جاہل عوام کے لیے یہ ایک بہت بڑا امتحان بن گیا کہ اب کعبۃ اللہ کو جائیں یا بنوامیہ کے اس فریب کا رُخ کریں؟ اہل علم و دانش تو جانتے تھے کہ یہ سب کچھ آج ہے اور کل نہیں ہے۔ اَبرہہ نے بیت اللہ کو گرانے کی کوشش کی تھی اور وہ اس کے وجود کو ختم کرنا چاہتا تھا اور آج بنوامیہ کعبۃ اللہ کی معنویت کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو یہ بھی ایسے ہی خائب و خاسر ہوں گے جیسے کہ اَبرہہ ہوا تھا۔

جاہل عوام نے ادھر کا رخ کیا اور سادہ لوح مسلمان اس صخرۂ سلیمانی کے پاس پہنچ کر یوں ہی کھڑے ہوکر دعائیں مانگنے لگے جیسے کہ وہ ملتزم پر حاضری دیا کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ اب اس چٹان کا طواف بھی ہونے لگا۔ بنوامیہ کیوں منع کرتے، ان کی مراد برآئی اور پھر تمام مناسک حج وہاں ادا ہوئے۔ لوگ دس ذی الحجہ کو سر منڈانے لگے۔ اور منیٰ کی طرح یہاں بھی قربانیاں ہونے لگیں۔ الغرض بیت اللہ العظیم کے مقابلے میں ایک خودساختہ اُموی کعبہ قائم کرنے کی سرکاری سطح پر کوششیں ہوئیں۔

ولید بن عبدالملک نے اپنے امیرِ عراق خالد بن عبداللہ کو لکھا کہ مکہ مکرمہ سے باہر ایک کنواں کھدواؤ اور میرے نام پر سبیل جاری کرو۔ یہاں تک تو بات بہت عمدہ تھی کہ پیاس سے نجات تھی لیکن مزید حکم ہوا کہ اس کنویں کے پانی کو زمزم سے افضل قرار دینے کی کوشش کی جائے۔ لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ وہ
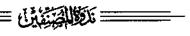
اس کنویں کے پانی کو زمزم سے زیادہ متبرک سمجھیں اور پھر اسی پر اکتفاء نہ ہوا بلکہ یہ نادر شاہی حکم جاری ہوا کہ زمزم کی مذمت کی جائے۔

یہ سب تماشے جاری رہے تاکہ بیت اللہ اور مناسک حج کی عظمت کو محو یا کم کیا جاسکے تا آنکہ بنو عباس نے ان کا تختہ الٹ دیا۔ قبریں کھود دی گئیں اور پہلا ظہرانہ ان کی لاشوں پر دسترخوان بچھا کر کیا گیا۔ ابو جعفر منصور ۱۴۰ھ، اپنے دورِ خلافت میں بیت المقدس حاضر ہوا اور حکم دیا کہ تمام قیمتی پتھر، سونا، چاندی اور جواہرات اُتار کر سرکاری خزانے میں داخل کیے جائیں۔ ریشمی پردے بھی اُتار دیے گئے اور ظالموں کے عہد کی یہ یادگار بھی ایسے مٹی جیسے کہ یہ ظالم خود مٹے۔ نیواں ناس گیا۔ عہد رفتہ کی داستان بنی۔

تلے سے کھینچ لے، مسند کو، آن کر فرّاش
اگر کہیں کہ مٹا، اُٹھ کے، چاندنی کا جھول

سدا رہے نام اللہ کا۔

قانون التاویل

فرمایا قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ ابن عربی مالکی ناصبی نے ''قانون التاویل'' بہت عمدہ کتاب لکھی ہے۔ اپنی زندگی کے تجربات بھی بیان کیے ہیں۔ علم تفسیر اور تاریخ سے بھی اعتناء کیا ہے۔ اس کا مطالعہ مؤرخ اور مفسر دونوں کے لیے یکساں نفع بخش ہے۔ پچیس برس قبل چھپی تھی اس لیے آج کل ناپید ہے مگر اپنے ہاں کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

شخصیات
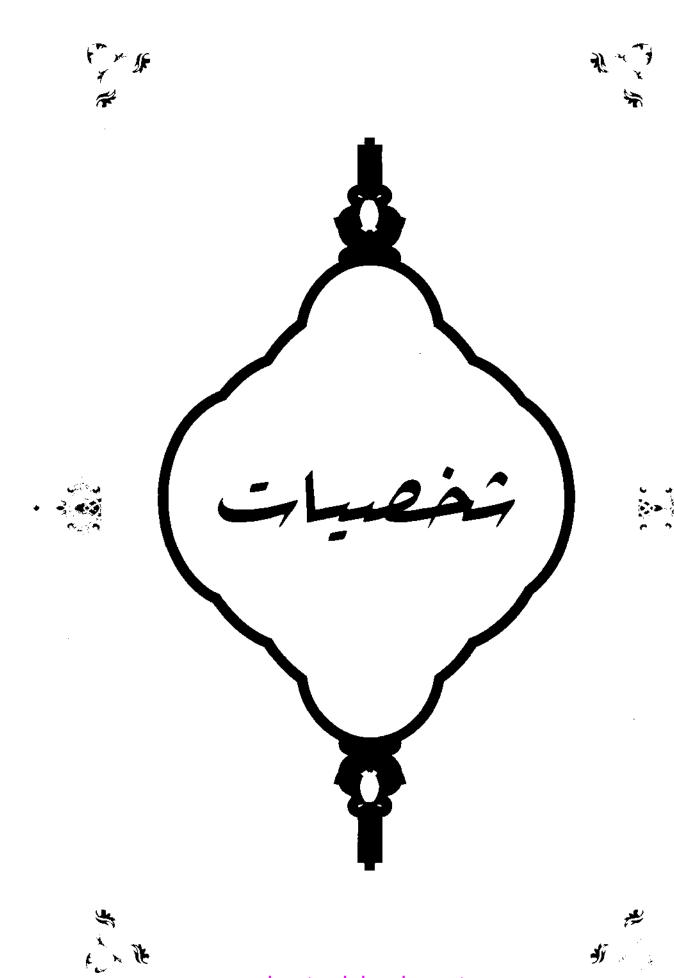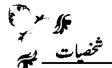
اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔

(پ:۲۲،سورۂ فاطر،آیت:۲۸)

اور ایسے ہی اللہ تعالیٰ (کی ذات پاک) سے، اُس کے بندوں میں سے وہی ڈریں گے جو صاحبانِ علم ہیں۔

ہردیال اور مولانا برکت اللہ بھوپالی امریکہ میں.
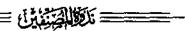
فرمایا آپ کے اس امریکہ میں ہردیال بھی آئے تھے۔ ہردیال کا نام آپ نے کیونکر سنا ہوگا؟ ہندوستان کی تحریک آزادی کا روشن ستارہ، دہلی کا خوش باش اور متمول نوجوان، پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فراغت کے بعد 1905ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور شعور مزید بیدار ہوا تو انہیں یقین ہو گیا کہ ہندوستان کے تمام مسائل کا اصل حل ''آزادی'' ہے۔ تعلیم کو چھوڑا اور لاہور واپس آکر آزادی کے متوالوں کو اپنے گرد جمع کیا۔ جے این چٹرجی، دینا ناتھ ہردیال، مولانا برکت اللہ بھوپالی سب اس ہردیال کے مداح تھے۔ پارٹی کا اصل نصب العین انگریزوں کو مارنا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے کارکنوں کو بم بنانے اور بم مارنے کی تربیت دی۔1912ء میں وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ پر دہلی میں قاتلانہ حملہ ہوا، بم پھینکا گیا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ یہ کارروائی ہردیال ہی کے ایما پر کی گئی تھی۔

اس زمانے میں چوہدری رحمت علی صاحب مرحوم (جنہوں نے پاکستان کا نام تجویز کیا تھا) نے ہندوستان کی تحریک آزادی کو تیز تر کرنے کے لیے تحریک کا خفیہ مرکز واشنگٹن میں قائم کیا تھا اور ایک ہوٹل خرید لیا تھا۔ ہوٹل کیا تھا یہ سب انقلابی وہاں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ ہردیال بھی وہاں جایا کرتے تھے۔ پھر ایک اور انقلابی ''رام چندر'' بھی وہاں پہنچ گئے۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی مرحوم اس زمانے میں فرانس میں تھے۔ چوہدری رحمت علی، رام چندر اور ہردیال نے بہت اصرار کر کے مولانا برکت اللہ مرحوم

کو اس ہوٹل میں بلایا اور یوں یہ انقلابی اکٹھے ہو گئے۔ برکلے یونیورسٹی بھی اس خفیہ تحریک کا ایک مرکز تھی۔ چنانچہ جب دہلی میں لارڈ ہارڈنگ پر بم کا حملہ ہوا تو ہردیال اس وقت برکلے ہی میں تھے۔ ہردیال کو 23 دسمبر کو یہ خبر ملی تو وہ برکلے میں خوشی سے ناچنے لگے۔ ہندوستانی خون کہاں سے نچلا بیٹھنے والا تھا۔ تمام نوجوان ہندو، مسلمان ان کے ساتھ ناچنے لگے اور آزادی، آزادی کے نعرے گونجنے لگے۔ ہردیال کا جوش ٹھنڈا نہیں پڑا اور اس نے اس بمبار کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک پمفلٹ ''حلقہ عہد جدید'' (Yugantar Circle) لکھا۔ وہ دور ہی ایسا تھا خود ہمارے شہر راولپنڈی میں D.A.V کالج روڈ پر چند طلباء نے مل کر ایک بم ساز فیکٹری قائم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا لیکن بعض عاقبت اندیش بزرگوں نے نصیحت کی کہ یہ کام نہ کرو، اور وہ رک گئے۔

ہر دور میں حصول خیر کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اپنے گردوپیش کی دنیا دیکھ کر ہی تعین کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے دور میں سب سے مؤثر طریقہ غیر مسلموں میں دعوت کا کام کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ دن دکھائے جب انصاف پسند، پڑھی لکھی اور مجبوریوں سے ماورا قوم کو خود ان کی زبان اور ان کی فہم کی سطح کے مطابق ہم اسلام کو پیش کر سکیں تو یہ دعوت ان کے لیے ضرور بالضرور مؤثر ثابت ہوگی اور اگر وہ اسلام کو سمجھ لیں تو دنیا بہت سے مصائب سے نجات پا جائے گی۔ اس دور میں طاقت کا استعمال مسائل میں اضافہ کرر ہا ہے، حل نہیں کر رہا۔

موہن سنگھ، راجہ مہندر پرتاب اور غدر اخبار.

فرمایا آپ کے اس امریکہ میں موہن سنگھ بھی تو آئے تھے، آپ نے کیوں ان کا نام سنا ہوگا اور پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہو، اس کا تو سوال ہی نہیں۔ وہ یہاں لکڑی کے کارخانے میں ایک ملازم تھے لیکن آزادی کی دُھن ایسی تھی کہ کیلیفورنیا میں ایک جلسہ رکھ لیا۔ ہردیال نے صدارت کی اور مولانا برکت اللہ بھوپالی تو شمع محفل تھے۔ انہوں نے ایک پارٹی بنانے کی ضرورت پر زور دیا اور اسی سال جب سیکرومنٹو میں مزدوروں کے سنٹر میں جلسہ ہوا تو I.A.P.C کے نام سے پارٹی تشکیل پائی۔ اس مخفف کی اصل ہے: Indian Association of Pacific Coast پارٹی تو بن گئی، اب کام کے لیے رقم درکار تھی۔ چنانچہ اسکی اپیل کی گئی تو اس وقت 1913ء میں ہندوستان کی آزادی کے لیے اسی جلسے میں لوگوں نے دس ہزار ڈالر سے زیادہ رقم جمع کرا دی۔

موہن سنگھ، ہرمن سنگھ، کرتار سنگھ، پنڈت جگت رام، ہرنادی، پانڈورنگ کھان کھوجی اور مولانا برکت اللہ بھوپالی یہ سب اس پارٹی کے لیڈر تھے۔ وڈ سٹریٹ نمبر 5 سان فرانسسکو (Wood Street No.5, San Fransisco) کے ایک مکان میں دفتر بنا اور اردو، گورمکھی اور ہندی تینوں زبانوں میں پارٹی کا ترجمان اخبار ''غدر'' نکلنا شروع ہوا۔ ''غدر'' کے اڈیٹر ہردیال اور مولانا برکت اللہ بھوپالی تھے۔ ''غدر'' دیکھتے ہی دیکھتے اپنے دور کا سب سے مقبول اخبار بن گیا۔ کتب، رسائل

اور اخبارات تو گن کر فروخت ہوتے ہیں مگر ''غدر'' ایسا نکلا کہ ٹنوں کے حساب سے تول کر مختلف ممالک میں بھیجا جاتا تھا۔ وی۔ڈی۔ ساورکر کی کتاب (The Indian War of Independence) کا اردو ترجمہ ''غدر'' میں بالاقساط چھپنے لگا اور اخبار کی مقبولیت کا عالم یہ تھا کہ آپ کے اس امریکہ کے علاوہ، آسٹریلیا اور یورپ میں اسکی مانگ پوری کرنا دشوار تھی۔

اس دور میں جرمنی بھی برطانوی امپیرلزم کے خلاف تھا۔ مولانا برکت اللہ بھوپالی نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا اور وہ ہندوستانی جو جرمنی میں رہتے تھے، انہوں نے تو مالی طور پر اس پارٹی سے بہت تعاون کیا۔ امریکہ میں جرمنی سفیر نے بھی مالی تعاون کیا۔ اخبار نے ہزاروں نوجوانوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کی اور یہاں تک کہ لوگوں نے اپنی ملازمتیں چھوڑ کر ہندوستان کا رُخ کیا کہ آزادی حاصل کریں۔ جاپان اور چین سے لوگ واپس آنے لگے اور حکومت ہند نے ان تمام آنے والوں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ کرتار سنگھ، سیوا سنگھ، بیر سنگھ، سریال سنگھ اور کیا کیا خوبصورت پنجابی سکھ نوجوان اور کس قد و کاٹھ کے گبرو تھے کہ اپنے وطن کی محبت میں اپنے گھر جانے کی بجائے، جیلوں میں جانے سے زیادہ خوشی اور فخر محسوس کرتے تھے۔ ان میں سے سردار کرتار سنگھ جسکی عمر صرف 18 برس تھی، انگریزوں نے پھانسی چڑھا دیا اور بقیہ لوگوں کو بھی شدید سزائیں دیں۔ جرم کیا تھا؟ صرف یہ کہ ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں اگر آپ ہریش کے پوری کی کتاب GADAR MOVEMENT, IDEOLOGY, ORGANIZATION AND STRATEGY. پڑھیں

تو آپ کو علم ہو کہ آزادی کے لیے مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں نے کیا کیا قربانیاں دیں۔ لیکن اب اس آزادی کے بعد غلامی کا دور یاد آتا ہے کہ کم سے کم اس دور میں جتنا انصاف تھا، وہ آج کے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے انصاف سے بڑھ کر ہی تھا۔ معاشی ترقی بھی اس دور میں زیادہ تھی اور نظم وضبط بھی آج سے پہلے، اس غلامی کے معاشرے میں زیادہ پایا جاتا تھا۔

مولانا برکت اللہ بھوپالی 1927ء میں بھی یہاں آئے تھے۔ اس سفر کے لیے انہوں نے جرمن فارن آفس سے 1000 مارک لے کر راجہ مہندر پرتاب ——— جو کہ اس وقت عالمی سطح کے ہندوستانی لیڈر تھے ——— کو دیئے تھے۔ اور پھر ڈیٹرائٹ (DETROIT) بھی تشریف لائے تھے۔ شکاگو بھی گئے تھے۔ پھر وہ آخر میں کیلی فورنیا چلے گئے تھے۔ ''غدر'' کے دفتر سے انہیں بہت محبت تھی۔ اس دفتر سے ہزاروں آدمیوں کو آزادی کی جدوجہد کے لیے آمادہ کیا گیا تھا۔ دفتر پہنچے تو شوگر کی وجہ سے بہت بیمار تھے۔ ہندو، مسلمان اور سکھ سب ہندوستانی جمع ہوئے۔ پرتپاک استقبال ہوا۔ مولانا یہ سب کچھ دیکھ کر رو پڑے اور لوگوں پر بھی ان آنسوؤں کا بہت اثر ہوا۔ فضا سوگوار ہوگئی اور پھر مولانا برکت اللہ صاحب نے تقریر کی۔ مولانا کی شوگر بہت بڑھ گئی اور پھر ستمبر 1927ء میں یہیں سیکرامنٹو ہی میں ان کا انتقال ہوگیا تھا۔ میٹرو ویل میں ان کی قبر بنی تھی۔ آپ لوگ تلاش کریں تو مل ہی جائے گی۔ وہاں جانا چاہیے، فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ ہم ہندوستانی ہوں یا پاکستانی، مولانا برکت اللہ بھوپالی نے آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی۔ ان کا ہم سب پر احسان ہے۔ سنا ہے کہ بھوپال،

ہندوستان میں کوئی یونیورسٹی بھی ان کے نام پہ بنی ہے۔ رحمہ اللّٰہ و طاب ثراہ.

مولوی ذکاء اللہ اور تاریخ ہند

(فرمایا) مولوی ذکاء اللہ مرحوم نے ہندوستان کی ایک بہت ضخیم تاریخ لکھی ہے، ریاضی اور سائنس کی کتابیں بھی سر سید احمد خان کی فرمائش پر لکھی تھیں اور یہ سر سید مرحوم کے دست راست تھے۔ اینڈریوز (Andrews) دہلی میں بہت باوجاہت انگریز افسر تھے، انہوں نے مولوی ذکاء اللہ صاحب مرحوم پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام تھا ''ذکاء اللہ آف دہلی'' اس کتاب کا اردو ترجمہ ہوکر، چھپ بھی گیا تھا لیکن اب نہ اصل کتاب ملتی ہے اور نہ اس کا ترجمہ۔ پڑھنے کی حسرت ہی ہے۔[1]

مولوی ذکاء اللہ مرحوم کی زندگی میں جو امور قابل تقلید تھے ان میں سے ایک کام ضبط اوقات بھی تھا۔ وقت کی پابندی مولوی صاحب مرحوم کی فطرت ثانیہ بن گئی تھی۔ یہ اور سر سید احمد خان صاحب کے صاحبزادے سید حامد گہرے دوست تھے۔ مولوی صاحب جس مکان میں رہتے تھے، اس میں ایک مرتبہ مرمت کی ضرورت پیش آئی تو اس مکان میں دن بھر تو مستری اور مزدور کام کرتے تھے اور رات کو مولوی صاحب شب بسری کے لیے تشریف لاتے تھے۔ پھر صبح ہوتے ہی وہ اپنے دوسرے مکان پر ناشتے کے لیے تشریف لے جاتے اور بقیہ وقت وہیں گذارتے۔ ایک مرتبہ جو صبح

① یہ حسرت اب پوری ہوچکی بحمدہ سبحانہ وتعالیٰ اصل کتاب اور اس کا اردو ترجمہ اب ہمارے ہاں کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

اپنے گھر سے نکلے اور دوسرے گھر جا رہے تھے تو عجیب منظر یہ دیکھا کہ سید حامد ہاتھ میں دستی گھڑی لیے کھڑے ہیں، مولوی صاحب ان کی یہ ہیئت دیکھ کر ہنس پڑے اور پوچھا ''سید حامد خیریت ہے، کیا کر رہے ہو؟'' وہ بولے ''کہ رات گھڑی کو چابی نہ دینے کی وجہ سے یہ بند ہوگئی اور وقت کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ چونکہ آپ کی چہل قدمی کا وقت معلوم تھا اس لیے آپ سے گھڑی کا وقت ملانے کھڑا ہوں''۔ مولوی ذکاءاللہ مرحوم ہنس پڑے اور فرمایا ''اچھا تو آپ مجھے گھڑی کے طور پر استعمال کر رہے ہیں''۔ دونوں دوست کھلکھلا کے ہنس دیئے اور دونوں چل پڑے۔

مولوی صاحب کی ''تاریخ ہند'' اپنے ہاں کے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔

علامہ شبلی نعمانی، خواجہ حسن نظامی اور لالہ چندو لال.

(فرمایا) علامہ شبلی نعمانی کا انتقال نومبر ۱۹۱۴ء میں ہوا اور علامہ الطاف حسین حالی مرحوم کا انتقال دسمبر ۱۹۱۴ء میں۔ ان دونوں مرحومین کے انتقال پر گویا ایک صدی پورا ہوا ہی چاہتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے ۱۹۰۹ء میں دہلی، خواجہ حسن نظامی مرحوم کو خط لکھا کہ کام کی زیادتی نے تھکا دیا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ایسی جگہ جا کر رہوں جہاں پر کامل سکون ملے۔ خواجہ صاحب نے لکھا کہ دہلی میرے پاس آ جایئے اور رہیے، مکمل سکون ہوگا۔

چنانچہ علامہ شبلی مرحوم چلے گئے۔ اور ایک مہینہ تک نواب بڈھن کی محل سرائے واقع چتلی قبر میں ٹھہرائے گئے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے ایک مہینہ تک کسی کو وہاں پھڑ کنے نہیں

دیا۔ اسی ایک مہینے میں جناب خواجہ حسن نظامی مرحوم کی اہلیہ اور ایک بیٹے کا انتقال ہوگیا۔ خواجہ صاحب مرحوم ان حوادث کا زیادہ اثر تو لیتے نہیں تھے اس لیے اپنے کاموں میں مصروف رہے اور جنازے بھی پڑھ دیئے۔

علامہ شبلی مرحوم یہ سب کچھ دیکھتے، سنتے رہے۔ پھر فرمایا:

> ''خواجہ صاحب جب میری بیوی کا انتقال ہوا تھا، تو میں تو اس کی جدائی میں پاگل ہی ہوگیا تھا، لیکن آپ ہیں کہ برابر اپنے کاموں میں مصروف ہیں، گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ ارے بھئی! آپ تو بہت مضبوط طبیعت کے انسان ہیں۔''

پورا مہینہ علامہ شبلی مرحوم نے، خواجہ حسن نظامی مرحوم کی پُر زور سفارش پر، صرف ایک شخص کی دعوت قبول کی اور وہ تھے لالہ چندو لال چاول والے۔ لالہ جی بہت باذوق آدمی تھے اور اس زمانے میں دہلی سے ایک رسالہ ''زبان'' نکالا کرتے تھے۔ انہوں نے دعوت میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ طرح طرح کے سالن اور چاول پکوائے اور علامہ شبلی نعمانی جب زردہ کھانے لگے تو لالہ جی نے ایک نوکر سے کہا ''ذرا گرم زردہ لانا''۔ دعوت ختم ہوئی اور علامہ شبلی مرحوم نے خواجہ حسن نظامی مرحوم سے لالہ چندو لال کی وضعداری اور مہمان نوازی کی از حد تعریف کی اور پھر فرمایا: ''مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ دہلی والے ہو کر لالہ جی نے ''گرم زردہ'' کے الفاظ کیوں استعمال کیے؟ گرم کا لفظ تو ''بریانی'' کے لیے بولا جاتا ہے''۔
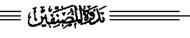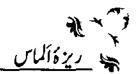
قرآن کریم کے انگریزی تراجم

فرمایا یہاں بہت سے لوگوں سے یہ سنا کہ قرآن کریم کا پہلا انگلش ترجمہ جناب محمد مارمادیوک پکتھال (Marmaduke Pickthall) رحمۃ اللہ علیہ نے کیا۔ یہ اطلاع قلت علم کا نتیجہ ہے۔ ان سے پہلے پامر (palmer)، راڈویل (Rodwell) اور جارج سیل (George Sale) وغیرہ کے ترجمے شائع ہو چکے تھے۔ پکتھال بنیادی طور پر انگلش زبان کے عالمی شہرت یافتہ ادیب تھے۔ ترکی میں ۱۹۰۸ء میں جو انقلاب آیا تھا۔ انھوں نے اس پر ایک کتاب "The early hours" لکھی تھی۔ ایک اور کتاب، جس پر انھیں فخر تھا اور اس میں اسلام کے خلاف بہت کچھ مواد تھا اور وہ انھوں نے اپنے زمانۂ کفر میں لکھی تھی "Saeed the fisherman" تھی۔ پڑھنے لکھنے کے رسیا تھے اور ان کی اس عادت اور زور مطالعہ نے انھیں اسلام سے روشناس کرایا تھا اور پھر وہ نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ حضرت نظام حیدرآباد کی سرپرستی اور مالی تعاون سے وہ جامعۃ الازہر مصر گئے اور دو سال کی شبانہ روز محنت سے قرآن کریم کا ترجمہ بھی مکمل کیا۔ انہوں نے لندن میں اپنے قبول اسلام کا جب اعلان کیا تو اس کا بہت اچھا اثر، یورپ پر پڑا۔ علمی حلقوں کے بہت پڑھے لکھے انگریز کہنے لگے کہ جس مذہب کو پکتھال جیسا آدمی قبول کر رہا ہے تو اس میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبیاں تو ہوں گی جنہوں نے پکتھال کو متاثر کیا ہے۔ ان کی بہت خواہش تھی کہ ان کی قبر سپین میں بنے لیکن مٹی لندن کی تھی، ۱۹۳۶ء میں وہیں ان کا انتقال ہوا۔

حکیم عبدالوہاب انصاری اور علامہ اقبال

فرمایا: حکیم عبدالوہاب انصاری جنھیں عام طور پر حکیم نابینا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اپنے دور کے طبیب حاذق تھے۔ مہاراج سرکشن پرشاد کے ہاں خواتین اور بچے بیمار ہو گئے تو مہاراجہ نے انھیں اپنے محل میں آنے کی دعوت دی۔ یہ تشریف لے گئے تو سب سے پہلے بچے ملاحظہ کے لیے پیش کیے گئے۔ یہ نابینا تھے، ہر بچے کی نبض پر ہاتھ رکھ کر بیماری تشخیص کر کے دوا لکھواتے رہے۔ اب عورتوں کی باری آئی تو مہارانی صاحبہ کو آنے میں دیر ہوئی، تو جلدی سے مہاراج سرکشن پرشاد کرسی پر بیٹھے اور اپنا ہاتھ آگے کر دیا۔ حکیم صاحب نے خاموشی سے نبض پر ہاتھ رکھا اور پھر اٹھا لیا۔ مسکرا کر فرمانے لگے یہ نبض تو مہاراج کی ہے۔ مہاراج حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی۔ فرمانے لگے میں نے زندگی میں ایسا باکمال طبیب نہیں دیکھا۔ یہ سب حیدرآباد دکن کا قصہ ہے۔ ریاست میں ایسے ایسے باکمال لوگ تھے۔ حکیم نابینا مرحوم نے علامہ اقبال کا علاج بھی کیا تھا۔ وہ جب شفایاب ہوئے تو حضرت حکیم نابینا صاحب مرحوم سے اتنے خوش تھے کہ ان کی شان میں ایک رباعی کہی جس میں ان کی اور انہوں نے جو دوا لاہور بھجوائی تھی ''روح الذہب'' دونوں کی تعریف کی۔

ہے دو روحوں کا نشیمن پیکر خاکی میرا
رکھتا ہے بے تاب دونوں کو مرا ذوق طلب

ایک جو اللہ نے بخشی مجھے صبح ازل
دوسری ہے آپ کی بخشی ہوئی روح الذہب

گاندھی جی اور عمر سوبانی

فرمایا: گاندھی جی یقیناً ہندوستان اور عالمی سطح کے بہت بلند پایہ رہنما تھے لیکن جدوجہد آزادی میں، ان کا ساتھ صرف ہندوؤں نے ہی نہیں، مسلمانوں نے بھی بہت دیا تھا۔ مسلمانوں نے ان کے لیے بہت قربانیاں بھی دیں اور ان کی تمام تحریکیں ـــــ جو انگریزوں کے خلاف اٹھیں ـــــ مسلمانوں ہی کے تعاون سے، اپنے انجام کو پہنچیں۔ ایک مرتبہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے لیے کچھ رقم درکار تھی تو ایک میمن متمول تاجر جناب عمر سوبانی نے اکیلے انھیں صرف بمبئی ہی سے ۳۷ لاکھ جمع کر کے دیئے تھے اور گاندھی جی کا ٹارگٹ ایک کروڑ روپے کا تھا۔

عمر سوبانی، یوسف سوبانی کے بیٹے تھے اور میمن برادری کے نہایت متمول تجار میں شمار کیے جاتے تھے۔ مشہور زمانہ مصوّروں کی ہاتھ سے بنائی ہوئی تصاویر خریدنے کے بہت شوقین تھے۔ منہ مانگی قیمت دے کر تصویر خریدتے تھے۔

وسیع المشرب طبیعت تھی۔ ۱۹۱۵ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کو مدد کی ضرورت تھی تو مسٹر جناح کی مدد کی اور جب گاندھی جی نے ایک موقع پر امداد کی درخواست کی تو عمر سوبانی نے چیک بک کھول کر رکھ دی اور کہا ''گاندھی جی چیک بھر دیجیے'' گاندھی جی نے قلم اٹھایا اور ایک لاکھ کا چیک بھر دیا۔ یہ دیکھ کر عمر سوبانی بہت ہنسے اور

فرمانے لگے "میں بہت سستا چھوٹا" گاندھی جی نے فرمایا "بس یہ رقم کافی ہے" یہ واقعہ ۱۹۲۶ء سے بھی پہلے کا ہے کیونکہ عمر سوبانی ۶ جولائی ۱۹۲۶ء کو رحلت فرما گئے تھے۔ ایسے کتنے ہی واقعات ملیں گے جن سے علم ہوگا کہ تحریک آزادی میں مسلمانوں کی قربانیاں بھی کسی سے کم نہیں۔

وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو یزید کے دورِ حکومت میں باعث تشویش بن سکتے تھے؟

فرمایا یزید کے فسق و فجور میں کوئی شبہ ہونا تو در کنار اس کی تو تکفیر پر بحث ہے۔ احناف میں علمائے سمرقند و بخاریٰ کا بھی اختلاف ہے۔ ایک گروہ اس کے کفر کا قائل ہے اور دوسرا اس کے فسق کا۔ اس کے دور میں جو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اس کی حکومت میں مزاحم ہو سکتے تھے، تین تھے:

ایک تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ان کی شفقت، حمایت اور ہمدردی تو سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے ساتھ تھی لیکن وہ ہمیشہ اپنے آپ کو اختلافی امور سے الگ رکھ کے اللہ تعالیٰ کی عبادت، اجتماعی فلاح اور فکر آخرت میں رہے۔

دوسرے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما تھے اور وہ یزید کی فوج تو کیا، حجاج بن یوسف اور اس کے دستوں کے ساتھ بھی نبرد آزما رہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں رتبہ شہادت پر فائز فرمایا۔

اور تیسرے، یہ سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما تھے جنھوں نے آخری دم تک اپنی جد و جہد
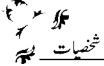
جاری رکھی۔ یزیدیوں کو یہ لاج بھی لاحق نہ ہوئی کہ وہ بیٹا کس کا تھا؟ حضرت ابوتراب سیدنا کرار حیدر رضی اللہ عنہ کا، حضرت صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے کس محنت ومشقت سے اپنے لاڈلے کو پالا تھا اور پھر نواسہ ان کا تھا، جنھوں نے فرمایا تھا حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں۔ صلوٰت اللّٰہ و سلامه علیهم اجمعین.

خلیفہ ہارون الرشید، عبداللہ بن مبارک اور ابومعاویہ رحمۃ اللہ علیہم

فرمایا یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اس قدر عبادت گذار تھا کہ ۱۷۹ھ کا رمضان آیا تو اس نے عمرے کا احرام باندھا اور پھر اسی احرام میں حج کی نیت کرلی اور پھر ایام حج میں بیت اللہ سے پیدل نکلا۔ منیٰ، عرفات، مزدلفہ اور پھر منیٰ واپس پہنچ کر ذبح کے بعد احرام اُتارا۔ ڈھائی ماہ تک احرام کی پابندیاں اور اطاعت الٰہی اب کس کو میسر ہے؟

علماء کرام رحمۃ اللہ علیہم سے اُسے اتنی عقیدت تھی کہ جب حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کی خبر پہنچی تو باقاعدہ غم کا اظہار کیا اور اعیانِ سلطنت نے اِس حادثے کی تعزیت کی۔ اس کے زمانے ہی میں حضرت ابومعاویہ نابینا رحمۃ اللہ علیہ بہت صاحب علم، اس کی ایک دعوت میں آئے۔ کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی باری آئی تو اس نے آفتابہ اٹھایا اور ہاتھ دھلاتے ہوئے دریافت کیا کہ اگرچہ آپ اپنے نابینا ہونے کے سبب بینائی سے محروم ہیں لیکن آپ جانتے ہیں کہ آپ کے ہاتھ کون دھلا رہا ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا تو ہارون الرشید نے اپنا تعارف کراتے ہوئے عرض کیا حضرت! علم بہرحال قابل احترام ہے۔

حجاج بن یوسف اور عبدالرحمٰن بن مسلم خراسانی.

فرمایا بنو امیہ میں حجاج بن یوسف اور بنو عباس میں عبدالرحمٰن بن مسلم خراسانی ـــــ جو کہ تاریخ میں ابو مسلم خراسانی کے نام سے مشہور ہے ـــــ دونوں اتنے بڑے سفاک (Blood Shedders) تھے کہ کون فیصلہ کر سکتا ہے کس نے، کس سے بڑھ کر خون بہایا؟ دونوں، مسلمانوں کا خون بہانے میں ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ بلاوجہ محض اپنی حکومتوں کے استحکام کے لیے مسلمان رعایا کی گردنیں کاٹتے اور معصوم خون سے اپنے دامن کو تر کرتے رہے۔

یہ ابو مسلم خراسانی پہلا شخص تھا جس نے بنو عباس کی حکومت میں سیاہ لباس کو سرکاری لباس قرار دیا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک عید یا جمعہ کے دن سیاہ عبا اوڑھ کر خطبہ دینا مستحب قرار پایا ہے۔ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے اس استحباب کی تصریح کی ہے۔

یہ ابو مسلم ایک مرتبہ سیاہ لباس اوڑھے خطبہ دے رہا تھا تو ایک شخص نے اٹھ کر سوال کیا کہ آپ نے سیاہ لباس کیوں زیبِ تن کر رکھا ہے؟ کہنے لگا میرے استاد حضرت ابو الزبیر نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم سے روایت بیان کی کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اپنے سر مبارک پر سیاہ عمامہ باندھا تھا۔ اور سیاہ لباس ہمارا قومی لباس بھی ہے اور رعایا کو مرعوب کرنے کے کام بھی آتا ہے۔

پھر ایک فوجی کو اشارہ کیا کہ اس سوال پوچھنے والے کو اٹھاؤ اور اس کی گردن اڑا دو۔ چنانچہ وہ آدمی قتل کر دیا گیا، جرم کیا تھا؟ صرف یہ کہ تمہاری اتنی ہمت کیسے ہوگئی کہ اپنے
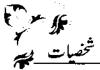
اپنے حکمرانوں کے کاموں کا جواز دریافت کرتے پھرو۔

ملا صدرا اور اُن کی کتابیں

فرمایا ملا صدرا کا تعلق اگرچہ اہل تشیّع سے تھا مگر اپنے فنون میں کمال کے انسان تھے۔ ان کی کتابیں اہل السنۃ کے مدارس میں بھی ایک عرصہ تک پڑھی اور پڑھائی جاتی رہیں لیکن اب تو درس نظامی کا صرف ڈھانچہ ہی رہ گیا، وہ جو لوگ فلسفہ اور منطق پڑھ کر علم کے مردِ میدان تھے، شہروں کے شہر، ان سے خالی ہو گئے اور ذات وصفات الٰہیہ کی مباحث جاننے والے، علوم شرعیہ کے حاملین چل بسے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جب ملا صدرا کی کتابیں پڑھیں تو آنکھیں روشن ہو گئیں اور بعض مقامات تو ایسے ہیں کہ واہ، سبحان اللہ کیا کہنے۔ ۱۰۵۰ء میں وفات پائی اور اس دور میں سات حج کیے تھے۔ شیخ بہاؤالدین عاملی کے شاگرد تھے۔ ضروری علوم سے فراغت کے بعد پندرہ سال تک عبادت میں مصروف رہے۔ مخلوق سے انقطاع اور مراقبات میں مشغول رہے۔ اس کے بعد تحریر وتسوید کا کام ہوا۔ پندرہ کتابیں تو صرف تفسیر قرآن پر ہی لکھ دیں۔ موت کے بعد مسخ روح ہوتا ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر بہت عمدہ لکھا۔ ''اسرار الآیات'' میں بھی اس موضوع کو بیان کیا ہے۔ ہمارے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ جس شخص پر جس خواہش نفس کا غلبہ ہوگا، حشر میں اسی صورت میں محشور ہوگا۔ کتنے ہی لالچی انسان کتوں کی شکل میں اٹھائے جائیں گے۔ کتنے ہی بے حیا، انسانی شکل میں جیتے رہے اور آخرت میں سور کی شکل میں محشور

ہوں گے، بندروں تک کی صورت میں ہوں گے۔ ملا صدرا نے یہ مضمون اپنی کئی کتابوں میں نہایت شرح کے ساتھ مدلل بیان کیا ہے۔

مولانا حکیم محمود احمد برکاتی رحمۃ اللہ علیہ اور فلسفہ و معقولات۔

(فرمایا) فلسفہ کے کچھ اسباق وتشریحات کراچی میں مولانا حکیم محمود احمد برکاتی مرحوم ومغفور سے پڑھے۔ ان کے پردادا مولانا حکیم دائم علی صاحب مرحوم بہار کے رہنے والے تھے اور جب شہرت ہوئی تو نواب ریاست ٹونک نے انھیں اپنا شاہی طبیب مقرر کرلیا تھا پھر ان کے دادا نے اپنے والد مرحوم سے زیادہ شہرت پائی۔

مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی تو اپنے دور میں فلسفہ اور معقولات کے امام ہوئے۔ پھر ان کے والد مرحوم نے اپنی زندگی طب کی خدمت میں بسر کی اور اب حضرت حکیم محمود احمد برکاتی صاحب مرحوم نے پوری ذمہ داری اور بساط بھر تحقیق کے ساتھ چند ایک کتابیں بہت عمدہ تحریر فرمائیں، خیر آبادی سلسلے کی انتہا یہ ہوئی۔ فلسفہ و معقولات کا جلال جاتا رہا۔ مولانا مودودی صاحب مرحوم نے بھی فلسفہ ومنطق اسی علمی خانوادے سے پڑھا تھا اور اس خاندان کے جس جس فرد سے واسطہ پڑا مجسمۂ متانت وصدق تھا۔

امام ابوبکر خصاف الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ ـــــــ خاندان بنو مازہ رحمۃ اللہ علیہم

(فرمایا) امام ابوبکر خصاف الشیبانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''کتاب النفقات'' کی ایک عمدہ شرح حضرت صدر الشہید حسام الدین ابو محمد عمر بن عبد العزیز ابن مازہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۵۳۶ھ
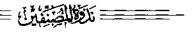
کی ہے۔ یہ شرح حضرت الشیخ ابوالوفاء افغانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے ساتھ چھپ گئی ہے، اور ہمارے ذخیرۂ کتب میں موجود ہے۔ حضرت صدر الشہید ابن مازہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور میں، علم کے میدان میں، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک تھے۔ لیکن افسوس کہ عمر بہت کم پائی۔ صرف ترپن سال جیئے اور سمرقند میں ایک کافر نے انھیں شہید کردیا۔ جسد مبارک بخاریٰ منتقل کیا گیا۔ صاحب ہدایہ رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ میں سے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے معجم میں اپنے مشائخ کے تذکرے میں ان کی تعریف میں لکھا ہے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور فقہ ان سے پڑھی تھی۔ اپنے والد حضرت برہان الدین الکبیر عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگرد تھے۔ علماء سمرقند، بخاریٰ، خراسان اور ماوراءالنہر میں یہ ''بنو مازہ'' کا خاندان نہایت بلند پایہ علمی وقعت ووجاہت کا حامل تھا۔ حنفی فقہ کے آئمہ کرام رحمہم اللہ اس خاندان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنا، اپنے لیے فخر وسعادت جانتے تھے۔ اس بنو مازہ کے خاندان میں کتنے ہی آئمہ ایسے گذرے ہیں جو صدر الشہید، صدر السعید اور برہان الائمہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ خود، ان کے والد عبدالعزیز، ان کے دادا عمر بن مازہ، ان کے بھتیجے محمود صاحبِ محیط، ان کے بیٹے ابوجعفر محمد بن عمر، حضرت صدر جہاں محمد بن احمد بن عبدالعزیز بن عمر بن مازہ، یہ سب اسی خاندان ''بنو مازہ'' کے درخشندہ ستارے تھے۔ سلطان وقت سنجر بن ملک سلجوقی نے ان سب حضرات کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے تھے۔

رحمھم اللّٰہ تعالیٰ جمیعاً و حشرنا معھم.

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور جوزف ہوروٹس.

فرمایا ہمارے حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مشہور مستشرق جوزف ہوروٹس(Josef Horovitz) کی تنگ نظری اور مذہبی تعصب پر بہت برہم ہوتے تھے۔ان کے زمانے میں ''معارف'' میں ان کے کئی مضامین اس موضوع پر چھپے۔پڑھنے اور سر دھننے سے تعلق رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ پہلا مستشرق ہے جس نے ''الطبقات الکبریٰ لابن سعد رحمۃ اللہ علیہ'' جیسی سیرت طیبہ کی بنیادی مآخذ کتاب مرتب کر کے، ہالینڈ کی لائڈن یونیورسٹی سے اس کی دو جلدیں،1904ء سے لے کر1918ء تک، محنت کر کے دنیائے اسلام کو دیں۔علامہ شبلی نعمانی مرحوم کو حسرت رہی کہ کاش وہ طبقات ابن سعد دیکھ لیتے لیکن ان کی وفات کے چار سال بعد 1918ء میں یہ کتاب چھپی۔ اس عظیم کام پر اسے ایک اور مستشرق ایڈورڈ زخاؤ (Eduard Sachau) نے راغب کیا تھا،''طبقات'' کے علاوہ اس نے ابن قتیبہ کی کتاب ''عیون الاخبار'' کا انگلش ترجمہ بھی کیا۔افسوس کہ عمر زیادہ نہ پائی صرف 57 سال جیا اور 5 فروری 1931ء میں انتقال ہوا۔

ابن حزم ظاہری اور ابن عربی کا خواب.

فرمایا ابن حزم ظاہری کی کتابیں پڑھیں تو یہ فائدہ تو ضرور ہوا کہ احادیث وآثار سے آگاہی ہوئی لیکن بعض مقامات پر اکابرین واسلافِ اُمت اور خاص طور پر انھوں
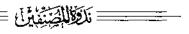
نے موالک، مع امام مالک رحمۃ اللہ علیہ پر جو کرم فرمائی کی ہے اسے پڑھ کر از حد کوفت بھی اٹھانی پڑی۔ بعض مقامات پر تنقید کا پیمانہ اتنا سخت کر دیتے ہیں اور احادیث و آثار کے معاملے میں اتنی سطحیت پر اُتر آتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ ہے۔ علمی مباحث میں تو ان کا حال یہ ہے لیکن صاحبِ فتوحاتِ مکیہ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم گویا کہ سراپا نور ہیں اور اسی عالم میں آپ نے ابو محمد ابن حزم کو اپنے سینۂ مبارک سے چمٹا لیا ہے۔ پھر ایک جسم دوسرے جسم میں سمو گیا ہے حتیٰ کہ ایک ہی جسم رہ گیا ہے اور وہ صرف حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ پڑھ کر ان سے بُعد میں کمی واقع ہوئی۔ خدا ایسے بھلے انسانوں کا بیڑا پار لگائے مگر کاش کہ کچھ حفظ مراتب کا دھیان رکھتے۔

خواجہ الطاف حسین حالی اور ان کی اہلیہ

فرمایا خواجہ الطاف حسین حالی کی شادی پانی پت کے شیعہ سادات میں ہوئی۔ بی سلام النساء ان کی اہلیہ تھیں۔ بہت تیز مزاج اور پھر اس مزاج کے اظہار میں ذرا تأمل نہ تھا۔ ایک مرتبہ قصہ یہ ہوا کہ خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم اپنے بیٹے خواجہ سجاد حسین اور اپنے سالے فیاض حسین کے ساتھ پانی پت میں، نویں محرم کو ایک تانگہ لے کر اپنے کسی کام سے گئے۔ کوچوان نے تانگہ کچھ اس طرح سے چلایا کہ، الٹ گیا، تینوں افراد کو کچھ چوٹیں تو آئیں لیکن بچ گئے، گھر لوٹے تو بی سلام النساء کا غصہ اپنے عروج پہ تھا۔ خوب برسیں اور شوہر، بیٹے اور بھائی پر قیامت ڈھا دی کہ

حضرت نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نواسے پر تو قیامت کی گھڑی ہے۔ ان کے اعزا و اقرباء تو بھوک اور پیاس سے تڑپ رہے ہیں اور تم تینوں کو تانگے پر سیر کی سوجھی ہے۔ اچھا ہوا کہ تانگہ اُلٹا، تمہیں سزا ہوئی، اور بہت کچھ کہا، بیٹے اور بھائی کو یہ رویہ بہت کھلا کہ جانے دو ہماری تو خیر ہے لیکن خواجہ صاحب شوہر ہیں۔ بلند پایہ آدمی ہیں، انھیں اس طرح سے مخاطب کرنا تو بالکل درست نہیں ہے، لیکن خواجہ الطاف حسین حالی اس قدر ٹھنڈے مزاج کے تھے کہ بولے تو صرف یہ کہا کہ آج سیدانی جلال میں ہیں۔ جو کچھ کہتی ہیں، حق ہے، آج کے دن سواری پر بیٹھے، ہماری ہی غلطی تھی۔

خواجہ الطاف حسین حالی اور شمس العلماء کا خطاب.

فرمایا سرسید احمد خان اور علامہ شبلی نعمانی کو خواجہ الطاف حسین حالی سے بہت محبت اور ان کے حال پر بڑی شفقت تھی۔ ۱۹۰۴ء میں شمس العلماء کا خطاب، حکومت نے خواجہ صاحب کو دیا۔ اس اعزاز کی مبارک باد میں علامہ شبلی نعمانی نے انھیں ایک نہایت دلچسپ اور وقیع جملہ لکھا کہ مولانا آپ کو تو نہیں لیکن خطاب شمس العلمائی کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اب جا کر اس خطاب کو عزت حاصل ہوئی۔

’’پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی‘‘.

فرمایا انگریز حکومت نے جن بے قصور لوگوں پر ظلم کیا ان میں ایک مرزا اسد اللہ خان غالب بھی تھے۔ چھ ماہ کی نظر بندی کے بعد رہا ہوئے تو دہلی میں میاں کالے کی حویلی

میں قیام ہوا۔ کسی نے دریافت کیا کہ جناب والا کا قیام آج کل کہاں ہے تو فرمایا ''پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں''۔

میر انیسؔ کی بلی کا چوری ہونا.

فرمایا میر انیسؔ مرثیہ نگاری کے بادشاہ تھے۔ لکھنؤ کیا برصغیر اور برصغیر کیا اب تو جہاں بھی اردو ادب کی رثائی شاعری کی بات ہوگی حضرت میر انیسؔ سرفہرست ہوں گے۔ انھوں نے دل بہلانے کے لیے ایک خوبصورت بلی پالی تھی۔ بلی کیا تھی گویا کہ محبوبہ تھی۔ اس کی ناز برداریاں کرتے، قصاب کے ہاں سے اس کے لیے گوشت آتا۔ دسترخوان پر ان کے سامنے یا پہلو میں بلی کو نشست ملتی اور جب تک وہ نہ ہوتی حضرت میر انیسؔ منہ میں لقمہ نہ ڈالتے مگر ہوا یہ کہ ایک مرتبہ یہ بلی چوری ہوگئی۔ بلی کیا چوری ہوئی، حضرت میر انیسؔ پر قیامت ڈھ گئی۔ کھانا پینا سب موقوف ہوگیا اور متنسبین کی پریشانی الگ، اسی اثنا میں، جبکہ میر انیسؔ سو رہے تھے، دستک ہوئی، دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ حضرت میر دبیرؔ کھڑے ہیں انھیں سوتے سے جگایا گیا نہایت گھبرائے ہوئے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ میر دبیرؔ کھڑے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ میر انیسؔ نے بڑھ کر معانقہ کیا اور گریے کا سبب دریافت کیا۔ ارشاد ہوا بھوک ستا رہی ہے، کھانا کھلا دیجیے، میر انیسؔ حیران کہ ماجرا کیا ہے؟ میر دبیرؔ لکھنؤ کے نامور شاعر اور آسودہ حال، کھانا تو ظاہر کی پردہ داری ہے، حقیقت میں معاملہ کچھ اور ہے۔ دسترخوان بچھایا اور کھانا چنا گیا۔ آداب دعوت کے مطابق میر انیسؔ بھی لقمے

اٹھاتے رہے میر دبیر گویا ہوئے اور فرمایا میری آنکھ لگ گئی تھی کہ آپ کے جدّ امجد تشریف لائے اور فرمایا کہ انیسؔ نے آج کھانا نہیں کھایا، جا کر انھیں کھانا کھلائیں اور کہہ دیں کہ جو کچھ کھو گیا ہے سویرے مل جائے گا۔ چنانچہ اگلے دن سویرے بلی خود بخود واپس چلی آئی۔

درس نظامی کی کتاب ''مطوّل''

فرمایا درس نظامی کی کتاب مطوّل، جسے اب مولوی نہیں پڑھتے، مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر بن اکبر بادشاہ نے اپنے اساتذہ سے پڑھی اور وہ نسخہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے کتب خانے میں تھا۔ اس پر جہانگیر بادشاہ کے دستخط بھی تھے۔ یہ نسخہ اب علی گڑھ کے کتب خانے میں محفوظ ہونا چاہیے۔

ہنوز دلی دور است —— محاورے کی اصل

فرمایا اردو کا محاورہ ''ہنوز دلّی دور است'' اپنے پس منظر میں ایک حقیقت کا حامل ہے۔ سلطان غیاث الدین تغلق کو بعض وجوہ کی بناء پر حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سے پرخاش تھی۔ بنگال کی ایک مہم کے بعد جب وہ دہلی لوٹ رہا تھا تو ایک تیز رو قاصد کے ذریعے حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو پیغام بھجوایا کہ میرے دہلی میں داخل ہونے سے پہلے پہلے دلّی خالی کر دیں۔ دلّی میں اب یا تو آپ رہیں گے یا پھر میں رہوں گا۔ دہلی نہ چھوڑنے کی صورت میں انجام اچھا نہ ہوگا۔ حضرت نور اللہ مرقدہ نے جب یہ

پیغام سنا تو بے اختیار زبان الہام ترجمان سے یہ جملہ صادر ہوا ''ہنوز دلّی دور است''
سلطان غیاث الدین بنگال کی مہم سے کامیاب واپس آرہا تھا۔ پُر غرور فاتح کے استقبال کے لیے ساری دلّی سجائی گئی، ولی عہد بہادر نے دلّی سے صرف تین میل کے فاصلے پر ایک عارضی محل تعمیر کرایا کہ غازی بادشاہ یہاں اُتریں۔ شہر میں داخل ہونے سے قبل کچھ ہلکا پھلکا کھانا کھائیں اور تازہ دم ہوکر سجے ہوئے محل میں داخل ہوں۔ سلطان اس محل میں داخل ہوا اور کھانا کھایا۔ دلّی کے امراء اور فقراء اس معرکے کو بھی سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ سلطانِ دنیا کا حکم ہے کہ اس کا دارالحکومت چھوڑ دیا جائے اور سلطانِ دین کسی قیمت پر دلّی چھوڑنے کو تیار نہیں صرف یہ فرماتے کہ ابھی دلی دور ہے۔ ایک کے پسِ پشت حشم وخدم ہے۔ سلطنت ہے، افواج اور سپاہ ہیں اور دوسرے کی کل کائنات ''یقین'' صرف تین میل کا فاصلہ۔ بادشاہ نے کھانا کھایا۔ تمام وزراء اور فوج کے سربراہ اپنی سواریوں پہ جا چڑھے، محل میں صرف پانچ افراد تھے اور بادشاہ ہاتھ دھو رہا تھا۔ اچانک آسمان سے بجلی گری۔ محل دھڑام سے گرا۔ بادشاہ اور اس کے پانچوں مصاحبین ایسی سلطنت میں جا پہنچے جہاں صرف اللہ کی بادشاہی ہے اور سب مخلوق بے اختیار۔ سلطانِ دین نے معرکہ جیت لیا۔ یقین نے مزعومہ وہم کو شکست دے دی اور عوام الناس میں وہاں سے یہ محاورہ چلا ''ہنوز دلّی دور است''۔

مولانا آزاد اور جوش ملیح آبادی.

فرمایا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور حضرت جوش ملیح آبادی کا تعلق تقسیم کے بعد بھی

استوار رہا۔ یہ جب بھی ہندوستان جاتے، مولانا کی خدمت میں ضرور حاضری ہوتی، ایک مرتبہ مولانا نے ارشاد فرمایا کہ دنیا بھر کے لوگ اپنے سیاسی مسائل کے حل کے لیے میرے پاس آتے ہیں، ادب کی دنیا پر کوئی بات نہیں ہوتی۔ آپ بھی تو تشریف لایا کیجیے۔ چنانچہ جناب کنور مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ اور حضرت جوشؔ دونوں ایک مرتبہ حاضر ہوئے تو دیکھا کہ مولانا تو سیاسی حضرات کی جھرمٹ میں ہیں۔ پندرہ بیس منٹ انتظار کے بعد جوش صاحب نے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھا:

؎ نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

اور اس کے بعد یہ جا، وہ جا۔ ابھی گاڑی تک بھی نہ پہنچے تھے کہ مولانا کے سیکرٹری خان اجمل خان بھاگتے ہوئے آئے اور مولانا کی طرف سے معذرت کر کے واپس لے گئے۔ مولانا نے خود بھی معذرت کی اور بہت تپاک سے ملے۔

جواہر لال نہرو اور جوشؔ

فرمایا پنڈت جواہر لال نہرو کو حضرت جوشؔ سے جو تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بحیثیت وزیر اعظم انھوں نے کہا کہ جوش صاحب اگرچہ آپ نے اب پاکستان کی شہریت لے لی ہے لیکن اس کے باوجود آپ سال بھر میں صرف تین ماہ ہی ہندوستان آجایا کریں تو میں آپ کو پورے بارہ ماہ کی تنخواہ دلوا دیا کروں گا۔

علامہ انور صابری اور تصویر.

فرمایا جناب علامہ انور صابری مرحوم کا شمار پر گو شعراء میں ہوتا تھا اور کیمرے کا نیا نیا دور تھا اور علامہ مرحوم تصویر کھنچوانے سے گریزاں رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مشاعرے میں پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو تصویر کشی شروع ہوگئی، علامہ صاحب نے بہت مہذب انداز میں روکا اور فرمایا کہ بھئی میری تصویر لے کر کیا کرو گے؟ شنکر پرشاد صاحب نے فوراً فقرہ چست کیا مولانا بچوں کو ڈرانے کے کام آئے گی۔

جوشؔ کی نظم اور مہیندر سنگھ کی داد.

فرمایا بمبئی کے ایک مشاعرے میں حضرت جوش ملیح آبادی اپنی مشہور نظم، جس نے ایک عرصہ تک برصغیر کی ادبی مجالس میں تہلکہ مچائے رکھا ''گل بدنی'' اپنے مترنم لہجے میں پڑھ رہے تھے کہ کنور مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ نے برجستہ داد دیتے ہوئے کہا کہ حضرات ملاحظہ ہو، پٹھان ہو کر اتنی اچھی نظم کہہ رہا ہے۔ حضرت جوش نے برجستہ جواب دیا کہ حضرات ملاحظہ ہو سکھ ہو کر اتنی اچھی داد دے رہا ہے۔

شنکر لال اور اخلاقیات.

فرمایا دہلی کلاتھ ملز کے مالک سر شنکر لال شعر و شاعری اور موسیقی کی دنیا کے آدمی تھے انسانی رویوں اور اخلاقیات کے بادشاہ تھے جس کسی نے ذرا سا بھی احسان کر دیا،

عمر بھر اسے نبھاتے رہے۔ دوسروں کا اتنا احترام اور ایسے وضع دار تھے کہ ایک مرتبہ اپنی گاڑی میں کنور مہیندر سنگھ بیدی سحرؔ کو اپنے گھر لے جا رہے تھے اور ان کی گاڑی کے سامنے ایک اور گاڑی جا رہی تھی۔ ان کے ڈرائیور نے اپنی گاڑی بڑھانی چاہی تو فوراً منع کر دیا اور فرمایا کہ اگرچہ راستہ صاف ہے، کوئی حادثے کا خوف نہیں ہے لیکن دیکھئے سامنے والی گاڑی رائے بہادر پرشاد کی ہے۔ یہ دہلی کے رئیس اعظم ہیں۔ ان کے بزرگوں نے میرے آباء واجداد پر احسانات کیے ہیں اس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہماری گاڑی ان کی گاڑی سے آگے چلے۔ بذات خود پوتڑوں کے رئیس تھے لیکن بدرجہ اتم انسانیت تھی، درجنوں بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت کرتے تھے۔

مجید لاہوری اور نمکدان

فرمایا پاکستان بننے کے بعد "جنگ" اخبار میں مزاحیہ کالم نگار جناب مجید لاہوری تھے "حرف وحکایت" اور "نمکدان" کے عنوان سے بہت عمدہ کالم چھپتے تھے۔ "جنگ" اخبار کی پرانی فائلز کو جب پڑھا تو بارہا یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص ان کے ان کالموں کو جمع کر دے، تو اردو کے مزاحیہ ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہو جائے۔ خود ہی نظمیں بھی لکھتے تھے۔ جن لوگوں نے انھیں دیکھا ہے، بتاتے تھے کہ اپنی جان اور جثّہ کے اعتبار سے بھی جناب مجید لاہوری صاحب سراپا مزاح لگتے تھے۔ افسوس کہ عمر بہت کم پائی۔ صرف چالیس برس جیئے اور خود ہی اپنے ایک مصرعے میں کہا

ع دوسرا مجھ سا کوئی لا نہ سکے گی دنیا
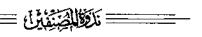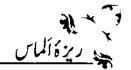
بابا تاجے شاہ اور رنجیت سنگھ

فرمایا: لاہور میں پرانی سبزی منڈی کو جو راستہ چیمبر لین روڈ (Chamberlane Road) کی طرف جاتا ہے وہاں برلب سڑک ایک مزار ہے۔ یہ مزار بابا تاجے شاہ مجذوب کا ہے۔ راجہ رنجیت سنگھ ان کے بہت معتقد تھے۔ یہ مغلوب الحال مجذوب اور صاحب کشف تھے اور کئی مرتبہ ایسی پیشن گوئیاں کرتے تھے جو اپنے وقت پر پوری ہوتی تھیں اور اس وجہ سے لوگ ان کے معتقد تھے۔ راجہ رنجیت سنگھ کی عقیدت کا باعث بھی یہی چیز تھی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے مرض الموت میں انھیں بلایا اور صحت کی دعا چاہی تو انھوں نے کہا چندن منگائیں۔ چندن اصل میں صندل کی لکڑی (Santalum Album) کو کہتے ہیں۔ یہ لکڑی مُردوں کو جلانے کے لیے استعمال ہوتی ہے اور اس کا شمار عمدہ قسم کی لکڑیوں میں ہوتا ہے اسی لیے یہ محاورہ بنا:

؎ چندن پڑا چمار کے نت اُٹھ کوٹے چام
رو رو چندن مہی پھرے پڑا نیچ سے کام

تو رنجیت سنگھ سمجھ گئے کہ یہ موت کا کنایہ ہے۔ پھر انھوں نے اسے کہہ بھی دیا کہ تیرے بعد یہ سلطنت، سکھ صرف نو سال سنبھال سکیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ راجہ رنجیت سنگھ ۱۸۳۹ء میں نذر چندن ہوئے اور ۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے تخت لاہور کو بھی اپنی سلطنت میں ضم کرلیا۔

اورنگ زیب عالمگیر اور شاہ محبّ اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ

فرمایا حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ بہت بیدار مغز بادشاہ تھے۔ عوام کو صرف دنیوی سہولتیں ہی فراہم نہیں کیں، اس پر بھی برابر نگاہ رکھی کہ ملک میں بدعقیدگی نہ پھیلنے پائے۔ حضرت شاہ محبّ اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے ''تسویہ'' کے بعض مندرجات پر نہ صرف شدید ناراضگی کا اظہار فرمایا بلکہ اسے خلاف شریعت سمجھتے ہوئے، جلانے کا حکم بھی دیا۔ ''تسویہ'' کی کئی شروح ان کے زمانے میں تحریر کی گئیں۔ اس کے مصنف حضرت شاہ محبّ اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ وحدۃ الوجود کے زبردست داعی تھے۔ انھوں نے حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کی ''فصوص الحکم'' کی عربی اور فارسی شروح بھی لکھی ہیں اور ان کی باقی تصانیف میں بھی وحدۃ الوجود کی دعوت ہے۔ ''تسویہ'' میں بھی چونکہ یہی دعوت ہے اور کچھ حد سے بڑھ گئی ہے اس لیے اس رسالے کے رد میں حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے حضرت خواجہ عبید اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک رسالہ تصنیف فرمایا ہے۔ اور پھر وہ وحدۃ الوجود کے داعی تھے اور یہ حضرات سلسلہ نقشبندیہ کے اکابرین، وحدۃ الشہود کے قائل۔ حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ بھی نقشبندی مجددی اور وحدۃ الشہود کے قائل اور انھی کا بھائی دارا شکوہ وحدۃ الوجود کا غالی قائل اور حضرت محبّ اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ سے منسلک۔ یہ تمام عوامل واسباب جمع ہوگئے تھے چنانچہ اس دور میں وجود اور شہود کی بہت گراں قدر علمی مباحث بھی خوب ہوئیں۔ حضرت شاہ محبّ اللہ الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ تو حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار میں
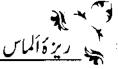
اتنے فنا تھے کہ اپنے دور میں ابن عربی ثانی کہلائے۔

نواب کلب علی خان اور داغ دہلوی.

فرمایا خلد آشیاں نواب کلب علی خاں بہادر نواب رام پور نے حضرت داغ دہلوی کو با قاعدہ ملازمت عطا کر دی تھی۔ حضرت خلد آشیاں شعراء کو صرف شاعری ہی کی وجہ سے وظیفہ نہیں دیتے تھے بلکہ سلطنت کے کچھ کام بھی شاعر کے سپرد کر دیتے تھے۔ حضرت داغ دہلوی دربار رام پور کے شاعر تو تھے، سو تھے، ان کے ذمے گاڑی خانہ، شتر خانہ وغیرہ بھی تھے۔ حضرت امیر مینائی کی دربار رام پور نے قدر افزائی کی وظیفہ مقرر کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ مفتی عدالت کی ذمہ داری بھی سونپی گئی۔ منشی امیر اللہ تسلیم کی قدر دانی بھی رہی اور ناظر فوجداری بھی کیے گئے۔ حضرت خلد آشیاں نے ارادہ حج کیا اور ۱۸۷۲ء میں کوچ ہوا۔ حضرت داغ دہلوی نے اپنی مشہور زمانہ غزل اسی سفر میں کہی تھی۔

؎ لاکھ دینے کا ایک دینا ہے
دل بے مدعا دیا تو نے
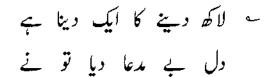
داغ دہلوی کا استغنٰی اور نواب صاحب کی عنایات.

فرمایا حضرت داغ دہلوی نو عمری ہی میں قلعہ معلیٰ دہلی کا رنگ دیکھ چکے تھے اور بوجہ صاحب کمال ہونے کے بے نیازی اس پر مستزاد، ایک مرتبہ محمود علی خان محمود رامپوری
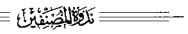
حاضر ہوئے تو یہ عصر کا وضو کر رہے تھے۔ مزاج ناگوار تھا محمود سے فرمایا کہ کاغذ لو اور میرا استعفیٰ لکھ دو۔ انھوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا آج حضرت نواب صاحب نے اصطبل کا ملاحظہ کیا اور مجھ سے فرمایا "گھوڑے دبلے ہو گئے ہیں"۔ اور یہاں ہزار کام سر میں ہیں۔ مجھ سے ملازمت نہیں ہو سکتی۔ محمود رامپوری نے کہا کہ استعفیٰ تو میں لکھ دیتا ہوں لیکن اسے منظور کون کرے گا۔ فرمایا کہ محمود جب مجھے ہی ملازمت منظور نہیں تو کیسے رکھیں گے۔ استعفیٰ لکھا گیا اور بھجوایا گیا۔ جب پیش ہوا تو نواب رام پور حضرت کلب علی خان نے طلب کیا اور وجہ استعفیٰ دریافت کی۔ انھوں نے عذر پیش کیا کہ حضور ضعف بہت ہو گیا اس لیے ملازمت درست طریقے سے ہو نہیں سکتی اور قرضے نے الگ پریشان کر رکھا ہے۔ حضرت نواب صاحب بہت خاموشی سے سنتے رہے اور جب ان کی بات پوری ہو گئی تو فرمایا: نواب میرزا آپ کو کون نوکر سمجھتا ہے۔ میں تو اپنا بھائی کہتا ہوں اور ارادہ یہ ہے کہ میں اور تم ایک ہی قبر میں دفن ہوں اور تم ہو کہ مجھے چھوڑ رہے ہو۔ پھر قرضے کی تفصیل دریافت کی اور فرمایا کہ قرضہ چھوٹ جائے گا اور آج سے آپ کی تنخواہ میں پچاس روپے اضافہ کیا جا رہا ہے۔ حضرت داغ دہلوی واپس ہوئے اور یہ تمام کتھا اپنے شاگرد محمود علی خان محمود رامپوری کو سنا کر فرمانے لگے کہ محمود اب تم ہی بتاؤ کہ یہ باتیں ایسی ہیں کہ کسی کو یہاں سے نکلنے دیں؟۔

حضرت داغ دہلوی کو نواب خلد آشیاں سے ایسی محبت اور تعلق خاطر تھا کہ شعر کہا ہے

؎ ہر چند رام پور میں گھبرا رہا ہے داغؔ
کس طرح جائے کلب علی خان کو چھوڑ کر

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں۔

؂ رہے کیا مصطفیٰ آباد میں داغ
وہ سارے لطف تھے خلد آشیاں کے ساتھ

ابن عربی کا ایک خواب.

(فرمایا) حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ میں اشبیلیہ گیا تو وہاں حضرت ابو عمران موسیٰ بن عمران مرتلی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری ہوئی۔ جو کہ اس دور کے اکابر اولیاء اللہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ میں نے انھیں ایک کام کے سلسلے میں بہت اچھی خبر سنائی تو انھوں نے مجھے دعا دی کہ جیسے آپ نے مجھے خوشخبری دی، اللہ تعالیٰ ایسے ہی تمھیں جنت کی بشارت دے۔ وقت گذر گیا۔ پھر ایک مرتبہ میں نے اپنے ایک وفات شدہ دوست کو خواب میں دیکھا تو ان کی خیریت دریافت کی۔ انھوں نے مجھے خیریت کی اطلاع دی اور پھر بہت دیر گفتگو کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے بشارت دی ہے کہ تم جنت میں میرے دوست ہوگے۔ تو میں نے اپنے اس دوست سے کہا کہ یہ تو خواب ہے جو میں دیکھ رہا ہوں اور خواب کوئی دلیل نہیں ہوتے مجھے ایسی دلیل بتاؤ جس سے مجھے اندازہ ہو جائے کہ یہ جو کچھ آپ نے کہا ہے، یہ سب سچ ہے۔ انھوں نے فرمایا کیوں نہیں! دیکھیے اس خواب اور میرے سچا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ کل نماز ظہر کے وقت حاکم وقت آپ کو طلب کرے گا تاکہ آپ کو قید میں ڈال دے، اس لیے اپنی حفاظت کرنا۔ یہ واقعہ اس خواب کے سچا ہونے کی دلیل ہوگا۔ جب میں سویرے

سو کر اٹھا تو غور کرنے لگا کہ میں نے ایسا کون سا جرم کیا ہے کہ حاکم وقت مجھے قید میں ڈال دے گا؟ کوئی جرم سمجھ میں نہیں آیا لیکن جونہی ظہر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوا تو سلطان کی طرف سے ہرکارے آئے اور میرا دریافت کرنے لگے۔ میں نے جان لیا کہ وہ خواب سچا ہے اور اپنے آپ کو پندرہ دن کے لیے روپوش کرلیا اور اسی اثنا میں میری طلبی بھی ختم ہوگئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض خواب سچ ہوتے ہیں ان کا اعتبار کرنا چاہیے۔

بارہویں، تیرہویں صدی ہجری اور عالم اسلام

فرمایا بارہویں اور تیرہویں صدی ہجری کا دور پورے عالم اسلام کے لیے عموماً اور برصغیر کے لیے خصوصاً، نہایت پُر آشوب دور تھا یہی وجہ ہے کہ اس دور میں ہندوستان میں جو نہایت قوی النسبت اور جید علماء دین تھے، ان کے حالات سعی بلیغ کے باوجود نہیں ملتے۔ جو کچھ ان حضرات نے لکھا، ضائع ہوگیا۔ کتب خانے جلا دیے گئے۔ بہت سے نایاب نسخے ہجرت کی نذر ہوگئے۔ جلاوطنی کی سزاؤں نے ان حضرات کے علمی مشاغل کو شدید متاثر کیا اور بچے صرف وہی جنہوں نے ہندوستان کی سیاست میں دخل نہیں دیا اور یا پھر نہایت خاموشی سے اپنے علمی اور اصلاحی کاموں میں مصروف رہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اردو ترجمۂ قرآن کریم کی وجہ سے شہرت دوام حاصل کی لیکن آپ ان کے حالات جاننا چاہیں کہ ذاتی زندگی کیا تھی؟ اسفار کتنے کیے؟ اپنے معاصرین میں ان کا کیا مقام تھا، سلوک وتصوف کی منازل کیسے طے کیں؟

تعلیم میں کس نصاب کو پڑھا وغیرہ وغیرہ تو مستند طریقے پر دس صفحات کا مواد نہیں ملتا۔ وجہ اس کی بھی یہی ہے کہ دور ہی ایسا افراتفری کا تھا کہ کون تاریخ مرتب کرتا اور سوانح نگاری کا فن کسمپرسی کا شکار ہو کر رہ گیا۔

تجسد ارواح اور علامہ اقبال کی مرزا غالب ومولانا روم سے ملاقات.

(فرمایا) تجسد ارواح، حضرات صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم کے نزدیک تو معمول کی بات ہے۔ برصغیر کے تمام مکاتیب فکر کے علماء اور صوفیاء اس مسئلے پر متفق ہیں اور ہر ایک فرقے کے اکابر نے اپنی اپنی کتابوں میں اس طرح کے بے شمار واقعات اپنے ہی اکابر کے متعلق تحریر فرمائے ہیں کہ ان کے مشائخ کو تجسد کا درجہ حاصل تھا۔ ان کی ارواح جسم کے روپ میں تبدیل ہو کر اپنی وفات کے بعد مختلف جلسوں یا محافل یا مزارات یا اپنے مسترشدین کے ہاں تشریف لائیں۔ اس لیے اس حقیقت کا انکار صرف کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے، جس کی نظر اپنے اکابرین کی کتب پر نہ ہو۔

علامہ اقبال فلسفہ اور علوم اسلامیہ کے فاضل اور توہمات سے کوسوں دور، لیکن دو روحیں ان کے پاس جسم کی صورت میں آئیں۔ خاصی دیر گفتگو جاری رہی اور جو استغراق کی کیفیت ان پر طاری تھی جب وہ اس سے باہر آئے تو ان ارواح کی تلاش ہوئی۔ کیا کیفیت استغراق میں یہ امور پیش آتے ہیں؟ یا پھر ارواح کی تشریف آوری ہوتی ہے اور وہ دنیا ہی الگ ہے؟ اور یا پھر اسی جہاں میں سالک بقائمی ہوش وحواس ارواح سے
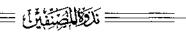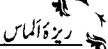
ملاقات کرتا ہے؟ سبھی باتیں کہی جاسکتی ہیں۔ یہ تینوں امور درست ہیں۔ عقلاً کچھ بھی مستبعد نہیں۔ ایسے امور کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

علامہ اقبال مرحوم پر اپنی زندگی کے آخری دور میں گریہ وزاری، گہری سوچ اور فکرِ عمیق کا غلبہ ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے دیرینہ خادم علی بخش ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو فرمایا علی بخش میرے پاس مرزا غالب بیٹھے ہوئے تھے، ابھی ابھی اُٹھ کر گئے ہیں۔ جلدی جاؤ اور انھیں واپس بلا لاؤ۔ علی بخش بے چارہ سادہ لوح خادم ان علوم و اسرار سے ناواقف، فوراً گھر سے باہر بھاگا۔ مرزا غالب کو تلاش کرتا رہا اور واپس پہنچ کر عرض کیا کہ مرزا غالب تو کہیں نہیں ملے۔ علامہ مرحوم کو بہت اصرار رہا اور فرمایا کہ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ وہ ابھی تو اس کرسی پر بیٹھے تھے، دیر تک مجھ سے باتیں کرتے رہے، تمہیں گلی میں کیسے نہیں ملے؟

انتقال سے بالکل کچھ ہی دن پہلے کا واقعہ بھی ایسے ہی ہے۔ علی بخش ان کے کمرے میں داخل ہوئے تو فرمایا باہر گلی سے مولانا روم (رحمۃ اللہ علیہ) کو بلا لاؤ۔ وہ ابھی اس دروازے سے نکلے ہیں، انھیں واپس بلاؤ۔

بے چارہ علی بخش اس دنیا سے نا آشنا فوراً گھر سے باہر لپکا اور واپس آ کر اطلاع دی کہ مولانا روم نام کا کوئی آدمی اسے نہ ملا نہ نظر آیا۔

سو یہ کیفیات پیش آتی رہتی ہیں حتیٰ کہ اہل السنۃ والجماعۃ تو اس بات کے اس حد تک قائل ہیں کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ بھی کبھی کبھی متجسد ہو کر اس عالم رنگ و بو میں تشریف لاتی ہے لیکن یہ معاملہ بہت نازک ہے۔ اگر کسی کو واقعی پیش

آ ئے تو اپنے مشائخ اور مربی سے عرض کرے اور ذرا مبالغہ نہ کرے اور جن لوگوں کو یہ کیفیت پیش نہیں آئی اور انہوں نے دوسروں کو پڑھ کر یا سن کر یا کسی کی دیکھا دیکھی جھوٹ بولا، انھیں اس دنیا میں ہی سخت ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ آخرت کا عذاب تو اس سے ماسوا ہے۔ أعاذنا الله منها.

احسان فراموش ملتوں کے مخلص رہنما

فرمایا علی برادران (محمد علی جوہر اور شوکت علی) کی ایک نہایت نادر تصویر جس میں وہ اپنی والدہ ماجدہ کے گھٹنوں پر اپنے بازو رکھ کر تشریف فرما ہیں، اپنے کتب خانے کی ایک کتاب ''عظمت رفتہ'' کی زیب و زینت ہے۔ بی اماں نے جس طرح کراچی سے کلکتہ تک اور ان کے دونوں صاحبزادوں محمد علی جوہر اور شوکت علی نے پورے برصغیر میں آزادی حاصل کرنے کی تحریک برپا کی تھی، ان سب کی خدمتوں کا صلہ تو بس اب انھیں وہیں ملا ہوگا جو حقیقی صلہ و ستائش کی بارگاہ ہے۔ ہم، ان کے بعد آنے والی نسلیں اس عظیم ماں اور اس کے بیٹوں کو کیا پیش کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ ہم ہاتھ اُٹھائیں اور منعم حقیقی سے دعا مانگیں کہ اللہ تعالیٰ ان قائدین حریت کو وہ بہتر سے بہتر جزائے خیر دے جو وہ مردہ قوموں کے زندہ قائدین کو دیتا ہے اور احسان فراموش ملتوں کے مخلص رہنماؤں کو عطا فرماتا ہے۔ راہِ مولیٰ کے اسیر ہوئے اور طبلِ ظفر پر ان کے دم سے چوٹ پڑی۔

دونوں بھائی ایک ہی جیل میں انگریزوں کی قید میں تھے اور بی اماں نے حکومت کو

درخواست دی کہ اپنے بیٹوں سے ملنا چاہتی ہیں۔ حکومتِ وقت نے اجازت دی تو یہ کہ چھوٹے بیٹے محمد علی سے ملنے کی اجازت ہے اور بڑے بیٹے شوکت علی چونکہ جیل میں بھی ''قابل اعتراض کاموں میں ملوث'' ہیں اس لیے ان سے ملاقات نہیں ہوگی۔ محمد علی نے والدہ ماجدہ کی خدمت میں خط لکھا کہ میری جنت یا تو تلواروں کی چھاؤں میں ہے اور یا پھر آپ کے قدموں کے نیچے۔ مجھے یہ بات تو گوارا ہے کہ آپ کی زیارت کے بغیر دنیا سے رخصت ہو جاؤں لیکن یہ بات قابل قبول نہیں کہ میں تو آپ کے دیدار سے سعادت اندوز ہوں اور شوکت کی آنکھیں اس نظارے کو ترسیں۔

مقدمہ کراچی میں ان کے خلاف گواہی دینے کے لیے جو صاحب پیش ہوئے ان کا نام لخت حسنین تھا۔ محمد علی اتنے ذہین تھے کہ جب گواہی شروع ہوئی تو برجستہ گواہ کے خلاف شعر پڑھا:

؎ محمد کا دشمن علی کا عدو نہ کہہ لخت حسنین اپنے کو تو

تحریک خلافت کے بعد ان کا موقف یہ تھا کہ مسلمان اب اسمبلی کے الیکشن میں حصہ نہ لیں لیکن سنی اس طبقے کی گئی جو اسمبلیوں میں بھی جا پہنچے، محمد علی جوہر اسمبلی کا تماشا دیکھنے ایک مرتبہ اسمبلی کی گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ پنڈت شام لال نہرو رکن اسمبلی نے انھیں دیکھا تو نیچے اسمبلی ہال سے آواز دی کہ مولانا جب آپ یہاں تک تشریف لے ہی آئے ہیں تو نیچے بھی آ جایئے۔ مولانا نے برجستہ جواب ارشاد فرمایا:

I have come here to look down upon you .

(میں اس بلندی سے آپ کی پستی دیکھنے آیا ہوں) اور اراکین اسمبلی کا ٹو تو لہو نہیں۔

ادب
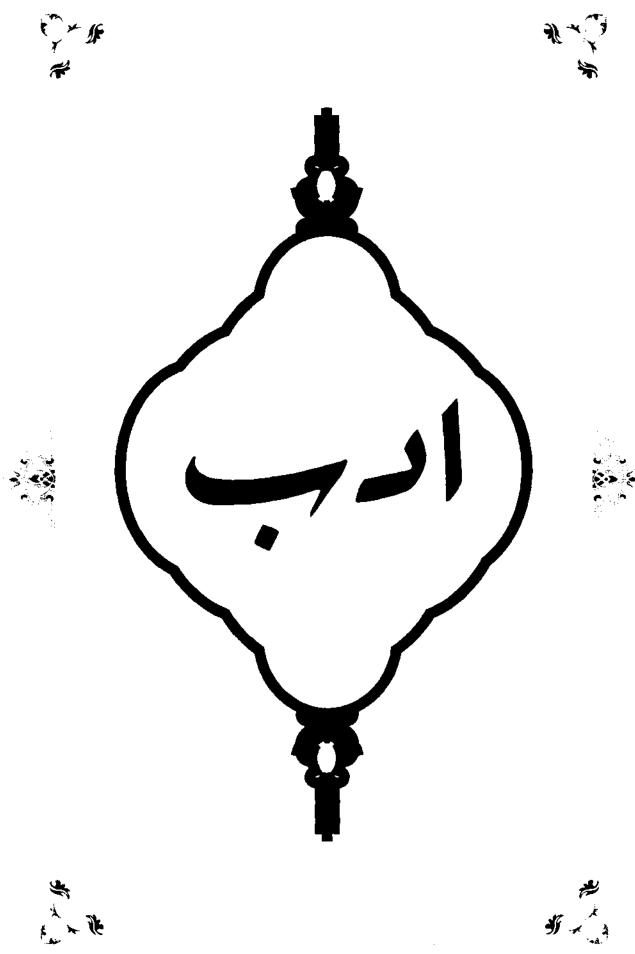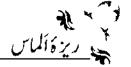
وَمِنْ اٰیٰتِہٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِکُمْ وَاَلْوَانِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْعٰلِمِیْنَ۔

(پ:۲۱، سورۂ روم، آیت:۲۲)

اور اس (اللہ تعالیٰ کے ہونے) کے دلائل میں سے، آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری بولیوں اور رنگوں کا تنوع بھی ہے۔ بے شک اس (تخلیق و اختلاف) میں بھی، اصحابِ علم و دانش کے لیے، (ہمارے وجود کے) گوناگوں دلائل ہیں۔

شاد عظیم آبادی اور مولانا تمنا عمادی کے اشعار.

(فرمایا) شاد عظیم آبادی کی ایک غزل کا مطلع ہے

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

مولانا تمنا عمادی نے اس پر اعتراض کیا کہ شہر شہر پھرے اور گھر گھر گھومے تو محاورہ ہے ملکوں ملکوں ڈھونڈنا کوئی فصیح محاورہ نہیں۔ اور پھر اس مطلع کی اصلاح کرتے ہوئے کہا:

کیا ڈھونڈھ رہے ہو رہ رہ کر ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تم دیکھ کے جس کو بھول گئے اے اہل وفا وہ خواب ہیں ہم

اسی غزل کے مقطع کو حضرت شاد عظیم آبادی نے کہا

مرغان قفس کو پھولوں نے اے شاؔد یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہے اگر تو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

تو مولانا تمنا عمادی کو پھر اعتراض ہوا فرمانے لگے کہ کاش حضرت شاؔد یہ مقطع نہ کہتے اور پھر اس غزل کے دو مقطع لکھے۔

① اور اہل قفس کو جلانے کو پھولوں نے یہ کہلا بھیجا ہے
آنا ہے اگر تو آجاؤ ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

② سنتے ہو تمؔنا پھولوں نے کیا شورِ عنادل سن کے کہا
ان کی تو ہے چاہت دو دن کی جب تک کہ ذرا شاداب ہیں ہم

نصیر حسین کی تعلّی اور مولانا عمادی کا جواب.

فرمایا ہندوستان کے صوبۂ بہار کی راج دھانی پٹنہ میں حضرت شاہ ارزاں رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں ایک مشاعرہ ہوا تو حضرت شائق مرحوم کے صاحبزادے نصیر حسین مرحوم نے بطور تعلّی اپنے استاد حضرت شاد عظیم آبادی کا یہ مطلع پڑھا:

؎ جب اہل ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا
سنتا ہے اور ہنستا ہے دیوانہ آپ کا

اور پھر چیلنج بھی دے دیا کہ اس قافیہ ورد یف اور وزن پر کوئی صاحب ایک مطلع بھی ہمارے استاد جیسا کہہ دیں تو میں جانوں۔

مولانا تمنا عمادی اٹھے اور برجستہ کہا، حضرت تیاں پھلواری رحمۃ اللہ علیہ کا مطلع ہے:

؎ ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا
بیٹھا منہ پھیر کے ہنستا ہے دوانہ تیرا

اب نصیر حسین مرحوم نے اصرار کیا کہ مولانا تمنا عمادی اپنا کوئی مطلع کہہ کر دکھائیں تو، کچھ توقف کے بعد مولانا نے اپنی غزل کا مطلع کہا:

؎ بے سمجھے کیا کہے کوئی افسانہ آپ کا
خاموش کچھ سمجھ کے ہے دیوانہ آپ کا

مخالفین اپنا سے منہ لے کر رہ گئے۔

اس غزل کے ایک اور شعر کے کیا کہنے۔ فرمایا:

؎ دے مارا اس نے شیشۂ دل کو زمین پر
کہتے ہوئے کہ ''جایئے! میرا نہ آپ کا''

؏ آتے نہیں جن کو اور دھندے ساقی.

(فرمایا) لال قلعہ دہلی میں دیوان خاص کو خاص طور پر سجایا گیا اور وزیر اعظم ہندوستان پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے۔ کنور مہیندر سنگھ بیدی سحر نے ایک نیم سیاسی اور ادبی تقریب کا انعقاد کیا تھا۔ وہ خود بھی ایک سرکاری اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور اتفاق یہ ہوا کہ وزیر اعظم ان دنوں نشہ بندی کی مہم میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ حکومت کی پالیسی تھی کہ ہندوستان میں نشے کو کنٹرول کیا جائے اور طرفہ تماشہ یہ کہ پاکستان کیا بلکہ دنیائے ادب کے بادشاہ جناب جوش ملیح آبادی بھی اس تقریب میں مدعو تھے۔ سحر اور جوش کا پُرانا یارانہ اور دونوں کو کچے گھڑے کی چڑھی رہتی تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا اور حضرت جوش ملیح آبادی نشے کی دنیا میں طلوع ہو رہے تھے۔ انھیں اس بات پہ بھی قلق تھا کہ وزیر اعظم نشہ بندی پر اتنا زور کیوں دے رہے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنے مذہب (اگر کوئی تھا)، آداب محفل اور ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز رکھے بغیر چند رباعیات سنادیں۔

؎ آتے نہیں جن کو اور دھندے ساقی
اوہام کے وہ بنتے ہیں پھندے ساقی.

جس مئے کو چھڑا سکا نہ اللہ اب تک
اس مئے کو چھڑا رہے ہیں بندے ساقی

ایک اور رباعی پڑھ دی جس میں وزیر اعظم کو ''بونا'' کہہ دیا

خم کو توڑیں گے یہ کھلونے دیکھو
چہرے جیسے پھٹے بچھونے دیکھو
جس کوہ سے گر چکے ہیں لنکا والے
اس کوہ پر چڑھ رہے ہیں یہ بونے دیکھو

کنور مہیندر سنگھ بیدی سحر کا یہ حال کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ یہ سرکاری افسر اور وہ وزیر اعظم، بھری تقریب میں وزیر اعظم کی کرکری۔ جوش صاحب تو اٹھ کر چلے گئے اور صبح جب نشہ کافور ہوا تو یہ بھی بہت پچھتائے اور سحر کو ساتھ لے کر بغرض معافی وزیر اعظم کی کوٹھی پر حاضر ہوئے۔ باریابی کی اجازت ہوئی تو یہ دونوں کھڑے رہے اور پنڈت جی بہت دیر تک سرکاری کاغذات دیکھنے میں مصروف رہے، پھر چپڑاسی کو کہنے لگے جاؤ اور وجے لکشمی اور اندرا کو بلاؤ۔ جب سب لوگ جمع ہو گئے تو جوش اور سحر کو کہا بیٹھ جائیے اور ذرا اطمینان سے وہی رباعیات سنائیے جو آپ نے کل شام مجھے سنائی تھیں۔ اب حضرت جوش کھسیانے اور کنی کترا رہے ہیں اور پنڈت جی اصرار کیے جا رہے ہیں۔ آخر انھیں وہ رباعیات سنانی پڑیں۔ پنڈت جی بہت ہنسے اور بار بار داد دیتے رہے، پھر کہنے لگے جوش صاحب میں بھی آپ ہی کا ہم خیال ہوں لیکن چونکہ حکومتِ ہند نشہ بندی کے حق میں ہے اس لیے اعلانیہ وہی کچھ کہنا پڑتا ہے جو سرکار کی رائے ہے۔

وہ شاعر جن کا منھ سات مرتبہ موتیوں اور جواہرات سے بھرا گیا.

(فرمایا) حاجی محمد جان قدسی مشہد مقدس میں رہتے تھے۔ حضرت صاحبِ قران شاہ جہان بادشاہ کی سخاوت کا چرچا ہوا تو قسمت آزمانے ہندوستان آئے۔ اس قدر قادر الکلام شاعر تھے کہ برجستہ قصیدہ کہتے تھے۔ شاہ جہان بادشاہ کے تخت سنبھالنے کی پانچویں سالگرہ جب منعقد ہوئی تو انھوں نے ایک قصیدہ کہا اور ایسا قصیدہ تھا کہ شاہ جہان سن کر پھڑک اٹھے اور انعام دینے کے لیے حکم صادر ہوا کہ قدسی کا منہ جواہرات سے بھر دیا جائے۔ یہ ایسا شاعر تھا کہ کہتے ہیں اس کا مونھ مختلف مواقع پر سات مرتبہ موتیوں اور جواہرات سے بھرا گیا تھا۔

میر انیس کی وفات اور یوسف مرزا کا قطعہ تاریخ وفات.

(فرمایا) میر انیس مرحوم نے وفات سے پہلے آخری شعر جو کہا، وہ یہ فرمایا:

ے سب عزیز و آشنا نا آشنا ہو جائیں گے
قبر میں پیوند جتنے ہیں، جدا ہو جائیں گے

اس کے بعد بیماری اور بڑھی یہاں تک کہ ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء کو انتقال ہوا۔ وفات سے پہلے یکا یک آنکھیں کھولیں، مسکرائے اور جان، جانِ آفریں کے حوالے کی۔

یوسف مرزا نے قطعہ تاریخ وفات بھی اسی مناسبت سے کہا:
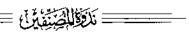
؎ وا کرد چشم چوں پے دیدار مرتضٰی
خندید مثل غنچہ و کارش تمام شد

(قبل از وفات انہوں نے امیر المومنین مولیٰ علی رضی اللہ عنہ کے دیدار کے لیے آنکھیں واکیں، زیارت ہوئی تو ہنس پڑے اور جاں سے گذر گئے۔)

اہل تشیع میں سے بہت سوں کا یہ عقیدہ ہے کہ سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چاہنے والوں کو وفات سے پہلے عالم نزع میں، ان کی زیارت کرائی جاتی ہے۔ یوسف مرزا ناصر نے اس شعر میں اسی عقیدے کو سمویا ہے۔

خواجہ میر درد اور لوگوں کی مدح وقدح.

فرمایا لوگ مدح وقدح کرتے ہیں تو بے اختیار حضرت خواجہ میر درد دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر یاد آتا ہے

؎ یاراں ز مہربانی دانند، ہرچہ دانند
ما خوب می شناسیم، اے درد، آنچہ مائیم

حقیقت یہ ہے کہ انسان پر خود اپنی حقیقت کھل جائے تو عمر بھر کسی غلط فہمی و خوش فہمی کا شکار نہ ہو۔

التمش کا صحیح تلفظ.

فرمایا برصغیر کے مسلمان حکمرانوں میں سے جن کے نام کے ساتھ آنے والا لفظ

لوگ ''اَلتمش'' پڑھتے ہیں یہ لفظ درحقیقت ''اِلتُتمِش'' (اِل تُ تْ مِ شْ) ہے اور یہ ایسے ہی پڑھا جائے گا۔

منشی فیض الدین دہلوی کی کتاب ''بزمِ آخر''.

فرمایا اردو کا محاورہ ''مردوں کی تبارک'' یا ''رجب میں خیرات'' سے کیا مراد ہوتی ہے؟ ان باتوں کو سمجھنے کے لیے منشی فیض الدین دہلوی مرحوم کی کتاب ''بزمِ آخر'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ سترھویں، مدار صاحب کا مہینہ، یا مدار صاحب کی چھڑیاں، سلونو، دسہرہ، دوالی، ہولی، خواجہ صاحب کی چھڑیاں، ان تمام رسومات کی اصلیت بھی اس کتاب سے واضح ہوتی ہے۔

ہمعصر شعراء اور توارُدِ ذہنی.

فرمایا حضرت علامہ اقبال مرحوم کی شاعری پر بھی تنقید کی گئی ہے اور اس موضوع پر مستقل کتابیں لکھی گئی ہیں کہ انھوں نے اپنے مختلف اشعار کا مضمون کس شاعر کے کس شعر سے حاصل کیا ہے۔ حکیم سنائی مرحوم سے خیال اور مضمون لینے کی بہت مثالیں بیان کی گئی ہیں۔ اس بات کو سمجھنا ہو تو اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ حضرت مومن اور مرزا اسد اللہ خان غالبؔ دونوں ہم عصر ہیں۔ حضرت مومن کا شعر ہے:

؎ کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

ٹھیک یہی مضمون حضرت غالبؔ نے ایسے باندھا ہے:

؎ گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق

پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

مضمون اور نفس مطلب دونوں شعراء کا ایک ہی ہے اور دونوں ہم عصر ہیں تو کیا یہ توارد ذہنی ہے یا ان میں سے کسی ایک نے فریقِ ثانی کا مضمون لے کر باندھ دیا ہے؟

شاعری میں مبالغہ اور حالیؔ کی مثال

فرمایا شاعری کے معاملے میں اہلِ بلاغت اس شعر کی تعریف کرتے ہیں جس میں مبالغہ پایا جائے، لیکن یہ ضروری ہے کہ بس اتنا مبالغہ کیا جائے کہ سننے والے کے دل پر اثر انداز ہو، اتنا مبالغہ کہ صاف جھوٹ نظر آنے لگے، بے کار کی بات ہے۔ علامہ الطاف حسین حالیؔ نے اس کی ایک بہت اچھی مثال دی ہے کہ کسی بازار کی ریل پیل دیکھ کر شاعر نے کہا

؎ رات دن جمگھٹا ہے، میلہ ہے

مہر و ماہ کا کٹورا بجتا ہے

کیا لغو شعر کہا ہے۔ ہاں اگر فقرہ یوں ہوتا:

''وہاں تو صبح سے شام تک کٹورا بجتا ہے''

تو یہ مناسب تھا۔
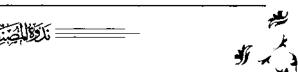
بگڑا شاعر اور بگڑا گویہ۔

(فرمایا) کسی دور میں ہندوستان میں یہ جملہ بہت مشہور تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویہ مرثیہ خواں۔

اردو محاروات اور غالبؔ۔

اردو کے محاورات غالبؔ اس مہارت اور خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں کہ محاورہ عین فطرت معلوم ہوتا ہے۔ارشاد فرمایا:

؎ رونے سے اور عشق میں بے باک ہوگئے
دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

دھویا جانا کا مطلب ہے بے حیا ہو جانا اور پاک ہونا، شُہدا بننے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ پہلے ہمارا عشق مستور تھا جب سب کے سامنے رو دیے تو راز فاش ہو گیا اور اب ہم اتنے بے حیا ہوئے کہ شُہدے ہوگئے۔

نفس زندگی اور انفاس حیات کی قضا۔

(فرمایا) نفس زندگی کی اور انفاس حیات کی قضا؟ حافظ شیرازی مرحوم و مغفور فرماتے ہیں

؎ وقت عزیز رفت، بیا، تا قضا کنیم
عمرے کہ بے حضورِ صراحی و جام رفت

میرے محبوب زندگی رخصت ہوئی تم آؤ تا کہ جو عمر بغیر صراحی و جام کے گزری ہے، تمہاری صحبت میں رہ کر ہم اس کی قضاء ادا کریں۔

مسجد کے زیرِ سایہ اِک گھر بنالیا ہے

فرمایا مرزا غالب اصلاً دہلوی نہ تھے۔ ان کے ننھیال کی، متعدد دیہات اور آگرہ شہر میں بہت بڑی جائیداد تھی۔ یہ بھی وہیں پلے بڑھے اور دہلی میں تقریباً عمر کے آخری پچاس برس صرف کیے۔ اپنا مکان کہاں سے خریدتے۔ کرایے کے گھر میں رہے۔ یہاں کالے خان نے اپنا مکان مفت دے رکھا تھا، اس میں زندگی کا ایک حصہ گذرا۔ وہاں سے اٹھے تو دوسرے مکان میں جا بسے۔ آخری مکان حکیم محمود خان کے دیوان خانے کے برابر میں مسجد کے پیچھے تھا، وہاں رہے اور اس شعر کا شانِ ورود بھی یہی ہے کہ فرمایا:

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

ان کے گھر کے سامنے لنجے، لولے، نابینا اور معذور افراد پڑے رہتے تھے اور ان کے پاس جب وسعت ہوتی تو انہی کا بندوبست کرتے رہتے تھے، پھر اپنا مکان کیسے بنتا؟

چکنی ڈلی اور غالبؔ
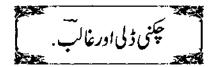
فرمایا مرزا غالب کے ہاں فیضی کی تعریف ہوئی تو انھوں نے فرمایا ''فیضی کو لوگ جتنا کچھ سمجھتے ہیں، وہ اتنے ہیں نہیں''۔ مخاطب نے پھر فیضی ہی کی کہی اور بتایا کہ جب وہ پہلی

مرتبہ اکبر بادشاہ کے دربار میں پیش ہوئے تو ارتجالاً ڈھائی سو شعر کا قصیدہ کہہ کر پڑھا۔ مرزا مرحوم بولے اور فرمایا کہ دو چار سو تو نہیں لیکن اب بھی اللہ کے ایسے بندے موجود ہیں کہ جب چاہیں دو چار شعر کہہ لیں۔ ان صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چکنی ڈلی نکال کر ہتھیلی پر رکھ لی اور عرض کیا، اس پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا غالب نے ارتجالاً گیارہ اشعار کا قطعہ پڑھ دیا۔ یہ جو ان کے دیوان میں ہے:

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی[1]

زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

فنون لطیفہ اور خواتین.

(فرمایا) مغلوں کے دور وسطیٰ میں خواتین کا ایک ایسا طبقہ وجود پذیر ہوا جو معاشرے میں بلند تعلیمی معیار اور معاشی خوشحالی کے عروج کا نتیجہ تھا۔ عوام میں تعلیم کا معیار بلند تھا۔ مرد وزن عام طور پر پڑھے لکھے ہوتے تھے، ادباء اور شعراء کی محافل سجتی تھیں بادشاہ علم کے قدر دان تھے۔ بابر بادشاہ کا اپنی فوج کے لیے فقہی احکامات خود مرتب کرنا، تفسیر لکھنا اور حضرت خواجہ عبید اللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا ترجمہ وتشریح کرنا، ہمایون کا اضطرلاب ہمایونی ایجاد کرنا، شاہ جہان بادشاہ کا ملاّ عبد الحکیم سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ کو دو مرتبہ چاندی میں تلوانا اور پورب کی علمی ترقی پر خوش ہو کر بار بار یہ کہنا کہ پورب شیراز ماست (پورب تو علم کے

① چکنی ڈلی درحقیقت اس چھالیے کی چپٹی اور چکنی ڈلی کو کہتے تھے کہ جب وہ کچی ہوتی تھی تو دودھ میں ابال لی جاتی تھی اور پان میں استعمال ہوتی تھی۔ ایسے ہی شاہان اودھ نے اپنے زمانے میں پان کے لوازمات میں چھالیے کی ایک چکنی سیاہ ڈلی شامل کر لی تھی اسے بھی چکنی ڈلی کہا جاتا تھا۔ لکھنؤ کی چکنی ڈلی تو بطور خاص مشہور تھی۔ ان صاحب کا نام سید کرم الدین حسین بلگرامی تھا۔

معاملے میں ہمارا شیرازہ ہے) حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کا فتاویٰ عالمگیری مرتب کرانا، اسے خود سننا اور بعض مسائل میں جو تسامح ہوا تھا، اس پر گرفت کرنا، یہ تمام شواہد اس حقیقت کو آشکار کرتے ہیں کہ اس معاشرے کے گلی کوچے علم کا گہوارہ تھے اور معاشی ترقی تو ایسی تھی کہ عام عوام کی شادیوں میں بھی ہیرے، جواہرات اور موتیوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ ان دونوں عوامل نے مل کر ایک ایسا طبقہ جنم دیا جو تعلیم سے آراستہ اور تہذیب سے پیراستہ تھا۔ تعلیم یافتہ، آئینِ معاشرت سے آشنا، آدابِ تمدن سے بہرور خواتین ابھریں۔ ان کا نام طوائفیں تھا۔ طوائف بمعنی جسم فروش تو مغلیہ دورِ تنزل کا طبقہ ہے وگرنہ وہ اصل طبقہ جو اس نام سے موسوم تھا، اصحابِ علم وکمال ان سے وابستگی کے اظہار کو موجب فخر جانتے تھے اور اپنی اولادوں کو تربیت کے لیے ان کے ڈیروں پر بھیجتے تھے۔ ان خواتین کی بود وباش اتنی معیاری تھی کہ ان کی محفل میں بے ادبی پر لوگ باہر نکال دیے جاتے تھے۔ درحقیقت یہ وہ خواتین تھیں جو مختلف معاشرتی اسباب کی بنا پر رشتہ ازدواج سے منسلک نہ ہوسکیں، گذرانِ حیات کے لیے کسی بھی مکروہ پیشے سے وابستگی کی بجائے فنونِ لطیفہ کی گوہر یکتا بنیں۔ فنونِ لطیفہ سے متعلقہ حضرات ان خواتین کے استاد بھی تھے اور شاگرد بھی۔

حکیم مومن خان مومنؔ، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مرید باصفا اور دہلی کے مسلم شریف شعراء میں شمار لیکن ہمیشہ "صاحب جی" جو دہلی کی مشہور اور نامور طوائف تھیں، ہمیشہ ان سے تعلق رہا لیکن یہ تعلق ان کی شرافت اور وقار کے منافی نہیں تھا۔ حضرت مومن ہی کی صحبت میں رہ کر "صاحب جی" کی شاعری میں نکھار آیا اور وہ برابر انھیں صلاح دیتے رہے۔ امۃ الفاطمہ بیگم ان کا اصل نام تھا

شاعری کا رنگ یہ تھا:

؎ رقیبوں کا جلنا کہاں دیکھتا تو سماں یہ میرے گھر میں آیا تو دیکھا

○ ○ ○

؎ کھولے ہیں اس نے پیرہن یوسفی کے بند تہہ کر رکھے، نسیم سے کہہ دو، قبائے گل

کہا جاتا ہے کہ حکیم مومن خان مومنؔ نے اپنی ایک مثنوی انہی کے لیے تصنیف کی تھی۔

نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ، جن کے خود غالبؔ مداح اور یک قالب دو جان تھے، ان کا تعلق ''نزاکت'' سے تھا۔ نواب صاحب کے دامن پر کوئی داغ نہیں بلکہ ان کی صحبت کی وجہ سے نزاکت کی شاعری میں جلا پیدا ہوئی۔ تمام دہلی ان تعلقات کو جانتی تھی اور شرفاء کی محفلیں بھی ان خواتین کے ہاں لگتی تھیں لیکن کیا مجال ہے کہ کوئی غیر معیاری فعل تو کیا، لفظ زبان پر آئے۔ اس نزاکت کو ''رجو'' کے عرف سے یاد کیا جاتا تھا۔ شادی کی تاریخ مقرر ہوئی اور عین جس دن بارات نے آنا تھا، اچانک انتقال ہو گیا۔

دہلی، حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر بغرض فاتحہ حاضری ہوئی تو یہ تو کتابوں میں پڑھ رکھا تھا کہ ''رجو'' کی تدفین حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کے احاطے میں ہوئی تھی، اس لیے دریافت کرنے پر ایک صاحب نے نشاندہی کی کہ ان کی تدفین یہاں ہوئی تھی۔ ان کے چند ایک اشعار یہ ہیں۔

بس کہ رہتا ہے یار آنکھوں میں ہے نظر بے قرار آنکھوں میں

محفل گل رخاں میں وہ عیار لے گیا دل ہزار آنکھوں میں

سرمۂ خاک پا عنایت ہو آ گیا ہے غبار آنکھوں میں

؎ کیا کیا عذاب اُٹھائے ہیں اندوہ عشق کے
جز نام اب تو کچھ بھی نزاکت نہیں رہی

○ ○ ○

؎ کیوں نہ میں قربان ہوں، جب وہ کہے ناز سے
ہم کو جفا کا ہے شوق، اہلِ وفا کون ہے؟

یہ معیاری شاعری اور طوائف ـــــ یہ تو جتنا تنزل تعلیم اور معیشت کے میدان میں آیا ہے، طوائف کا معیار اتنا ہی گرا ہے۔ پیٹ کی وہ مار پڑی کہ یہ ادارہ تباہ ہو کر رہ گیا۔ فنونِ لطیفہ کی جان، علم اور پیٹ بھراؤ ہے اور پیٹ کے دکھیا فنونِ لطیفہ میں بہت کم ابھر سکے۔ دُرگا پرشاد نے ایک کتاب لکھی تھی ''چمن انداز'' اس میں اَسی (80) سے زیادہ طوائفوں کا کلام اس نے نقل کیا تھا، اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کلام کو کہنے والیاں، اس وقت کے معاشرے میں کیا مقام رکھتی تھیں۔

بوعلی سینا اور جان اسٹوارٹ مل.

(فرمایا) آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس دہلی (All India Mohammadn Educational Conference Delhi) کی جانب سے ۱۹۱۱ء میں علامہ اقبال مرحوم کو دعوت دی گئی کہ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے ملک وملت کی جو خدمت کی ہے، اس کے اعتراف کے لیے ایک خاص اجلاس منعقد کیا جا رہا ہے اور

اس کی صدارت آپ کو ہی کرنا ہے۔ علامہ مرحوم دہلی تشریف لے گئے اور جو تقریر انہوں نے کی اور جس پر ایوان میں زوردار تالیاں بجائی گئیں اور ہر طرف سے نعرۂ ہائے تحسین، بلند ہوئے، اس کا ایک اقتباس یہ تھا کہ انہوں نے فرمایا کہ ''بیکن ڈی کارٹ'' اور ''مل'' یورپ کے عظیم ترین فلاسفر مانے گئے ہیں اور ان کے فلسفے کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے لیکن ان دونوں کی حالت یہ ہے کہ ڈی کارٹ کا طریقہ کار (Mathed) امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احیاء العلوم'' میں موجود ہے اور دونوں کے طریقے اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ اگر ڈی کارٹ عربی جانتا ہوتا تو لوگ ضرور یہ کہتے کہ اس نے یہ طریقہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سے چوری کر کے اپنے نام سے مشہور کر دیا ہے اور جان اسٹوارٹ مل نے منطق کی شکل اول پر اعتراض کیا ہے، وہی اعتراض امام فخر الدین رازی اس سے کہیں پہلے کر چکے تھے۔ اور جان اسٹوارٹ مل جو فلسفہ بیان کرتا ہے، اس کے تمام بنیادی اصول بوعلی سینا کی کتاب ''شفاء'' میں موجود ہیں۔ حضرت علامہ مرحوم کی تقریر کا یہ معیار تھا اور لوگ سن کر خوب چہک رہے تھے اور اب ایک صدی کے بعد عالم یہ ہے کہ شہروں کے شہر خالی ہیں اور علامہ اقبال مرحوم کے ان چار جملوں کو سمجھنے والا کوئی نہیں رہا۔ اس علمی انحطاط کے باوجود لوگ یہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ اسلام کی نشاءۃ ثانیہ ہوگی۔

منطق و فلسفہ پڑھنے پڑھانے والے مولوی صاحبان اب نہیں رہے۔ مدارس کا نظام تعلیم ان جاہلوں کے ہاتھ میں ہے، جنھیں خود فلسفے اور منطق سے قطعاً مناسبت نہیں اور نہ انہوں نے پڑھا ہے۔ معلوم نہیں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب التوحید کیسے پڑھاتے ہیں۔ کالجوں

اور یونیورسٹیوں کا تو ذکر ہی کیا شاید ملک بھر کے نصاب تعلیم میں ڈی کارٹ اور مل کا فلسفہ تفصیلی طور سے نہیں پڑھایا جاتا۔

علامہ اقبال کی معاشی پریشانیاں.

(فرمایا) برصغیر کے مسلمانوں کی ناقدری بھی ملاحظہ ہو۔ لاکھوں پتی تھے، نواب تھے ریاستوں کے مالک تھے، اپنی اولاد واقرباء کی شادیوں پر ہزاروں کا خرچہ اُٹھاتے تھے، ناچ گانے کی محفلوں میں بدکردار خواتین پر ہزاروں روپے لٹاتے تھے، مقدمے لڑنے کا شوق اور وکلاء کو بھرتے رہتے تھے اور علامہ اقبال جیسے نابغۂ روزگار ہمیشہ مالی تنگی اور معاشی پریشانیوں کا شکار رہے۔ جس شخص کو امت کے غم نے کھوکھلا کر دیا تھا اور شام وسحر آہ وگریہ میں گذرتے تھے، اس ہستی کا حال یہ تھا کہ اپنی اہلیہ کی بیماری میں علاج نہ کرا سکے۔

۱۹۳۵ء میں یعنی ان کی اپنی وفات سے صرف تین سال پہلے، اہلیہ محترمہ کی بیماری نے طول پکڑا اور علامہ مرحوم چاہتے تھے کہ حضرت حکیم نابینا مرحوم دہلی سے صرف ایک دن کے لیے لاہور تشریف لاکر خاتون خانہ کی امراض جانچ لیں، تو اپنے ہمدمِ دیرینہ جناب نذیر نیازی مرحوم کو خط لکھا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ مجھے معلوم نہیں حضرت حکیم نابینا صاحب کی فیس کیا ہے؟ اور اگر وہ کم فیس پر راضی ہوں تو ان کا شکر گذار ہوں گا۔ ایک برس سے میں بے کار ہوں اور خود بھی بیمار ہوں کوئی کام نہیں کر سکا اور آمدنی کا کوئی ذریعہ بھی نہیں۔ اگر حضرت حکیم صاحب رات کو دہلی سے سوار ہو کر صبح لاہور پہنچیں اور اہلیہ
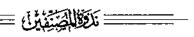
کے لیے کچھ ادویہ کا تعین کر دیں اور پھر اسی دن شام کو دہلی واپسی ہو جائے تو اس سفر کا بار اُٹھانے کو تیار ہوں۔ یہ خلاصہ ہے اس خط کا جو علامہ مرحوم نے تحریر فرمایا تھا۔ برصغیر کے کسی سرمایہ دار، نواب اور جاگیر دار کو توفیق نہ ہوئی کہ اس مردِ قلندر کو فکرِ معاش سے آزاد کر دیتا۔ یورپ جاگ رہا تھا اور امت مسلمہ گہری نیند سو رہی تھی۔

علم اور معرفت میں فرق

فرمایا عربی زبان میں جس کو علم کہتے ہیں، فارسی میں اس کا ترجمہ ہے ''دانستن''، یعنی جاننا اور یہی علم جب صوفی کا حال بن جائے تو عربی میں اسے کہتے ہیں ''معرفت'' فارسی میں ترجمہ ہوا ''شناختن''، یعنی جاننا۔ اس لیے صوفی کے پاس اگر علم ہی نہ ہوگا تو وہ معرفت کہاں سے پائے گا پھر علم اور معرفت میں اتنا ہی فرق ہے، جتنا کہ ''جاننے'' اور ''پہچاننے'' میں۔ بچہ باپ کو جب تک ''جانتا'' ہے، تب تک نہ اس کے حقوق سے آشنا ہوتا ہے اور نہ اپنے فرائض سے لیکن وہ اسے ''پہچاننے'' لگتا ہے تو پھر حقوق سے بڑھ کر غلامی اختیار کر لیتا ہے اور قرب فرائض سے بڑھ کر قرب نوافل کی منزل کو جا چھوتا ہے۔ یہ ہے فرق علم اور معرفت میں۔

میر بہادر علی حسینی کی ''نقلیات''

فرمایا حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے جیسے چھوٹی چھوٹی نصیحت اور عبرت آموز کہانیاں لکھیں اور بظاہر کہانی چھوٹی اور عالم اخلاقیات میں اس کے نتائج بہت بڑے اور عمدہ،

ایسے ہی حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کی مثنوی بھی ہے اور ایسے ہی اردو میں نقلیات (Tales) کے نام سے جو کتابیں تالیف ہوئیں بہت عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں۔نقلیاتِ ہندی اور نقلیاتِ لقمانی اب کہاں چھپتی ہیں؟ شاید کہیں کوئی قدیم نسخہ کسی لائبریری میں موجود ہو البتہ "میر بہادر علی حسینی" کی "نقلیات" اپنے ہاں کے ذخیرۂ کتب میں موجود بھی ہے اور اس کے مقدمے میں "نقلیات" کے نُسخ پر اچھی بحث بھی موجود ہے۔

آپ انسانی زندگی پر اور لوگوں کے رویے پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہو گی کہ بعض لوگ ایسی پست طبیعت کے ہوتے ہیں کہ انھیں اپنی موت سے زیادہ دوسروں کی زندگی سے نفرت ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو انعامات ان پر کیے ہوتے ہیں، وہ ان کو محسوس کر کے اور دیکھ کر خوش ہوں اور شکر ادا کریں، یہ نہیں کرتے بلکہ انھیں حقیقی مسرت اس وقت نصیب ہوتی ہے، جب وہ دوسروں کو دکھ میں مبتلا دیکھیں۔اب دیکھیے اس حقیقت کو میر بہادر حسینی مرحوم نے کہانی میں کیسے سمویا ہے۔

نقل ۱۰۵

کبڑے سے پوچھا کہو! کیا چاہتے ہو؟ تمھاری پیٹھ سب کی سی ہو جائے یا سب کی تمھاری سی، کہا ہاں! میں یہی چاہتا ہوں کیونکہ جن آنکھوں سے وے مجھے دیکھتے ہیں ان سے میں انھیں دیکھوں۔

ایک اور حکایت سنیے لیکن اسے سمجھنے کو توجہ، علم اور باریکی چاہیے۔

نقل ۶۸

ایک آزاد نے حبشی سے سوال کیا "او بے کوئلے کی صورت کچھ خدا کی راہ پر ہمیں دے۔" حبشی نے گالی دی۔ اس آزاد نے جواب دیا کہ چٹخنا کیا ہے۔ اس لطیفے پر حبشی نے ایک روپیہ دیا۔ تب اس آزاد نے دعا دی۔ "لال رہ"

ایک اور حکایت سنیئے کہ دنیا میں نیک اور سنجیدہ لوگ کیسے زندگی گذارتے ہیں اور شُہدوں کی روش کیا ہوتی ہے؟

نقل ۶۹

کسی نے کتے سے پوچھا کہ تو رستے میں کیوں پڑا رہتا ہے؟ بولا کہ نیک و بد کے پہچاننے کے واسطے۔ اس نے کہا "تو کیوں کر معلوم کرتا ہے؟" بولا "جو بھلا ہے سو مجھے کچھ نہیں کہتا اور جو بُرا ہے سو ٹھوکر مار جاتا ہے۔"

؎ ز من بجرم تپیدن کنارہ می کردی

فرمایا اس مرتبہ دہلی حاضری ہوئی تو مرزا اسد اللہ خان غالبؔ مرحوم کے مرقد پر کچھ زیادہ دیر ہوگئی۔ بار باران کا یہ شعر ذہن میں گونجتا رہا۔

؎ ز من بجرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

ترجمہ: میری محبت کی تپش کی وجہ سے تم نے مجھ سے مونھ پھیر لیا تھا۔ اب میرے مزار پر آؤ اور دیکھو کہ کیا چپ چاپ اور بے حس و حرکت ہو گیا ہوں۔

۶ نگاہ وقلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

(فرمایا) حضرت جوش ملیح آبادی کا موڈ جب خوشگوار ہوتا تھا اور پھر مجلس جو جمتی تھی، بس وہ اس مجلس کے بادشاہ ہوتے تھے۔ بڑے بڑے جغادری، قادر الکلام شعرا اور صفِ اوّل کے ادباء کا زبان کھولتے ہوئے، زہرہ آب ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنا تازہ کلام خود ہی حاضرین مجلس کو سنا رہے تھے اور کیف کا یہ عالم تھا کہ خود ان پر بھی طاری تھا، ایک حکیم صاحب (جن کا اسم گرام بوجہ ادب نہیں لے رہا.) کو خدا معلوم کیا سوجھی کہ ایک دم سے بولے اے حضرت جوش میرا بھی ایک شعر سنیئے اور اس غضب کا شعر کہا ہے کہ گویا آج آپ کی اسی مجلس کے لیے الہام ہوا ہے۔ جوش صاحب کو نا گوار تو گذرا لیکن ضبط کرتے ہوئے بولے جی ارشاد ہو۔ اے حضرت جوش سنیئے۔ جی جی ارشاد ہو۔ عرض کیا ہے:

؎ نگاہ و قلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

بھئی واہ واہ۔ جوش صاحب ذرا ملاحظہ ہو

؎ نگاہ و قلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

پھر حکیم صاحب حاضرین کی طرف متوجہ ہو کر فرمانے لگے۔ ہمارا مصرع ذرا ملاحظہ ہو، عرض کیا ہے:

؎ نگاہ و قلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

حاضرین نے داد دی۔ تو حکیم صاحب پھر بولے کہ یعنی آپ اندازہ لگائیے:

؎ نگاہ و قلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

اور پھر کئی مرتبہ اس مصرع کو دہراتے رہے۔ تمام حاضرین مجلس اس تکرار سے جب تنگ ہوئے تو یہ حکیم صاحب پھر فرمانے لگے کہ حضرت جوش! ہیں جی

؎ نگاہ و قلب میں جب تک سرور ہوتا ہے

اب دوسرا مصرع پڑھ ہی نہیں رہے تو حضرت جوش بولے

؎ یہ بندہ والد عبدالغفور ہوتا ہے

حکیم صاحب شرمندہ اور ساری محفل کشتِ زعفران بن گئی۔

۶ نہیں معلوم اب کے سال مے خانے پر کیا گذری

فرمایا جناب انعام اللہ یقین شاعر خوب تھے۔ زیادہ شہرت نہیں پائی لیکن دیکھیے کیا اچھا شعر کہا ہے۔ ہر سال 25 دسمبر کے بعد جب لوگ نئے سال (New Year) کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف نظر آتے ہیں تو بار بار ذہن میں گونجتا ہے:

؎ نہیں معلوم اب کے سال مے خانے پہ کیا گذری
ہمارے توبہ کرلینے سے پیمانے پہ کیا گذری

لٹیروں کی تعظیم میں دستر خوان بچھانا.

فرمایا حضرت مرزا مظہر جانجاناں رحمۃ اللہ علیہ میں بہت سی خصوصیات جمع ہوگئی تھیں۔ شاعر بھی تھے اور صوفی بھی، نزاکت مزاجی بھی تھی اور دہلوی بھی تھے۔ ان تمام حقائق نے ایسے اعلیٰ اخلاق کا پیکر بنا دیا تھا کہ نادر شاہی غارت گری میں جب ان کے لٹیرے بھی خانقاہ
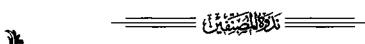
میں داخل ہوتے تو ان کی تعظیم میں بھی دسترخوان بچھتا۔ انھیں بھی کھانا کھلایا جاتا کہ گھر آئے کو کھانا کھلانا مکارمِ اخلاق میں سے ہے۔

؎ دوستاں را کجا کنی محروم تو کہ با دشمناں نظر داری

(وہ ہستی جو اپنے دشمنوں پر بھی نظر کرم فرماتی ہے، اس کے دوست نظرِ شفقت سے کیسے محروم رہ سکتے ہیں۔)

خواجہ حیدر علی آتش اور وحدۃ الوجود.

فرمایا اردو ادب میں غزل کی روایت میں جو تنوع پایا جاتا ہے اس کے ایک مظہر خواجہ حیدر علی آتش بھی ہیں۔ کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں لیکن رکھ رکھاؤ ایسا کہ ہر وقت دروازے پر ایک گھوڑا بندھا رہتا تھا۔ بانکپن یہ کہ قویٰ سب جواب دے گئے مگر تلوار باندھتے تھے۔ بوریے کا فرش اور جھلنگے پر عمر گذار دی لیکن کیا مجال کہ نوابین کی طلب کے باوجود، ان کے در دولت پر حاضری دیں۔ کبوتر بازی کے شوقین اور حد یہ کہ جس گھر میں قیام تھا اس کے در و دیوار میں بھی کبوتروں کے گھونسلے تھے، وہ اُڑ اُڑ کر سر اور شانوں پر بیٹھتے تھے اور یہ خوش ہوتے تھے، کیا آزاد وضع تھی اور کیسی مہذب قلندری تھی۔ وحدۃ الوجود کو سمجھتے تھے اور اسے بیان بھی کیا ہے۔

؎ ظہور آدم خاکی سے یہ ہم کو یقین آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے، خلوت نشین آیا

؎ خوشاوہ دل کہ ہے جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

؎ اس بلائے جاں سے آتش دیکھیے کیوں کر بنے
دل سواشیشے سے نازک، دل سے نازک خوئے دوست

؎ نظر آتی ہیں ہر سو صورتیں ہی صورتیں مجھ کو
کوئی آئینہ خانہ، کارخانہ ہے خدائی کا

؎ بت خانے کھود ڈالیے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے

شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی شاعری
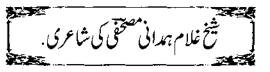
فرمایا جب سے مشرقی علوم پر عالمِ نزع طاری ہوا ہے تب سے دل سے زیادہ دماغ کی باتوں نے جگہ پالی ہے۔ عربی میں تو پھر شعراء کے دواوین مل جاتے ہیں لیکن فارسی اور اردو کی کتابیں برصغیر میں ناپید ہوتی جارہی ہیں۔ ایرانی انقلاب کے بعد جو تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی فارسی شاعری اور ادب کے نوادرات تک چھاپنے شروع کر دیئے ہیں اور اب تو کوئی ماہ جاتا ہے کہ نئی کتاب بازار کی رونق بڑھانے کی اطلاع آتی ہے۔ البتہ اردو کا سرمایہ ماند پڑتا جارہا ہے۔ اچھے اچھے شعراء کے دواوین اور ادبی تصنیفات جو کبھی ہر گھر کی زینت ہوتی تھیں، اب شہروں کے شہر خالی ہیں کہ نہیں ملتیں۔

شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہی کی کتابیں عقد ثریا، خلاصۃ العروض اور مفید الشعراء کا نام اب کیونکر کسی نے سنا ہوگا۔ ان کا وجود عنقا ہے۔ مصحفی منفرد شاعر تھے۔ انشاء اللہ خان انشاؔ کی چھکوں اور جرأت کی طراریوں کے باوجود ان کے مقابل اپنی حیثیت منوالینا انہی کا کام تھا۔ لوگ تو انھیں محض شاعر سمجھتے ہیں حالانکہ معقولات و منقولات کے عالم تھے اور سب کچھ پڑھ رکھا تھا۔ صرف عربی زبان ہی میں سو (100) سے زائد نعتیہ قصیدے کہے تھے، فارسی اور اردو کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

کلام میں میرؔ کا ایسا رنگ چھلکتا ہے کہ ناواقف تمیز نہ کر پائے۔ دیکھیے فرماتے ہیں:

؎ وہ دلِ روشن کہ تھا سارے زمانے کا چراغ
گور پر میری بنا ہے اب سرہانے کا چراغ
کر کے صدقے رکھ دیا، دل یوں، میں، اس کی راہ میں
جیسے چوراہے میں رکھتے ہیں اتارے کا چراغ

؎ تم رات وعدہ کر کے جو ہم سے چلے گئے
پھر تب سے خواب میں بھی نہ آئے، بھلے گئے
آتش میں تیرے عشق کی مانندِ چوبِ خشک
جب تک کسی نے ہم کو جلایا، جلے گئے

؎ یا یک نیاز اس سے کیوں کر کوئی بر آوے
آتا ہو سو طرح سے جس کو کہ ناز کرنا

؎ صاف آتش میں کود پڑ، جل جا
کچھ تُو شعلے سے اے پتنگ نہ پوچھ

کیسے ہے نا میرؔ کا رنگ!

انشاءاللہ خان انشاؔء کی شاعری

فرمایا: خواہشات کی کثرت اور وقت کی کمی کا احساس انسان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ لطف اندوزی کو تیز سے تیز تر کر دے۔ اسی گھن چکر میں ایک اعلیٰ پائے کا انسان سیمابی مزاج بن جاتا ہے۔ پَل میں وہ منطق وفلسفہ کی دقیق مباحث بیان کر رہا ہوتا ہے اور پَل میں وہ جنسیت زدہ انسان کا روپ دھار لیتا ہے۔ دہلی کے اعلیٰ پائے کے اہل علم جو شہدے ٹھہرے اور لکھنؤ میں پڑھ لکھ کر بھی جو بانکے بنے وہ انہی حقائق کی منہ بولتی تصویر تھے۔ انشاءاللہ خان انشاؔء کی شاعری اور اس کا پس منظر کچھ ایسے ہی معاشرے کی داستان ہے۔ بہادر ہاتھی اور چنچل ہتھنی کی شادی کے حال پر جو مثنوی لکھی گئی ہے وہ یہی تو ہے۔ معاشرے کی طلب بھی یہی تھی کہ جیسے مرغ اور بٹیر آپس میں لڑتے تھے اور ایک دوسرے کو زخمی کرتے تھے، شعراء بھی آپس میں لڑا کریں اور ایک دوسرے کی ہجو لکھیں۔ سوؔدا جو غنچے سے قلمدان مانگتے تھے، یہ اسی دور کی غمازی ہے۔ میرؔ وسوؔدا کی باہمی چپقلش، سودا نے میر ضاحک کے جو لعن طعن کی، یہ دلخراش حقائق بتاتے ہیں کہ ہندوستانی تہذیب کے دھارے کس رُخ پر بہنے کا آغاز کر رہے تھے۔ اس دور کے نمائندہ شاعر انشاءاللہ خان انشاؔء فرماتے ہیں۔

مستانہ جو میں نے قدح بھنگ چڑھایا   در عالم وحشت
تب خضر پکارا کہ ہنیا و مریا   اب دیکھ حلاوت
ہے جی میں فقیروں کے اب کھینچ لنگوٹ   اور باندھ کے ہمت
جا کنج خرابات میں ٹک گھونٹیے سبزہ   یوں کیجیے عبادت

اور یہ شعر دیکھیے کہ بھلا کوئی آدمی جو فلسفۂ وحدۃ الوجود کو علمی طور پر نہ جانتا ہو اور اس نے وجود و شہود کی مباحث کو نہ پڑھ رکھا ہو، فلسفہ و منطق کے علوم اس کے دماغ میں نہ ہوں، تو وہ یہ کیسے کہہ سکتا ہے۔

خوش رہتے ہیں چار ابرو کی بتلا کے صفائی   مانندِ قلندر
نے ہم کو غم دزد نہ اندیشہ کالا   ہے خوب فراغت
الحاد و تصوف میں جو تھا فرق ہمیں یاں   اصلاً نہ رہا کچھ
پردہ جو تعین کا محبت نے اُٹھایا   کثرت ہوئی وحدت

اسی اعلیٰ تعلیم یافتہ جناب انشاء اللہ خان انشاؔ ہی کی شاعری کا دوسرا رُخ مصحفی کی ہجو ملاحظہ ہو جو آبِ حیات میں جناب آزاد نقل کرتے ہیں:

؎ سر لون کا، منھ پیاز کا، اچور کی گردن

کس کا خاکہ اُڑایا ہے کیا لکھیے؟ لیکن دونوں پہلو دکھانے کا مقصد یہ ہے کہ سیماب طبائع ایسی ہوا کرتی ہیں۔

میر انیس کی مرثیہ نگاری.

فرمایا میر انیس کی مرثیہ نگاری کے کیا کہنے۔ایک طرف لکھنؤ کی وہ تہذیب جہاں کے وہ ساکن تھے دوسرے طرف خاندانی نسبتیں کہ پشت در پشت مادح اہل بیت رحمۃ اللہ علیہم وحاملین لوائے مرثیہ، تیسری سمت مذہبی قیودات کہ اسلام کے نام لیوا اور ایسے طبقے میں شریعت مطہرہ کے نمائندے تھے اور پھر ان سب پر مستزاد شاعری کی نزاکتوں کا لحاظ رکھنا، ان تمام قیود وحدود کے ساتھ بھی اعلیٰ درجے کی مرثیہ نگاری، انہی کا حصہ تھا۔

حضرت قاسم رحمۃ اللہ علیہ کی نو بیاہتا دلہن ہیں اور یہ آخری وقت رُخصت ہو رہے ہے، کس پُر وقار انداز سے منظر کشی کی ہے۔

؎ تم بھی کچھ اپنے باپ کی اس دم مدد کرو
آفت میں آج ہے پسر ضیغم صمد
دنیا کو بھی خدا نہ دکھائے یہ روز بد
صدقے کرو ہمیں کہ بلا ان کی ہوئے ردّ
راضی رضائے حق پہ بصد آرزو رہو
حیدر سے ہم بتول سے تم سرخرو رہو

میر تقی میر، شاعر فطرت.

فرمایا میر تقی میر شاعر فطرت ہیں۔ انسانی جذبات و احساسات کے کامل
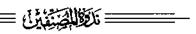
ترجمان ہیں۔ جو کچھ اندرونی طور پر ہم پہ بیتتی ہے، وہ اس کے صحیح عکاس ہیں۔ اظہارِ غم پر بھی انھیں کمال کی قدرت حاصل ہے اور محبوب سے اعراض پر بھی۔ دل کو تسلی دینا بھی انہی سے سیکھیے اور بے قراری بھی۔ زمانے کی شکایت اور پسِ مرگ رسوائی، سب احساسات کی تصویر کشی میں انھیں غیر معمولی کمال حاصل تھا۔

شمع و پروانہ کی سنیے فرماتے ہیں۔

؎ رات بھر شمع سر کو دھنتی رہی کیا پتنگے نے التماس کیا

پہلے مصرع میں ''دھنتی'' اور دوسرے میں ''التماس'' لاجواب ہے۔ میرؔ لَو کی حرکت کو جو دھننے سے تعبیر کر رہے ہیں، جہاں تک علم ہے پوری اردو شاعری اس نزاکت سے بے خبر ہے۔ اگر وہ حد درجہ حساس نہ ہوتے تو ایسا نایاب شعر کیسے وجود پذیر ہوتا۔

عزتِ نفس کا ایسا پاس ہے کہ فرمایا:

؎ میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

کہتے ہیں کہ علم انسان کی جہالت کو متعین کرتا ہے۔ ہم کچھ جانتے ہیں تو حیرت میں اضافہ ہوتا ہے کہ اچھا یہ بھی ایک حقیقت ہے اور جہالت کا ادراک ہوتا ہے کہ ہمیں تو اب تک یہ بھی معلوم نہ تھا۔ میرؔ نے ان حقائق کو صرف ایک شعر میں کیسے سمویا ہے۔

؎ یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

عالمِ ناسوت اور کشفِ غیب کے تعلق کا بیان دیکھیے:
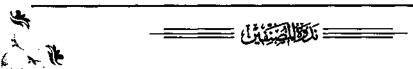
یہ جو مہلت، جسے عمر کہتے ہیں   دیکھو تو! انتظار سا ہے کچھ

''آمد بہار'' اور ''چاک گریباں'' میں کیا ارتباط ہے۔

؎ اب کے جنوں میں فاصلہ، شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ہمرہان عشق کا انجام کیا ہوا؟ دیکھیے:

؎ جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار، مرگئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مرگئے

استغناء اور بے نیازی کا نقشہ کھینچا ہے۔

؎ آگے کسو کے کیا کریں دست طمع دراز
یہ ہاتھ سو گیا ہے، سرہانے دھرے دھرے

تصوف کی بعض باریکیوں تک کو کیا خوب نظم کیا ہے۔ بعض بے ترتیب اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ میرؔ! اس بے نشاں کو پایا جان
کچھ ہمارا اگر سراغ لگا

؎ نخچیرگاہ عشق میں افراد صید سے
روح الامین کا نام شکار یوں ہوا

؎ جسم خاکی کا جہاں پردہ اٹھا
ہم ہوئے وہ، میر، سب وہ ہم ہوا

؎ عالم کسی حکیم کا باندھا طلسم ہے
کچھ ہو تو اعتبار بھی ہو کائنات کا

؎ لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر
میں ورنہ وہی خلوتی راز نہاں ہوں

؎ تری آہ کس سے خبر پایئے
وہی بے خبر ہے جو آگاہ ہے

میر تقی میرؔ شاعری کا دریا نہیں سمندر تھے.

فرمایا میر تقی میرؔ کے کیا کہنے شاعری کا دریا کیا سمندر ہیں۔ ان کے اشعار کی تعداد تیس ہزار کے قریب بیان کی گئی ہے اور یہ انہی کی کسرِ نفسی ہے کہ اپنے کو دریا کہا وگرنہ سمندر کا دعویٰ بھی کرتے تو کیا بیجا تھا۔

؎ میرؔ دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

اور پھر اس اشعار میں جو ترنم پایا جاتا ہے انھیں پڑھیے، گنگنایئے یا سنیے تو روح وجد کرتی ہے۔ ملاحظہ ہو

؎ جھکی کچھ کہ جی میں چبھی سبھی، ہلی ٹک کہ دل میں کُھبی سبھی
یہ جو لاگ پلکوں میں اس کی ہے، نہ چھری میں ہے نہ کٹار میں

؎ چھلے ہیں مونڈھے، پھٹی ہے کہنی، چسی ہے چولی، پھنسی ہے مہری
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی، ہمارا جی تو، بہ تنگ آیا

؎ مرا شورسن کے جو لوگوں نے کیا پوچھنا، تو کہے ہے کیا
جسے میؔر کہتے ہیں صاحبو! یہ وہی تو خانہ خراب ہے

؎ لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا
کب خضر و مسیحا نے مرنے کا مزا جانا

؎ جی ڈہا جائے ہے سحر سے آہ
رات گذرے گی کس خرابی میں

میرؔ کی شاعری کا اعتراف.

(فرمایا) میر تقی میر کی بہت سی خوبیاں ایسی تھیں کہ پھر شاعری میں اب تک ان کا کوئی ثانی نہ ہوا۔ ان کے معاصرین اور بعد میں جو شعراء آئے انہوں نے اعتراف کیا اور بہت وسعت ظرفی سے کام لے کر یہ اعتراف کیا کہ بعض خصوصیات میں میر تقی میر اپنی مثال آپ تھے۔ استاد ذوق مرحوم نے فرمایا:

؎ نہ ہوا، پَر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

حضرت مرزا اسداللہ خان غالب گویا ہیں کہ

؎ میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

اور دوسرے مقام پر انہوں نے حضرت ناسخؔ کی زبان سے اپنا مدعا بیان کیا ہے کہ

؎ غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ
''آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں''

حضرت امام بخش ناسخؔ، معاصر میر تقی میرؔ تھے اور انہوں نے حضرت میر کی شاعری کے محاسن کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ

؎ شبہہ ناسخؔ نہیں کچھ میرؔ کی استادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

جناب غالب نے اسی شعر کے دوسرے مصرعے کو ذریعۂ اظہار خیال بنایا ہے۔
اس حقیقت کا ادراک خود میر صاحب کو بھی تھا کہ آئندہ زمانے کے شعراء اگران کا تتبع کریں گے تو یہ کچھ سہل نہ ہوگا فرماتے ہیں۔

؎ آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد
تیز رکھیو ہر سر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

❀ ❀ ❀

۶ ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جائے میرؔ پر

فرمایا رات کیا ہے؟ غروب وطلوع آفتاب کا درمیانی وقفہ۔ گھر کو لوٹ جانے کا وقت۔ اپنی اصل کی طرف رجوع کا وقت، اطمینان اور سکون کے پانے کا وقت، معائب کی پردہ پوشی اور کہیں پردہ دری کا وقت، اظہارِ غم اور طلبِ فرحت کا وقت، جگنے اور سو جانے کا وقت، ایک تیاری کا وقفہ اور تازہ دمی ـــــ ایک ستانہ اور لشکر جرار کے عزائم کا اظہار ـــــ میر تقی میرؔ کے ہاں ملاحظہ ہو رات کو کبھی حقیقی اور کبھی استعارے کے معنی میں کیا خوب نبھایا ہے۔

؎ ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جائے میرؔ پر
برسوں سے جلتا تھا، شاید رات جل کر رہ گیا

؎ ہجر شیریں میں کیوں کہ کاٹے گا
کوہ کن یہ پہاڑ سی راتیں

؎ دل جو تھا اک آبلہ، پھوٹا گیا
رات کو سینہ بہت کوٹا گیا

؎ حدیث زلف دراز اس کے منہ کی بات بڑی
کبھو کے دن ہیں بڑے یاں کبھو کی رات بڑی

؎ غالب کہ دل خستہ شب ہجر میں مرجائے
یہ رات نہیں وہ جو کہانی میں گذر جائے
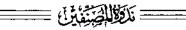
؎ بہت میرؔ پھر ہم جہاں میں رہیں گے
اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک
دکھائی دیں گے ہم میت کے رنگوں
اگر رہ جائیں گے جیتے سحر تک

؏ آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم

فرمایا لکھنوی رنگ اور دہلوی رنگ میں فرق ہے۔ اساتذہ شعر کی جانچ کرتے ہیں تو فوراً رنگ کو پہچان جاتے ہیں۔ میر تقی میرؔ نے جو بنا ڈالی ہے وہ یہ ہے:

؎ بسنتی قبا پر تیری مر گیا ہے
کفن میر کو دیجیو زعفرانی

؎ دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

؎ آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک، انتہا یہ ہے

؎ لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

اوراد و وظائف

تمام دعاؤں کا ترجمہ آزاد اور لفظی بندشوں سے مستثنیٰ ہو کر، دعا کے مفہوم کے مطابق کیا گیا ہے۔ ترجمہ سے زیادہ ترجمانی ہے اس لیے اردو محاورے کو پیش نظر رکھا جائے۔
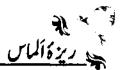
وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۔

(پ:۹،سورۃ الاعراف،آیت:۱۸۰)

اور اسماءِ حسنیٰ (اچھے اچھے نام) اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں اس لیے، اس کو انہی ناموں سے پکارو۔
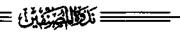
مولانا حالی کے نواسے کی مرگی اور ایک عامل کا سورۂ مزمل پڑھنا.

(فرمایا) مولانا الطاف حسین حالی مرحوم کی اکثر و بیشتر پانی پت سے دہلی آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک مرتبہ جب خواجہ حسن نظامی مرحوم حاضر خدمت ہوئے تو حالی فرمانے لگے کہ میرے نواسے کو مرگی ہے۔ حکیم و ڈاکٹر آزما لیے، کچھ نفع نہ ہوا۔ خواجہ صاحب کوئی صاحب نظر بتاؤ جو کوئی تعویذ یا دعا کرے اور اس بیماری سے شفا ہو۔ انہوں نے عرض کیا کہ راولپنڈی میں ایک صاحب ہیں جو سورۂ مزمل کے عامل ہیں۔ دم کرتے ہیں اور مریض شفایاب ہوجاتے ہیں۔ مولانا حالی فرمانے لگے کہ راولپنڈی میں تو میرے بیٹے مولانا سجاد حسین انسپکٹر تعلیمات ہیں ان کو لکھتا ہوں۔ چنانچہ خط تحریر کیا گیا اور مولانا سجاد صاحب اس عامل سے جا کر ملے اور اپنے بھانجے کی بیماری کی تفصیلات گوش گذار کیں۔ ان عامل صاحب نے اپنی نشست بدلی اور چہرہ پانی پت کی طرف کر کے ایک مرتبہ سورۂ مزمل پڑھ کر پھونک دی۔ مولانا حالی مرحوم کے نواسے کی مرگی ختم ہوگئی اور مولانا حالی اس عامل کے اخلاص کے بہت قائل ہوئے۔

شب برأت میں یہ دعا بھی پڑھی جائے.

(فرمایا) معلوم نہیں ہوسکا کہ اس دعا کی اصل کیا ہے لیکن حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ شب براۃ (پندرہ شعبان) میں جب عبادت کرے تو رات کو یہ دعا بھی مانگے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ.

اَللّٰهُمَّ إِذَا تَجَلَّيْتَ فِيْ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ عَلٰى خَلْقِكَ، فَجُدْ عَلَيْنَا بِمَنِّكَ وَكَرَمِكَ وَعِتْقِكَ، وَقَدِّمْ لَنَا مِنَ الْحَلَالِ وَاسِعَ رِزْقِكَ، وَاجْعَلْنَا مِمَّنْ عَبَدَكَ وَ قَامَ بِحَقِّكَ، اَللّٰهُمَّ مَنْ قَضَيْتَ عَلَيْهِ فِيْ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ بِطُوْلِ حَيَاتِهِ، فَاجْعَلْ مَعَ ذٰلِكَ نِعْمَتَكَ، وَ مَنْ قَضَيْتَ عَلَيْهِ بِوَفَاتِهِ، فَاجْعَلْ مَعَ ذٰلِكَ رَحْمَتَكَ، اَللّٰهُمَّ بَلِّغْنَا مَالَا تَبْلُغُ الآمَالُ إِلَيْهِ، يَا خَيْرَ مَنْ وَقَفَتِ الْأَقْدَامُ بَيْنَ يَدَيْهِ، يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ.

وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِهِ وَ صَحْبِهِ وَسَلَّم.
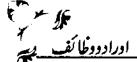
ترجمہ: اے اللہ آج رات جب آپ اپنی مخلوق پر کوئی تجلی فرمائیں تو اپنے احسان، اپنے کرم اور اپنی اس عادت کے صدقے سے کہ آپ آج رات مخلوق کو جہنم سے آزاد کرتے ہیں، ہم پر بھی وہ بہت زیادہ تجلیات برسا۔ ہمیں بھی حلال رزق کی وسعت عنایت فرما۔ ہمیں ان لوگوں میں سے کردے جنھوں نے آپ کی عبادت کی اور آپ کے حقوق کی ادائیگی کرتے رہے۔

اے اللہ آج کی رات آپ جس شخص کے متعلق بھی یہ فیصلہ فرمادیں کہ اس کی زندگی طویل کرنی ہے تو اللہ اس کی طویل زندگی میں انعامات کا بھی اضافہ فرما۔ اور جس شخص کے متعلق آپ یہ فیصلہ فرمادیں کہ اسے موت دینی ہے تو اس کی موت رحمت کی موت بنادے۔

اے اللہ ہمیں وہ کچھ دے دے جو ہماری سوچ سے بھی بالا ہو اور جتنے بھی لوگ کسی کے در پر جا کر بھیک مانگنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور انھیں جو بھی بھیک ملتی ہے، اے اللہ، اے تمام جہانوں کے پالنے والے مجھے اس تمام بھیک سے بھی کچھ زیادہ ہی عنایت فرما (کہ میں تیرے در پر سوالی بن کے آیا ہوں)۔ اے تمام جہانوں کے پالنے والے، اللہ تعالیٰ کی عنایات حضرت رسالت پناہ ﷺ اور ان کی آل اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شامل ہوں اور اللہ تعالیٰ انھیں سلامت رکھے۔

سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ کی التجا.

(فرمایا) سیدنا حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مجسم تواضع تھے۔ اس قدر حلیم الطبع تھے کہ جب لوگ آپ کے کارناموں کو سراہتے اور تعریفی کلمات کہتے تو آپ بارگاہ الٰہی میں یہ عرض کرتے۔

اَللّٰھُمَّ أَنْتَ اَعْلَمُ بِیْ مِنْ نَفْسِیْ، وَ اَنَا اَعْلَمُ بِنَفْسِیْ مِنْھُمْ، اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ خَیْراً مِّمَّا یَظُنُّوْنَ، وَاغْفِرْلِیْ مَا لَا یَعْلَمُوْنَ، وَلَا تُوَاخِذْنِی بِمَا یَقُوْلُوْنَ.

ترجمہ: اے اللہ آپ میری حقیقت کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں اور اے اللہ لوگ جو میری تعریف کر رہے ہیں، میں ان سے زیادہ اپنی حقیقت کو جانتا ہوں۔ اے اللہ مجھے یہ لوگ جتنا اچھا سمجھتے ہیں، مجھے اس سے بھی بہتر بنا دے اور اے اللہ میری ان خطاؤں سے درگذر فرما، جن کا علم، ان تعریف کرنے والوں کو نہیں ہے۔ اور اے اللہ جو کچھ لوگ میری تعریف کر رہے ہیں، میرا ان جملوں پر مواخذہ نہ فرما۔

لوگ جب کسی بھی بات پر تعریف کرنے لگیں تو اس سے جو شر پیدا ہو سکتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس سے بچنے کے لیے اس دعا کا مانگ لینا اور عاجزی سے اللہ تعالیٰ کے حضور، بار بار یہ دعا پیش کرتے رہنا، بہترین حل ہے۔

استغفار کے وہ جملے جنہیں لکھنے کے لیے گیارہ فرشتے دوڑ پڑے۔
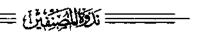
فرمایا گناہ انسانی زندگی کے لوازمات میں سے ہیں۔ ہر ایک شخص کا گناہ اس کے اپنے درجے کا ہے۔ ایک شخص ممکن ہے صرف فرض پڑھتا ہو اور سنن مؤکدہ چھوڑنے کا گنہگار ہو اور عین ممکن ہے کہ کوئی فرائض و سنن سب ادا کرتا ہو اور محض نفل چھوڑنے پر آخرت میں خسارہ مند ہو جائے۔ اس لیے ہمیشہ استغفار کرتے ہی رہنا چاہیے۔ استغفار اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کی کئی ایک دعائیں مختلف احادیث میں آئی ہیں اور ان میں سے ایک دعا وہ بھی ہے، جس کے متعلق آتا ہے کہ حضرت رسالت پناہ ﷺ نے نماز پڑھائی، ایک صحابی رضی اللہ عنہ نماز مکمل کر کے کھڑے ہوئے اور استغفار کی ایک دعا مانگی، حضرت رسالت مآب ﷺ نے دریافت فرمایا کہ کون استغفار کر رہا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ میں ـــــ عُتَیبہ ـــــ استغفار کر رہا ہوں تو ارشاد فرمایا اس اللہ کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اس دعا کا آخری لفظ ابھی تم اپنی زبان سے ادا کر ہی رہے تھے کہ میں نے گیارہ فرشتوں کو دیکھا کہ وہ اس دعا کو لکھنے کے لیے دوڑ رہے تھے کہ کون فرشتہ اس مبارک جملے کو پہلے لکھے گا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ جملے اتنے مبارک ہیں کہ فرشتے دوڑ پڑے کہ جو سب سے پہلے اسے لکھے اور اپنے پروردگار تک پہنچائے، اللہ تعالیٰ کی خوشی اس فرشتے کو نصیب ہوگی۔ تو سوچنا چاہیے کہ یہ تو ان معصوم فرشتوں کا حال ہے جو لکھنا چاہتے تھے اور وہ شخص جو اس دعا

کو پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اس سے کیسا خوش ہوگا اور آخر کیوں اس کے گناہ معاف نہیں ہوں گے؟ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتے وقت کوشش کرے کہ اخلاص سے استغفار کے یہ جملے ادا کرے۔

سُبْحٰنَكَ اَللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ وَحْدَكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ، عَمِلْتُ سُوْءًا وَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ، فَاغْفِرْلِيْ وَارْحَمْنِيْ وَ تُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ.

ترجمہ: اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تعریف بھی تیرے ہی لیے ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تیرے علاوہ کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ میں نے بہت بُرے کام کیے ہیں اور اپنی جان پر ہمیشہ ظلم کرتا رہا ہوں اے میرے مالک مجھے معاف فرمادے اور مجھ پر رحم فرما اور میری توبہ کو قبول فرما بلا شبہ تو، توبہ کو بہت قبول فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ایسی دعا جس کے پڑھنے سے سکون اور دل کا اطمینان مل جائے.
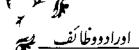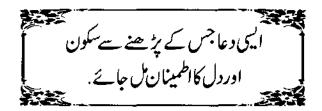
فرمایا ہمارے دور کے اکثر و بیشتر صوفیاء مطالعے کی دولت سے محروم ہیں۔ جہالت نے ان کے پاؤں پکڑ لیے ہیں اور یہ اور ان کے مرید عمر بھر اپنے خودساختہ وظائف میں مصروف رہتے ہیں اور حضرت رسالت مآب ﷺ نے جن ادعیہ کا بتایا ہے، ان کے قریب تک نہیں پھٹکتے، وجہ یہی ہے کہ یہ مشائخ کرام علم کی دولت سے محروم ہیں۔ علم تو جب آئے، جب کتابیں پڑھیں اور کتابیں جب آئیں جب تربیت میں علم کی اہمیت سکھائی گئی ہو۔ تربیت کا اہم جزو علم ہے اور جب بغیر تربیت کے خلافتیں اور اجازتیں ملیں گی تو پھر یہی کچھ ہوگا جو اب ہو رہا ہے۔ ان جاہل صوفیوں اور جذباتی مولویوں نے امت کی نیا ہی ڈبو دی۔ ان دونوں طبقات کو جب بغیر محنت کے پیسہ ملتا ہے تو یہ سب سے پہلے اپنی ذاتی اور نجی زندگی کو بدرجۂ تعیش آرام دہ بناتے ہیں، پھر اپنی اولادوں کے لیے دنیا جمع کرتے ہیں اور پھر موت آجاتی ہے، اس لیے ان کے مدارس اور خانقاہیں قابل ذکر کتابوں کے ذخیرے سے ہمیشہ سے محروم ہیں۔ دنیا میں بے سکونی کا راج ہے اور آپ جب ان جاہل صوفیوں کے ہاں جائیں اور دل کے سکون اور دماغی پریشانیوں سے نجات کے لیے کوئی دعا یا وظیفہ پوچھیں تو کبھی بھی کتاب وسنت سے کوئی وظیفہ نہیں بتائیں گے۔ محض اپنے جی سے اور اپنی رائے سے کوئی بات یا وظیفہ تجویز کر دیں گے۔ نفع ہوا تو ہوا نہ ہوا تو ان کو کیا درد سر ہے؟ حالانکہ ذرا بھی علم سے مناسبت ہوتی تو وہ دعا بتاتے جو ان مواقع

پر حضرت رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمائی تھی۔ حضرت رسالت مآب ﷺ سے بڑھ کر کون وظیفہ بتا سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کے لیے انھیں ہدایت کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اگر کسی شخص کو ان کے تلقین فرمودہ وظیفے سے اثر نہیں ہوتا تو ایسے بے یقین کا مر جانا اچھا۔

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا جو حضرت رسالت پناہ ﷺ کی خادمہ تھیں (اُم المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ) فرماتی ہیں کہ ایک عورت ہمارے گھر آئی اور اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا کہ میری یہ مدد فرمائیں کہ مجھے کوئی ایسی دعا چاہیے جسے پڑھوں تو سکون ملے اور دل کا اطمینان حاصل ہو۔ حضرت رسالت مآب ﷺ سے کوئی ایسی دعا پوچھ کر بتا دیں۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے بھی یہ بات سن لی اور ارشاد فرمایا میمونہ اپنا داہنا ہاتھ اپنے دل پر پھیرتے ہوئے یہ دعا مانگا کرو:

بِسۡمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُمَّ دَاوِنِيۡ بِدَوَائِكَ، وَ اشۡفِنِيۡ بِشِفَائِكَ، وَ أَغۡنِنِيۡ بِفَضۡلِكَ عَمَّنۡ سِوَاكَ.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے شروع کر کے اے اللہ تو اپنی دوا سے مجھے تندرست کر دے۔ اے اللہ اپنی شفا سے مجھے شفا بخش دے اور اے اللہ ایسا فضل فرما کہ تو اپنے علاوہ مجھے ہر ایک سے بے نیاز کر دے۔

کیا خوبصورت جملے حضرت رسالت مآب ﷺ نے تلقین فرمائے۔ دماغ کے سکون اور اطمینان قلب کے لیے، اس دعا کے مقابلے میں کون حضرت اور کون پیر صاحب ہیں جو

ایسی دعا تجویز فرماسکیں؟

مال میں برکت کی نبوی دعا

(فرمایا) حضرت رسالت مآب ﷺ کے تلقین فرمودہ کلمات میں بڑا اثر ہے، انسان آج بھی اپنے یقین کے ساتھ ان دعاؤں کو مانگے تو عجیب وغریب اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے کلام اور دعاؤں کی برکات اب بھی ویسی ہی ہیں جیسے کہ وہ پہلے دن تھیں اور ان دعاؤں کے ثمرات آج بھی ویسے ہی ظاہر ہوتے ہیں جیسے کہ اس زمانے میں ظاہر ہوا کرتے تھے۔ فرق صرف ہمارے یقین کا ہے۔ آج بھی اگر مومن کا یقین ہو کہ کلام کی تاثیر ظاہر ہو کر رہے گی تو آج بھی اس کلام کی تاثیر ظاہر ہوگی۔ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ دعاؤں کو سنتا ہے، اپنے بندوں کے حالات کو تبدیل فرماتا ہے، خالی ہتھیلیوں کو بھر کر لوٹاتا ہے، بندہ پرور ہے، بڑا لجپال ہے، اسے اب بھی کھلتا ہے کہ اپنے بندوں کو خالی ہاتھ لوٹائے، ہے کوئی ٹھکانہ اس کی رحمتوں کا اور ہے کوئی حد اس کے کرم کی، تو آج بھی آگ گلستان میں تبدیل ہوسکتی ہے۔

حضرت بدر بن عبداللہ مزنی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ میرے مال میں برکت نہیں ہے تو ارشاد فرمایا بدر صبح یہ دعا مانگا کیجیے:

بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى نَفْسِيْ، بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰى أَهْلِيْ وَ مَالِيْ، اَللّٰهُمَّ ارْضِنِيْ بِمَا قَضَيْتَ لِيْ، وَ عَافِنِيْ فِيْمَا

أَبْقَيْتَ، حَتّٰى لَاأُحِبَّ تَعْجِيْلَ مَا أَخَّرْتَ وَ لَا

تَأْخِيْرَ مَا عَجَّلْتَ.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت میرے وجود میں ہو، اور اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت میرے اہل وعیال اور میرے مال میں بھی ہو۔ اے اللہ میرے بارے میں آپ جو بھی فیصلہ فرمائیں، مجھے اس پر راضی رہنے کی توفیق دے اور جو کچھ بھی تو نے مجھے عنایت فرمایا ہے اس میں ہر طرح سے خیر رہے اور ایسے بھی ہو جائے کہ جو چیز دیر سے عطا فرمائی ہے، میں اس کے لیے جلدی کا شور نہ مچاؤں اور جو مہربانی آپ جلد فرمانا چاہیں میں یہ نہ جانوں کہ اسے تاخیر سے ہونا چاہیے تھا۔

حضرت بدر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ روزانہ صبح یہ دعا مانگ لیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ دعا اتنی بابرکت ثابت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے میرا کاروبار بھی چمکا دیا اور جو نفع آیا اس سے قرض بھی ادا ہو گیا اور میں اور میرے گھر والے سب خوشحال ہو گئے۔

بخار کے مریض کے لیے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی عطا فرمودہ تحریر۔

فرمایا حضرت حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے سلیمان بن سنید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھا ہے کہ انھوں نے چالیس حج کیے اور آخری مرتبہ جب روضۂ مبارک پر

حاضری ہوئی تو اونگھ آ گئی اور حضرت رسالت پناہ ﷺ کی زیارت ہوئی، آپ نے ارشاد فرمایا ارے تم اتنی مرتبہ آئے ہو اور ہماری طرف سے تمھیں کوئی تحفہ نہیں ملا، اچھا ہاتھ بڑھاؤ، پھر حضرت رسالت مآب ﷺ نے ان کی ہتھیلی پر کچھ تحریر فرمایا اور وہ تحریر بخار کے لیے تھی کہ کوئی بھی بخار کا مریض اسے چاٹ لے تو اس کا بخار اتر جائے گا۔ جو کچھ تحریر فرمایا یہ تھا۔

اِسْتَجَرْتُ بِإِمَامٍ مَا حَكَمَ فَظَلَمَ وَ لَا تَبِعَ مَنْ هَزَمَ أَخْرِجِي يَا حُمّٰى مِنْ هٰذَا الْجَسَدِ لَا يُلْحِقُهُ أَلَمٌ يُخْرِجُ بِحَاحٌ.
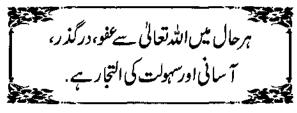
فرمایا سوچنے کا انداز بھی مختلف ہوا کرتا ہے۔ بعض افراد کا بچپن اور جوانی تعلیمی ماحول میں گذرے ہوتے ہیں اور جن لوگوں کو تعلیم کی سہولت میسر نہیں ہوتی، ان دونوں کا طرز فکر ہمیشہ یکساں ہو نہیں سکتا۔ ایسے ہی شہزادے اور بادشاہوں کی سوچ اور عام آدمی کی سوچ میں بھی بہت تفاوت ہوتا ہے، اس لیے ہر شخص کے قول و فعل کو یکساں درجے پر پرکھنا حماقت ہے۔ اس شخص کے پس منظر کو بھی

دیکھنا چاہیے۔ سکرات موت سے پناہ مانگنی چاہیے۔ حضرت رسالت مآب ﷺ نے یہی تلقین فرمائی ہے، لیکن کسی کو یہ مرحلہ پیش آ جائے تو ورثاء کو بہت زیادہ گھبرانا بھی نہیں چاہیے۔ بس اتنی ہی بے چینی جو بشریت کا تقاضا ہے، درست ہے۔ یہ سکرات اس کے گناہوں کا کفارہ بھی تو بن رہی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ نزع کا عالم آسانی سے گذر جائے اور موت کے جھٹکے نہ لگیں اس لیے کہ اس دنیا میں یہ آخری تکلیف ہے جو مومن کو پاک کر دیتی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ مومن اللہ تعالیٰ کے حضور بالکل پاک صاف ہو کر پہنچے، یہی مناسب ہے۔ یہ ان کی سوچ تھی لیکن ہم گنہگار تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے اور نہ ہی کبھی ایسی بات کہنی چاہیے۔ ہر حال میں بہتر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے عفو، درگذر، آسانی اور سہولت کی التجا رہے۔

غموں، مصیبتوں اور جیل سے رہائی پانے کے لیے دو نبوی دعائیں.

فرمایا حضرت ابوبکر بن علی رحمۃ اللہ علیہ اصفہان میں اپنے دور کے سرکاری مفتی اور بہت پائے کے مشائخ کرام میں سے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ایک ایسا فتویٰ لکھا جو بظاہر صحیح تھا لیکن حکومت وقت کی مصلحتوں کے خلاف تھا چنانچہ بادشاہ وقت نے ناراض ہو کر انھیں جیل بھجوا دیا۔ مشکلات نے ڈیرہ ڈال دیا اور تمام وقت پریشانیوں میں گذرنے لگا۔ انہی کے شہر اور زمانے میں ایک اور بزرگ
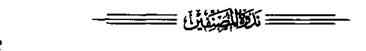
ابو بکر رازی رحمۃ اللہ علیہ نے خواب میں یہ دیکھا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں۔ جبریل امین آپ کی دائیں طرف کو کھڑے ہیں اور مسلسل اللہ تعالیٰ کی تسبیح ایسے بیان کر رہے ہیں کہ ان کے ہونٹ متحرک ہیں۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ابوبکر بن علی کو میرا پیغام دو کہ صحیح بخاری میں غم سے نجات پانے کی جو دعا آئی ہے اسے مسلسل پڑھتے رہو یہاں تک کہ اس مصیبت سے نجات ملے۔

ابوبکر رازی رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھ کھلی تو وہ جیل گئے اور حضرت ابوبکر بن علی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ پیغام دیا اور انہوں نے صحیح بخاری کی وہ روایت میں آئی ہوئی دعا مسلسل پڑھی حتیٰ کہ وہ جیل سے نجات پا گئے۔

صحیح بخاری میں غموں اور مصیبتوں سے نجات پانے کے لیے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی دو دعائیں نقل کی گئی ہیں۔ حضرت ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری رحمۃ اللہ علیہ نے باب کا عنوان یہ باندھا کہ دکھ اور غم میں جو دعا مانگنی چاہیے۔ اور پھر پہلی روایت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ذکر کی ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم دکھ اور پریشانی کی حالت میں یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ، وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ اللہ جو عظمت

والا اور بہت بردبار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کے قابل نہیں ہے
وہ جو آسمانوں کا، زمین کا اور عرش جیسی عظیم مخلوق کا پروردگار ہے۔

اور دوسری حدیث بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہی کی ہے کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم دُکھ اور غم سے نجات کے لیے یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

لَا إِلٰـهَ إِلَّا اللّٰهُ الْعَظِيْمُ الْحَلِيْمُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ الْـعَرْشِ الْعَظِيْمِ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ رَبُّ الْاَرْضِ، وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ اللہ جو بہت عظمت والا اور بہت بردبار ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ اللہ جو عرش جیسی عظیم مخلوق کو بھی پالنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ اللہ جو آسمانوں کا پروردگار ہے اور زمین کا بھی رب ہے اور بہت عزت کی جگہ، عرش، اس کو بھی پالنے والا ہے۔

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیغام بھجوایا تھا اسکے مطابق تو بظاہر یہ دوسری دعا تھی جس کے مانگنے کی تلقین حضرت ابوبکر بن علی رحمۃ اللہ علیہ کو کی گئی تھی۔ لیکن مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ زندگی میں جب کوئی مشکل، کوئی تکلیف، کوئی پریشانی آئے تو ان دونوں دعاؤں کو ہر نماز کے بعد، دن، رات وضو ہو یا نہ ہو کئی کئی مرتبہ پڑھنا چاہیے

تا کہ اللہ تعالیٰ دُکھ، غم اور پریشانی سے نجات دے۔
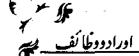
شدید ہواؤں کا طوفان اور حضرت رسالت مآب ﷺ کی دعا.

فرمایا حضرت رسالت مآب ﷺ جب شدید ہواؤں کا طوفان آتا تھا اور آندھیاں چلتی تھیں تو یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا أُمِرَتْ بِهِ، وَ أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا أُمِرَتْ بِهِ.

ترجمہ: اے اللہ ان ہواؤں کو جس خیر اور خوبی کے لیے آپ نے چلایا ہے، میں اس خیر و خوبی کو اپنے لیے بھی مانگتا ہوں اور اے اللہ ان ہواؤں میں جو شر اور خرابی ہے، میں اس سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔

ہمیشہ اپنی عاجزی، نالائقی اور بے بسی پر نظر رہے اور دعا مانگتا رہے.
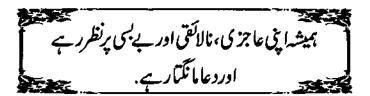
فرمایا صوفیاء کرام رحمہم اللہ میں اس بات پر اختلاف ہے کہ دعا افضل ہے یا تفویض؟ اللہ تعالیٰ سے مانگتا رہے یا پھر اس کے حوالے کر دے کہ جو بھی گذر جائے ہم اس پر راضی ہیں۔ پھر ایک رائے یہ ہے کہ اپنے حق میں تو سکوت اور رضا پر قائم رہے لیکن اُمت کے لیے، دوسرے لوگوں کے لیے، اپنے اہل خانہ کے لیے دعا مانگنا افضل

ہے۔ایک رائے یہ بھی ہے کہ دعا کا کچھ فائدہ ہی نہیں کہ سب تقدیر میں طے ہو چکا ہے، لیکن یہ مسلک ان گمراہ صوفیاء کا ہے جو جاہل ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ خود دعا تقدیر کو بھی بدل دیتی ہے۔حق بات اور محققین کا مسلک یہ ہے کہ ہر حال میں دعا مانگنا ہی افضل ہے۔ اپنی نیاز مندی، عاجزی، بے بسی کا اظہار اور قدرت خداوندی کا اعتراف، اس کا انکشاف اور اعتماد علی اللہ جیسی دولتیں دعا مانگنے ہی کی تو مرہون منت ہیں۔حضرات انبیاء علیہم السلام میں سے کون ہے جو اس دَر سے مانگتا ہوا نظر نہیں آتا، یہ نوح ہیں عرض کرتے ہیں کہ اس دنیا پر کافروں کا ایک گھر نہ رہنے دے۔ یہ ابراہیم ہیں دعا پر دعا مانگتے چلے جارہے ہیں۔اہل مکہ کو پھلوں سے رزق دینے کی دعاء، اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے دعا، اپنی نسل کی برکت کی دعا، اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے نماز پر قائم رہنے کی دعا، اپنی مغفرت کی دعا، قیامت میں شرمندہ نہ ہونے کی دعا، یہ موسیٰ ہیں فرعون اور اس کی آل کے غرق ہونے کی دعا، اپنے بھائی ہارون کی نبوت کی دعا، انشراح قلب کی دعا، یہ عمران کی اہلیہ ہیں، اپنی اولاد اور نسل کو شیطانی اثرات سے محفوظ رکھنے کی دعا اور یہ ہمارے نبی ـــــ ان پر اور ان کے تمام بھائیوں انبیاء علیہم السلام پر اللہ تعالیٰ کی بے پناہ رحمتیں نازل ہوں اور وہ جہاں بھی رہیں برکتوں اور فیوضات کے ساتھ رہیں ـــــ کی دعائیں اور آخرت میں اپنی اُمت کی بخشش، شفاعت کی دعا۔ جب سب مانگتے، دعا کرتے نظر آتے ہیں تو کون ہے جو ان حضرات علیہم السلام کی متواتر اور مستقل سنت کو چھوڑ دے اور صوفیاء کی اس بحث میں پڑے کہ دعا افضل ہے یا تفویض۔ ہمیشہ دعا مانگتے رہنا چاہیے اور اپنی عاجزی، نالائقی اور بے بسی پر نظر
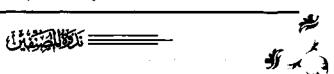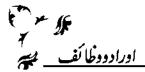
رہنی ہی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا ہی تمام مسائل کا حل ہے.
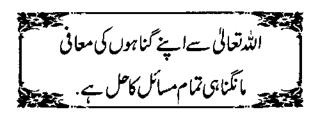
حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے شکایت کی کہ قحط سالی کے آثار نمایاں ہیں، کیا کریں؟ تو فرمایا استغفار کرو۔ ایک اور شخص نے عرض کیا کہ فقر و فاقہ بہت بڑھ گیا ہے۔ فرمایا اللہ تعالیٰ سے معافی مانگا کرو۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ باغ خشک ہوتا جا رہا ہے کیا کریں؟ ارشاد فرمایا استغفار کی کثرت کرو۔ پھر ایک شخص آیا اور اولاد کے نہ ہونے پر غم اور دُکھ کا اظہار کیا، فرمایا کہ استغفار کرو۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنا، اس کی عظمت اور گرفت کے خوف سے رو دینا اور دیر تک آنسو بہانا، منتیں کرنا اور کثرت سے دعا مانگنا زندگی کے تمام مسائل کا حل ہے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ ایک ایک مجلس میں سو سو مرتبہ سے زیادہ جو دعا مانگتے تھے؟

فرمایا حضرت رسالت مآب ﷺ اپنی ایک ایک مجلس میں سو، سو مرتبہ سے زیادہ یہ دعا مانگتے تھے۔

رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَ تُبْ عَلَيَّ، إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ.

ترجمہ: اے میرے پروردگار مجھے معاف فرما اور میرے حال پر توجہ فرما بلاشبہ تو اپنے بندوں کی توبہ کو قبول فرمانے والا، اپنے بندوں کے حال پر توجہ فرمانے والا، اور بہت معاف فرمانے والا ہے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو جو دعا خاص طور پر ارشاد فرمائی.

فرمایا جب عمر ڈھلتی ہے یا تنہائی غالب ہوتی ہے یا کوئی شخص اپنے مقصد حیات میں غیر معمولی طور پر منہمک ہوتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ یہ احساس غالب ہوتا ہے کہ مختلف ضروری کاموں کو پورا کرنے کے لیے کوئی ایک آدھ دوست، خادم، بیوی یا نوکر ضرور ہونا چاہیے، تاکہ یکسوئی میں خلل واقع نہ ہو۔ پھر غیرت اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کسی کا احسان لیں یا کسی کے در پر پڑے رہیں یا احتیاج لاحق ہو جائے، تو ہر شخص کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ وہ چلتے پھرتے بغیر کسی پر بوجھ بنے اور بغیر کسی کی خدمت کا احسان لیے، دنیا سے چلا جائے۔ مگر یہ ہو کیسے؟ کبھی کاموں کی کثرت، کبھی تنہائی اور کبھی بڑھاپا اس بات پر غور کراتا ہے اور جواب آسانی سے ملتا نہیں۔ اس کشمکش میں زندگی گذر جاتی ہے۔ مقدر غالب آتا ہے کبھی مخدوم خادم بن جاتا ہے اور کبھی خادم مخدوم،
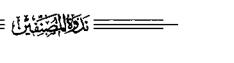
تاآنکہ موت کی گھنٹی بجتی ہے اور جو کچھ ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ البتہ یہ دعا مانگتے اور یہ تمنا کرتے ہوئے تو بہت سوں کو سنا کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہاتھ پاؤں پر لے جائے، کسی کا محتاج نہ کرے، بس چلتے پھرتے اس جہان سے گذر جائیں وغیرہ وغیرہ۔

اس سلسلے میں سب سے زیادہ مؤثر چیز جو اب تک کی زندگی میں دیکھنے میں آئی ـــــ وہ حدیث فاطمہ رضی اللہ عنہا ہے۔ جس شخص نے بھی اس پر عمل کیا ہمیشہ دیکھا کہ وہ کسی پر بار نہیں بنا، چلتے پھرتے، ہنستے کھیلتے اس دنیا سے چل پڑا۔ اور یہ نوبت ہی نہیں آئی کہ وہ کسی کی خدمت کا محتاج ہوتا۔

اس حدیث میں عجیب برکت ہے کہ نوکر چاکر، خادم، بیوی، اولاد ہر ایک کی خدمت سے بے نیاز کر دیتی ہے اور سر کسی کے احسان کا زیر بار نہیں ہوتا۔

حدیث فاطمہ کا معاملہ یہ ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا، صاحبزادی صاحبہ اپنے والد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نور عین، جگر گوشہ، عنایات کی مورد اور جسدِ اطہر کا ٹکڑا تھیں۔ تمام بیٹوں اور بیٹیوں کے انتقال کے بعد یہی تو رہ گئی تھیں کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر جاتے، اظہار شفقت فرماتے اور آنکھیں ٹھنڈی ہوتیں۔ ان کی شادی ہوئی اور رخصتی کے بعد گھر سنبھالنا دشوار تھا۔ چکی پیستے پیستے ہاتھوں کی نرم جلد سخت پڑ گئی۔ کنوئیں سے پانی بھر کر لاتیں اور مشکیزے کا تسمہ گلے میں ڈالتے ڈالتے گردن پر نشان پڑ گیا۔ گھر میں جھاڑ جھنکار کرتیں اور لباس گرد آلود ہو جاتا۔ شوہر نامدار حضرت سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی کنوئیں سے پانی نکالتے اور گھر لاتے یہاں تک کہ ان کے سینے میں درد شروع ہو گیا۔

یہ معاملہ جاری تھا کہ ایک مرتبہ مدینہ منورہ میں بہت سے قیدی لائے گئے اور ہر طرف خبر پھیل گئی۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے یہ مناسب جانا کہ وہ اپنی اہلیہ اور صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا سے کہیں کہ وہ جائیں اور اپنے لیے بھی ایک خادم مانگ لیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ داماد اگر یہ سمجھے کہ اس کے سسر کو اللہ تعالیٰ نے کچھ وسعت سے نوازا ہے تو وہ اپنے گھر کی سہولیات کے لیے کچھ طلب کرسکتا ہے، اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے اگرچہ ہمارے دور اور ملک میں عرف اس کے خلاف ہے۔

صاحبزادی صاحبہ اپنے والد محترم حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں حاضر ہوئیں تو دیکھا کہ بہت سے نوعمر لڑکے اور قیدی کھڑے ہیں لیکن اس دن حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم گھر پر تشریف فرما نہ تھے ان کی ملاقات اُم المومنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے ہوئی اور پھر یہ اپنے گھر لوٹ گئیں۔ پھر دوبارہ تشریف آوری ہوئی تو اس مرتبہ بھی یہی صورتحال پیش آئی لیکن انہوں نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا اور واپس ہوگئیں۔ تیسری مرتبہ تشریف لے گئیں تو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دولت خانہ پر تشریف فرما تھے اور ارشاد فرمایا میری پیاری چھوٹی سی بیٹی (گڑیا) کیسے آنا ہوا؟ تو وہ غلبۂ حیا سے والد صاحب سے کچھ طلب نہ کرسکیں اور صرف اتنا عرض کیا کہ سلام پیش کرنے کے لیے حاضر ہوئی ہوں، اور پھر کچھ وقفے کے بعد اپنے گھر واپس ہوئیں تو سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے تمام کتھا کہہ سنائی اور اب کے سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے انھیں ساتھ لیا اور دردولت پر حاضر ہوئے۔

اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پہلے ہی سے تمام ماجرا عرض کردیا تھا اور سوچنے کی

بات یہ بھی ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کی تمام ازواج مطہرات، ان کی مائیں رضی اللہ عنہن موجود تھیں لیکن انہوں نے اپنا پیغام پیش کرنے کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ اس لیے کہ وہ جانتی تھیں کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا کیا مقام حضرت رسالت مآب ﷺ کی نگاہ میں ہے اور وہ کتنی سمجھ دار اور شفقت بھری خاتون ہیں۔

اسی اثنا میں حضرت رسالت مآب ﷺ کے بڑے ابا زبیر بن عبدالمطلب کی صاحبزادی حضرت ضباعہ رضی اللہ عنہا بھی اسی مقصد کے لیے حاضر ہوئیں۔ اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے بھی عرض کیا کہ اللہ کے رسول، کنوئیں سے پانی کھینچ کھینچ کر میرا سینہ دکھنے لگا ہے اور یہ آپ کی چہیتی ہیں چکی چلا چلا کر ان کے ہاتھ سخت پڑ گئے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے بہت سے قیدی عنایت فرمائے ہیں تو کوئی ایک غلام ہمیں بھی عطا ہو۔

حضرت رسالت مآب ﷺ نے خاموشی سے اس درخواست کو سنا اور پھر اجتماعی اور قومی امور کی طرف توجہ دلاتے نہایت شفقت سے ارشاد فرمایا کہ دیکھو بدر میں جو لوگ شہید ہوئے تھے، ان کے یتیم بچوں، مدینہ منورہ میں جو غریب بیوہ عورتیں ہیں، وہ، اصحاب صفہ جنہیں کھانے تک کو میسر نہیں، وہ، یہ سب آپ سے زیادہ ضرورت مند ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان غلاموں کو بیچ کر حاصل شدہ رقم تو ان مصارف میں خرچ کر دوں اور پھر اس کے بعد کوئی غلام بچے گا بھی نہیں کہ تم لوگوں کی ضرورت پوری ہو سکے۔ انہوں نے پوری توجہ سے یہ بات سنی، اس ضرورت کو اپنی جانوں اور آرام پر ترجیح دی اور خاموشی سے جھکا کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

حضرت رسالت مآب ﷺ کو اپنی بیٹی سے جو محبت تھی اور فاطمہ آخر کو فاطمہ تھیں ـــــــ سلام اللہ علیہا ـــــــ اس محبت نے اپنا اثر دکھایا اور حضرت رسالت مآب ﷺ بے قراری سے اسی رات صاحبزادی صاحبہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہمارے گھر میں بس ایک ہی تو لحاف تھا اور وہ بھی کچھ اس طرح کا کہ اگر ہم اسے طول میں اوڑھتے تھے تو سر ڈھانپنے سے پاؤں کھل جاتے تھے اور پاؤں ڈھانپنے پر سر کھل جاتا تھا۔ اور اگر ہم اسے عرض میں اوڑھتے تھے تو ہم دونوں اس میں سما نہ سکتے تھے۔ ہم دونوں اس لحاف میں تھے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے اندر آنے کی اجازت پوچھی اور پھر آپ اندر تشریف لائے اور فرمایا بس بھئی دونوں اپنی اپنی جگہ پر لیٹے رہو اور پھر اپنی پیاری بیٹی کے سر کے پاس بیٹھ گئے۔ شرم و حیا سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے لحاف کھینچ کر اپنے سر پر اوڑھ لیا اور حضرت رسالت مآب ﷺ وہاں سے اٹھے اور دوسری طرف جا کر ان دونوں کے پاؤں کے درمیان اس طرح سے تشریف فرما ہوئے کہ آپ کے دونوں پاؤں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سینے کے ساتھ جا کر مل گئے۔ قدمین شریفین یخ بستہ تھے اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں ٹھنڈے اور مبارک قدموں کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اتنا چمٹائے رکھا کہ ان دونوں پاؤں کی ٹھنڈک حرارت میں تبدیل ہوگئی۔ کیا مبارک سینہ تھا سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا کہ قدمین شریفین کا ماویٰ بنا۔ کیا علوم اور برکات ہوں گے جو اس رات ان مبارک قدموں سے سینۂ مرتضوی میں منتقل ہوئے ہوں گے اور کیا راحت ہوگی جو سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے حضرت رسالت مآب ﷺ کو پہنچی ہوگی۔

ارشاد فرمایا مجھے یہ معلوم ہوا تھا (حضرت اُم المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے توسط سے) کہ آپ لوگ کسی ضرورت سے آئے تھے اب بات کرو بالکل خاموشی چھا گئی اور صاحبزادی صاحبہ اس تمام صورتحال میں ادب اور غلبہ حیا کی وجہ سے کچھ کہہ نہ سکیں۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ فرمایا کہ کل تم لوگ جو کچھ کہنے آئے تھے، پھر کہو۔ اب تیسری مرتبہ پر سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی طلب کہہ سنائی اور پھر صاحبزادی صاحبہ نے عرض کیا کہ یہ خبر سنی تھی کہ آپ کے پاس بہت سے قیدی آئے ہیں اس لیے میرا جی چاہا کہ میں بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ مجھے بھی ایک غلام عنایت فرمادیں جو آٹا گوندھ کر روٹی پکادیا کرے، کیونکہ روٹی پکانا میرے لیے بہت مشکل ہے۔ ارشاد فرمایا میری بیٹی وہ بات مان لوں جو آپ کہتی ہیں یا پھر اس غلام سے بھی بہتر چیز دے دوں؟ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فوراً انھیں متنبہ کیا اور سرگوشی کی کہ آپ یہ کہیے کہ آپ کی خوشی مجھے زیادہ عزیز ہے۔

اس جواب کو سن کر آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا میں تم دونوں کو ایسی بات کی تعلیم دوں جس کی قدر و قیمت سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ ہے؟ عرض کیا کیوں نہیں ضرور ارشاد ہو۔ پھر فرمایا میں تمہیں وہ وظیفہ بتاؤں جو مجھے جبریل امین نے بتایا ہے؟ سنو! اور دیکھو جب آپ لوگ بستر پر سونے کے لیے لیٹ جاؤ تو اللہ تعالیٰ کی تسبیح، حمد اور تکبیر پڑھا کرو۔

اب حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وظیفے کی کیا ترتیب بتائی تھی، مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مختلف شاگردوں رضی اللہ عنہم کی روایات مختلف ہیں۔

اس لیے یا تو حضرت رسالت مآب ﷺ نے ہی مختلف ترکیبیں بتائی ہوں گی اور یا پھر بعد کے کسی دور میں ان روایات میں تبدیلی آئی ہو گی، لیکن اب ہمارے لیے سب سے اچھا اور بہتر راستہ تو یہ ہے کہ کوئی شخص ان تمام روایتوں اور تراکیب پر عمل کر لے اور یہ بھی بالکل درست ہے کہ کوئی شخص ان تمام تراکیب میں سے کسی بھی ایک ترکیب کو اپنا لے اور اس پر عمل شروع کر دے۔ تو اسے بھی ان شاء اللہ وہ تمام برکات اور منافع نصیب ہوں گے جو تمام روایات پر عمل کرنے والے کو نصیب ہوں گے۔

پہلی روایت میں تو یہ آتا ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ رات کو جب تم سونے کے لیے لیٹو تو

① سبحان اللہ	۳۳ مرتبہ
② الحمد للہ	۳۳ مرتبہ
③ اللہ اکبر	۳۴ مرتبہ

پڑھ کر یہ دعا مانگ لیا کرو۔ وہ دعا آخر پر آ رہی ہے۔

دوسری روایت میں یہ آتا ہے کہ ارشاد فرمایا جب تم سونے کے لیے لیٹو تو

① اللہ اکبر	۳۴ مرتبہ
② سبحان اللہ	۳۳ مرتبہ
③ الحمد للہ	۳۳ مرتبہ

پڑھ کر یہ دعا مانگ لیا کرو۔ وہ دعا آخر پر آ رہی ہے۔

تیسری روایت میں آتا ہے کہ ارشاد فرمایا
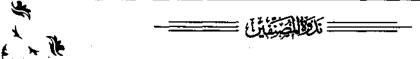
① سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ

② الحمد للہ ۳۴ مرتبہ

③ اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ

پڑھ کر یہ دعا مانگ لیا کرو۔ وہ دعا آخر پر آ رہی ہے۔

غالباً یہ تینوں روایات ایک ہی طرح کی ہیں صرف ترتیب اور کلمات کی تعداد میں فرق ہے۔

چوتھی روایت میں یہ آتا ہے کہ ارشاد فرمایا جب تم سونے کے لیے لیٹو تو

① سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ

② الحمد للہ ۳۳ مرتبہ

③ اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ

④ لا إلہ إلا اللہ ایک مرتبہ

پڑھ لیا کرو اور پھر یہ دعا مانگ لیا کرو۔ وہ دعا آخر پر آ رہی ہے۔

اور پانچویں روایت میں یہ آتا ہے کہ ارشاد فرمایا جب تم سونے کے لیے اپنے بستر پر لیٹو تو

① سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ

② اللہ اکبر ۳۳ مرتبہ

③ لا إلہ إلا اللہ ۳۴ مرتبہ

پڑھ کر یہ دعا مانگ لیا کرو۔ دعا آخر پر آ رہی ہے۔

ان پانچوں روایات پر عمل کرنے کی آسان صورت ایک یہ بھی ہے کہ انسان جب
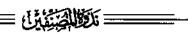
سونے کے لیے بستر پر لیٹے تو

① سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ

② الحمد للہ ۳۴ مرتبہ

③ اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ

④ کلمہ طیبہ ۳۴ مرتبہ

پڑھ لیا کرے البتہ ان پانچوں روایات میں مزید تین باتیں سمجھنے کی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ان پانچوں روایات میں جو کچھ بھی تسبیح، تحمید، تکبیر یا کلمہ طیبہ پڑھا جائے گا سب کی مکمل تعداد سو (۱۰۰) ہو جائے گی۔ اسی لیے حضرت رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ سونے سے پہلے تمہارا یہ سو مرتبہ ذکر کرنا تمہاری زبان کے سو جملے ہیں لیکن قیامت میں جب یہ نامہ عمل میں تولے جائیں گے تو دس گنا بڑھ کر ایک ہزار (۱۰۰۰) ہو جائیں گے۔

یہ بھی اللہ تعالیٰ کی کیسی مہربانی ہے کہ اپنے بندے کی نیکیوں کو اصل عمل سے ۱۰ گنا بڑھ کر قبول فرمائے۔

دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ جن دو آخری روایات میں کلمہ طیبہ کا ذکر ہے وہاں حدیث میں تو اگرچہ یہ آ رہا ہے کہ پڑھنے والا " لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ " پڑھے لیکن کوئی شخص اگر پورا کلمہ طیبہ " لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ " بھی پڑھ لے تو غالباً کچھ حرج نہ ہوگا بلکہ فائدے ہی کی بات ہوگی۔

اور تیسری بات یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد وہ دعا ہے، جو ہمیشہ مانگ کر سونا چاہیے۔
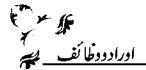
امت نے شاید یہ دعا بھلا ہی دی ہے۔ چنانچہ ہم نے کسی شخص کو نہیں دیکھا جو اِن تسبیحات کے بعد اپنے مریدوں یا مقتدیوں کو یہ دعا مانگنے کی بھی تلقین کرتا ہو۔ حالانکہ یہ دعا صحیح مسلم میں بھی آئی ہے۔لیکن بات یہ ہے کہ یہ تمام باتیں مطالعے سے آتی ہیں اوراس امت نے اب پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔حکمران کیا اور رعایا کیا، بڑے کیا اور چھوٹے کیا، پیر ومولوی کیا اور مرید ومقتدی کیا، کوئی نہیں پڑھتا۔ اس دعا کی خصوصیت اور اہمیت کے لیے کیا یہ بات تھوڑی ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنی پیاری بیٹی کو رات سونے سے پہلے اس دعا کو پڑھنے کی تلقین فرمائی تھی؟

ارشاد فرمایا کہ اس وظیفے کو پڑھنے کے بعد بیٹی، اللہ تعالیٰ سے یوں عرض کیا کرو۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوَاتِ السَّبْعِ وَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، رَبَّنَا وَ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ، مُنْزِلَ التَّوْرَاةِ وَ الْاِنْجِيْلِ وَالزَّبُوْرِ وَ الْفُرْقَانِ، أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ ذِيْ شَرٍّ، وَ مِنْ شَرِّ كُلِّ دَابَّةٍ أَنْتَ آخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا، أَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ، وَ أَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ، وَ أَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ

فَوْقَكَ شَيْءٌ، وَ أَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ،

اِقْضِ عَنِّيْ الدَّيْنَ وَ أَغْنِنِيْ مِنَ الْفَقْرِ.

ترجمہ: اے ساتوں آسمانوں اور عرش جیسی بڑی مخلوق کے پالنے والے اللہ۔ اے ہمارے اور دنیا کی ہر چیز کے پالنے والے، تورات، انجیل، زبور اور فرقان (قرآن کریم) کو نازل کرنے والی پاک ذات، میں دنیا کے ہر ایک شریر کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں۔ اے اللہ تیری تمام مخلوق جو تیرے ہی قبضے میں ہے، میں اس مخلوق کی ہر ہر شرارت سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ تو سب سے پہلے اور تجھ سے پہلے کچھ نہیں اور اے اللہ تو سب سے آخر پر اور تیرے بعد بھی کچھ نہیں۔ اور اے اللہ تو ایسا ظاہر کہ تجھ سے بڑھ کر کوئی ظاہر نہیں اور اے اللہ تو ایسا چھپا ہوا کہ تجھ سے زیادہ پوشیدہ کوئی نہیں۔ اے میرے پروردگار میرے قرض کو ادا فرما دے اور مجھے ضروریات زندگی میں کسی کا محتاج نہ فرما، بے نیاز کر دے۔

یہ ہے وہ دعا جو وظیفہ پورا کر کے بہر حال مانگنی ہے۔

پھر حضرت رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا علی اور فاطمہ یہ پڑھا کرو کہ یہ تم دونوں کے لیے غلام سے بھی بہتر بات ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں۔

حضرت رسالت مآب ﷺ نے یہ وظیفہ صرف اپنی صاحبزادی صاحبہ اور مکرم و محترم داماد ہی کو نہیں بتایا بلکہ پوری امت کو اس وظیفے کے پڑھنے کی تلقین فرمائی ہے اور تجربہ
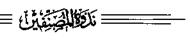
یہ ہے کہ جو شخص بھی اس وظیفے کو پابندی کے ساتھ پڑھتا رہتا ہے، وہ جتنے بھی کام کرے تھکتا نہیں ہے اور اگر تھک بھی جائے تو اس کی تھکن اس وظیفے سے دور ہو جاتی ہے اور یہ تھکن اس کی صحت کو نقصان نہیں پہنچاتی۔ صاحبزادی صاحبہ رضی اللہ عنہا نے تھکن اور غلام کی خدمت کے لیے ہی تو درخواست کی تھی اور آپ نے اس کا بدل یہ وظیفہ بتا دیا۔ تو اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص یہ وظیفہ پڑھتا رہے گا تمام عمر اسے کسی خادم کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی بغیر کسی کا احسان لیے، بغیر کسی کا محتاج ہوئے، ہنستا کھیلتا، ایمان کے ساتھ اور برکتوں کو سمیٹتے ہوئے اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچ جائے گا۔

استغفار کے وہ کلمات جنہیں کثرت سے پڑھنا چاہیے اور ''سید الاستغفار''

فرمایا انسانوں میں کون ایسا ہے، جس سے لغزش نہیں ہوتی۔ ہر شخص کی لغزش اس کے اپنے درجے کے موافق ہوا کرتی ہے۔ عام انسانوں کی نافرمانی گناہ اور معصیت کہلاتی ہے اور خواص کی لغزش خلاف اولیٰ کہلاتی ہے۔ انسانوں ہی میں حضرات انبیاء علیہم السلام جو کہ مقامِ قیادت پر فائز ہوتے ہیں وہ اگرچہ معصوم ہوا کرتے ہیں لیکن خلافِ اولیٰ باتیں جو ان کی زندگی میں پیش آئیں اور اللہ تعالیٰ نے انھیں آگاہ بھی فرمایا وہ ان کے اپنے مقام کے اعتبار سے خلافِ اولیٰ ہیں۔ عام انسانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے وہ تو سر بسر بھی چھوٹ جائیں تو غنیمت جانیے۔ صغائر پر اصرار ان کے لیے کبائر کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور کبائر پر عدم استغفار، کبھی تو کفر تک پہنچا کر ڈبوتا ہے اور کبھی خاتمہ بالخیر خطرے
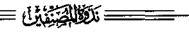
میں پڑ جاتا ہے۔ اسی لیے حضرت رسالت مآب ﷺ ہمیشہ توبہ واستغفار کی طرف توجہ دلاتے رہتے تھے اور برابر یہ تلقین فرماتے رہتے تھے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی اور ان کے نتائج سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ ایک مرتبہ توبہ کا سب سے بہتر طریقہ یہ ارشاد فرمایا کہ جب بھی کوئی گناہ سرزد ہوجائے تو اچھی طرح نہا دھو کر یا پھر اچھی طرح وضو کر کے دو نفل نمازِ توبہ کے پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے خوب اچھی طرح معافی مانگنی چاہیے اور پھر اللہ تعالیٰ سے یہ اُمید رکھنا مستحب اور نیکی کا کام ہے کہ اس پاک ذات نے اس گناہ کو معاف فرمادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسہ کرنا چاہیے، آئندہ اس گناہ کا ارتکاب نہ کرنے کا عزم کر کے نیکی کے کاموں میں مصروف ہوجانا چاہیے۔

شریعت نے ایک طریقہ یہ بھی بتایا کہ جتنا بڑا گناہ ہوجائے، اتنی ہی بڑی نیکی کرنی چاہیے۔ خود سوچ کر فیصلہ کرنا چاہیے کہ میں نے گناہ کتنا بڑا کیا ہے اور اب کون سی ایسی نیکی کروں جو اس گناہ کو دھونے میں مؤثر ثابت ہو اور پھر اگر وہ گناہ لوگوں کے سامنے کیا ہے تو نیکی بھی لوگوں کے سامنے کرنی چاہیے اور اگر گناہ تنہائی میں ہوا ہے تو یہ نیکی بھی چپکے سرانجام دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قاعدے کی یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ نیکیاں گناہوں کو دھو دیتی ہیں۔

توبہ کا تیسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ دعائیں کثرت سے پڑھنی چاہئیں جن میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی گئی ہے۔ مثلاً حضرت رسالت مآب ﷺ اپنی ایک ایک نشست میں سو سو مرتبہ استغفار کا یہ جملہ ارشاد فرماتے تھے۔
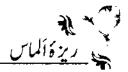
① أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَ أَتُوْبُ إِلَيْهِ.

ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں کہ وہ ایسی ذات ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں وہ ہمیشہ زندہ اور ہمیشہ قائم رہنے والا ہے اور میں اپنے اس گناہ سے توبہ کرتا ہوں۔

کبھی کبھی یہ جملہ ادا فرماتے:

② رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَ تُبْ عَلَيَّ إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الْغَفُوْرُ.

ترجمہ: اے اللہ مجھے معاف فرمادے اور اے اللہ میری توبہ کو قبول فرمالے بلاشبہ تُو تو اپنے بندوں کی توبہ کو بہت زیادہ قبول فرماتا ہے اور تُو تو بہت زیادہ بخشنے والا ہے۔

کبھی کبھی یہ جملہ ارشاد فرماتے:

③ أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ وَ أَتُوْبُ إِلَيْهِ.

ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں اور اس کے سامنے اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہوں۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے تھے کہ ہم کبھی کبھی گنتے تھے اور حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک ایک نشست میں ان تین جملوں میں سے کوئی ایک استغفار کا جملہ سو مرتبہ عرض کرتے تھے۔ اسی لیے آپ نے ایک مرتبہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ قیامت میں سب سے زیادہ خوش قسمت انسان وہ ہوگا، جس کے نامہ اعمال میں کثرت سے استغفار ہوگا۔

توبہ واستغفار کی ایک اور دعا جس کی نسبت حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے کی گئی ہے بلکہ یہاں تک بھی کہا گیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام بھی توبہ واستغفار کے لیے یہی دعا مانگا کرتے تھے، وہ یہ ہے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تُبْتُ إِلَيْكَ مِنْهُ، ثُمَّ عُدْتُّ فِيهِ، وَ أَسْتَغْفِرُكَ لِمَا أَعْطَيْتُكَ مِنْ نَفْسِي ثُمَّ لَمْ أُوفِ لَكَ بِهِ، وَ أَسْتَغْفِرُكَ لِلنِّعَمِ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ فَتَقَوَّيْتُ بِهَا عَلىٰ مَعَاصِيكَ، وَ أَسْتَغْفِرُكَ لِكُلِّ خَيْرٍ أَرَدْتُّ بِهِ وَجْهَكَ فَخَالَطَنِي فِيهِ مَا لَيْسَ لَكَ، اَللّٰهُمَّ لَا تُخْزِنِي فَإِنَّكَ بِي
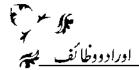
عَالِمٌ، وَ لَا تُعَذِّبْنِي فَإِنَّكَ عَلَيَّ قَادِرٌ.

ترجمہ: اے اللہ پہلے تو میں ان تمام گناہوں سے معافی اور تیری بخشش چاہتا ہوں، جو گناہ میں نے اب تک کی زندگی میں کر کے، توبہ کی تھی اور پھر اپنی شامت نفس سے دوبارہ انہی گناہوں میں مبتلا ہوگیا۔ پھر اے اللہ میں ان تمام گناہوں سے بھی معافی مانگتا ہوں جو اپنی ذات کے متعلق کوئی وعدے میں نے آپ سے کیے اور پھر وہ وعدے پورے کرنے کی بجائے، پھر انہی گناہوں کو دوبارہ کرلیا اور اے اللہ ان تمام گناہوں سے بھی معافی مانگتا ہوں جو میں نے اس لیے کیے کہ تو نے تو اپنی نعمتیں مجھے دیں لیکن میں نے ان نعمتوں کو تیری نافرمانی کا ذریعہ بنالیا۔ اے اللہ وہ تمام گناہ بھی معاف فرما دے کہ میں نے کوئی نیکی کا کام، جو صرف تجھے راضی اور خوش کرنے کے لیے کرنا تھا لیکن میں نے اس نیکی کے کام میں تیرے علاوہ کسی اور کے خوش کرنے کی نیت کر کے اپنی نیت اور نیکی کو کھوٹا کر دیا۔

اے اللہ مجھے میرے گناہوں کی وجہ سے دوسروں کے سامنے ذلیل نہ کر کہ تو تو میرے کرتوتوں کو خوب جانتا ہے اور اے اللہ مجھے عذاب بھی نہ دے کہ تجھے تو مجھ پر ہر طرح کی قدرت حاصل ہے اور میں تیرے سامنے بالکل عاجز، بے اختیار اور بے بس ہوں۔

پھر استغفار کے ان تمام جملوں اور دعاؤں میں ایک ایسا استغفار کا ورد اور وظیفہ بھی

ہے، جسے سید الاستغفار کہا گیا ہے۔ یعنی استغفار اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کے جتنے بھی جملے اور دعائیں آئی ہیں، ان تمام دعاؤں میں سب سے بہتر اور سب سے افضل دعا یا ورد۔

اس دعا یا ورد "سید الاستغفار" کی اتنی اہمیت اور افضلیت ہے کہ حضرت رسالت مآب ﷺ نے فرمایا جو شخص ان جملوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے صبح کے وقت معافی مانگ لے اور پھر دوپہر میں موت آ جائے اور پھر یقین کرے کہ اگر اللہ نے چاہا تو اب میرے گناہ معاف ہو گئے ہیں یا پھر شام کو ان جملوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لے اور رات کو چل بسے اور اس کا یہ یقین ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اب میری تمام عمر کے گناہ معاف ہو گئے ہیں تو یہ شخص (اپنی اس توبہ، یقین، اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس ذات پاک سے حسن ظن کے سبب) جنت میں چلا جائے گا۔ اسی لیے ایک روایت میں حضرت رسالت مآب ﷺ نے حکم دیا کہ جس شخص کو بھی یہ "سید الاستغفار" کے جملے معلوم ہو جائیں اسے چاہیے کہ وہ یہ "سید الاستغفار" میری اُمت کے دوسرے گنہگاروں تک بھی پہنچائے۔

شاید یہ اسی احساس ذمہ داری کا نتیجہ تھا اور حضرت رسالت مآب ﷺ کے فرمان کی تعمیل تھی کہ مشکوٰۃ شریف اور پھر صحیح بخاری شریف پڑھاتے ہوئے "سید الاستغفار" کی یہ روایت آئی تو استاد گرامی قدر حضرت مولانا نور محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسے یاد کرنے کا حکم دیا، پھر اگلے دن اسے زبانی سنا اور حکم دیا کہ روزانہ صبح و شام اور سونے سے پہلے بھی اسے کم سے کم ایک مرتبہ ضرور پڑھا جائے۔
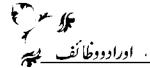
وقت گذر گیا اور پھر ''سید الاستغفار'' پر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے جب کچھ علمی تحقیق کی نوبت آئی تو اندازہ ہوا کہ احادیث کی مختلف کتابوں، مختلف حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ''سید الاستغفار'' کے مختلف الفاظ مروی ہیں تو تقریباً ان تمام روایات کو جمع کرا کے اسے مرتب کروایا کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت شدہ تمام الفاظ ''سید الاستغفار'' میں آجائیں۔

اب جو ''سید الاستغفار'' مرتب ہوسکا ہے وہ یہ ہے۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي، أَنْتَ إِلٰهِيْ، أَنْتَ خَلَقْتَنِيْ، وَأَنَا عَبْدُكَ، آمَنْتُ بِكَ مُخْلِصاً لَكَ دِيْنِيْ، وَ أَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَ وَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَ أَبُوْءُ لَكَ بِذَنْبِيْ، وَ أَعْتَرِفُ بِذُنُوْبِيْ، أَتُوْبُ إِلَيْكَ مِنْ سَيِّئِ عَمَلِيْ، مِنْ شَرِّ عَمَلِيْ، وَ أَسْتَغْفِرُكَ لِذُنُوْبِيَ الَّتِيْ

لَا يَغْفِرُهَا إِلَّا أَنْتَ، فَاغْفِرْلِي ذُنُوبِي، فَإِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ.

ترجمہ: اے اللہ تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں۔ اے اللہ تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تو ہی میرا پروردگار اور تو ہی میرا معبود ہے۔ تو نے ہی مجھے پیدا کیا ہے اور بلاشبہ میں تیرا ہی بندہ ہوں۔ میں تجھ پر ایمان لایا اور میں تمام عبادات صرف تیرے ہی لیے کرتا ہوں اور میں اپنی بساط بھر تیرے ساتھ کیے ہوئے عہد و پیمان پر قائم ہوں اور میں نے جو بُرے کام کیے ہیں ان کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ میں ان تمام انعامات کا اعتراف کرتا ہوں جو تو نے مجھ پر کیے اور پھر میں نے جو تیری نافرمانی اور جو گناہ کیے، ان سب کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں اپنے ان تمام بُرے کاموں سے تیرے سامنے توبہ کرتا ہوں اور اپنے ان گناہوں کے شر سے بھی توبہ کرتا ہوں۔ اے اللہ میں ان تمام گناہوں سے معافی مانگتا ہوں جنہیں تیرے علاوہ کوئی معاف نہیں کرسکتا۔ اے اللہ میرے تمام گناہ معاف فرما اور حقیقت یہ ہے کہ تیرے علاوہ کوئی بھی ان گناہوں سے معافی دینے والا نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے اور توبہ کرنے کے لیے یہ وہ بہترین الفاظ ہیں جنہیں یاد کرنے اور صبح و شام پڑھنے کا حکم حضرت رسالت مآب ﷺ نے اپنے ہر امتی کو دیا بھی ہے اور یہ حکم بھی فرمایا ہے کہ اس ''سید الاستغفار'' کی تعلیم ہر مسلمان کو دی جائے۔

چاہیے کہ ہر شخص اسے نہ صرف خود صبح وشام پڑھے بلکہ اپنے بچوں کو اسے زبانی یاد کرادینا چاہیے تاکہ گناہوں کے وبال اور نحوست سے بچا جاسکے۔

جو دعا کے دَر کھولتے ہیں وہی قبولیت کا دَر بھی کھولتے ہیں۔

(فرمایا) دعا افضل ترین عبادات میں سے ہے۔ زبان سے مانگنی چاہیے اور زبان کے علاوہ دل سے بھی مانگنی چاہیے۔ دل ہی دل میں بغیر زبان ہلائے بس اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حوائج اور ضروریات رکھتے رہنا چاہیے۔ یہ جائزہ لیتے رہنا کہ میری دعائیں مقبول ہوئیں یا نہیں ہوئیں، زیادہ مناسب نہیں، بس کسی وقت اس غرض سے غور کرلیا جائے کہ اگر قبول ہوگئی ہوں تو شکرادا کروں۔ باقی اس معاملے کی کھوج میں نہ پڑے کیونکہ جب وہ تجزیے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے گا کہ میری تو اکثر دعائیں قبول ہی نہیں ہوئیں تو شیطان کو مایوسی پیدا کرنے کا موقع مل جائے گا اور پھر یہ اس عبادت سے بھی محروم رہ جائے گا۔ قبول نہ ہونے کا معاملہ تو یہاں تک ہے کہ حضرات انبیاء علیہم السلام کی بھی تمام دعائیں قبول نہیں ہوئیں۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قبیلے قریش کے بعض افراد کا نام لے لے کر انھیں بددعائیں دیں لیکن وہ قبول نہیں کی گئیں۔ رعل، ذکوان اور مضر تینوں قبیلوں کے لیے بددعا کی گئی، لیکن قبول نہیں کی گئی حتیٰ کہ منع بھی فرمادیا گیا کہ آپ بددعا نہ کیجیے۔

تو بندے کا کام بندگی ہے۔ قبولیت اس کے اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ قبولیت کے اسباب تلاش کرے جیسے ہمیشہ سچ بولنا، حلال کا رزق کھانا، اس وقت دعا مانگنا جو وقت
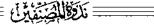
قبولیت کا ہے جیسے تہجد کا وقت، مجلس نکاح کے آخر کا وقت، بارش کے آغاز میں بارش میں ایسے کھڑے ہو کر دعا مانگنا کہ بارش اس پر پڑے، روزہ افطار کرتے وقت، اذان اور اقامت کا درمیانی وقت وغیرہ اور وہ جگہیں جہاں دعا قبول ہوتی ہے جیسے مساجد، حضرت رسالت مآب ﷺ کا روضۂ مبارک اور مسلمانوں کی وہ قبور جہاں غالب گمان ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت یہاں بھی برستی ہو گی۔ ایسے ہی ان افراد سے دعا کروانا جن کی دعائیں قبول ہونے کے زیادہ امکانات ہیں جیسے اپنے ماں باپ، علماء کرام، اولیاء اللہ، غرباء و مساکین، مسافر اور مدارس میں پڑھنے والے بچے وغیرہ، تو یہ اسباب اختیار کرے۔ باقی چونکہ قبولیت خود اپنے اختیار میں نہیں تو جو بات غیر اختیاری ہے، اس کو سوچ کر پریشان ہونا یا اس پر غور کرتے رہنا، مایوس ہونا، محض اپنے وقت اور صلاحیتوں کا ضیاع ہے۔ اپنا کام کرے اور جو مانگنا ہے، مانگتا رہے۔ دنیا میں فقیر ہمیشہ اپنے جیسے بندوں سے ایک ہاتھ پھیلا کر مانگتے ہیں کیونکہ دینے والے بھی تو بندے ہی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو مختار کل اور شہنشاہ ہے وہاں ایک نہیں دونوں ہاتھ پھیلا کر مانگے کہ دینے والا تو کل کائنات کا حاکم بھی ہے اور حکیم بھی۔ وہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کیا اور کتنا دینا ہے۔ ہر وقت تجویز ہی نہ کرتا رہے تفویض سے بھی کام لے کہ ملے یا نہ ملے اس دَر کو نہیں چھوڑنا، مانگتے ہی رہنا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ تہجد میں کیا خوبصورت شعر پڑھتے تھے کہ میں ہمیشہ آپ کے دَرِ دولت پر بھیک مانگنے آتا ہوں اور اس دَر سے بھیک مانگنا صرف میرا پیشہ ہی نہیں میرے باپ دادا بھی اسی دَرِ اقدس پر حاضر ہو کر مانگتے تھے۔ میں تو پشتینی بھکاری ہوں، دروازہ کھول دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جس شخص کے لیے دعا مانگنے کا دروازہ کھل گیا اس کے تو وارے نیارے ہو گئے۔ جو دعا کا دَر کھولتے ہیں وہی قبولیت کا بھی دَر کھولتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کو متوجہ کرنے کے لیے خاص کلمات

فرمایا اللہ تعالیٰ کی ثنا کے وہ جملے جن میں تسبیح اور تحمید، دونوں یکجا ہوں، یہ جملے اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ایسے جملے ہیں، جو اس مالک کو خود بہت پسند بھی ہیں اور یہ جملے بہت بہترین ذکر بھی ہیں، اللہ تعالیٰ کی رضا ان جملوں سے حاصل ہوتی ہے، گناہ معاف ہوتے ہیں اور رزق کے دروازے بھی کھلتے ہیں۔ جب بھی رزق کی تنگی ہو یا قرض کا بوجھ ہو جائے یا اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرنے اور ذکر کرنے کو جی چاہے تو ان جملوں کو بار بار پڑھنا چاہیے۔ یا پھر ان میں کسی بھی جملے کو اپنا ورد بنا لینا چاہیے مثلاً یہ کہ جملہ ① روزانہ صبح و شام ایک سو مرتبہ (ایک تسبیح) پڑھ لیا جائے یا یہ کہ جملہ نمبر ②، ③، ④ کسی بھی جملے کو روزانہ اتنی مرتبہ پڑھنا مقرر کر لیا جائے تو یہ ایک ورد یا وظیفہ بن جائے گا۔

① سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے اور اس کے ساتھ ہی تمام حمد و ثنا اسی کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ، جو عظمت والا، بلند شان اور بے عیب ہے۔
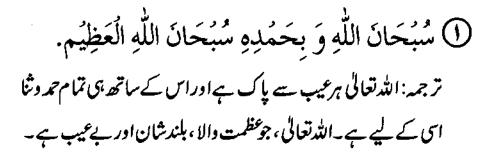
② سُبْحَانَ رَبِّيْ وَ بِحَمْدِهٖ.

ترجمہ: میرا پروردگار ہر عیب سے پاک ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمام حمد وثنا بھی اسی کے لیے ہے۔

۳ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَ أَتُوْبُ إِلَيْكَ.

ترجمہ: اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے اور اس کے ساتھ تمام حمد وثنا بھی تیرے ہی لیے ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تیرے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ میں تجھ سے، اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں اور میرے اللہ میں توبہ کرتا ہوں۔

۴ سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ.

ترجمہ: اے اللہ تو ہر عیب سے پاک ہے اور اس کے ساتھ ساتھ تمام حمد وثنا بھی تیرے ہی لیے ہے۔

۵ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ مَا شَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَ مَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ أَعْلَمُ أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَ أَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ پاک ہے اور اپنی سب تعریفوں کے ساتھ، سوائے اللہ تعالیٰ

کی مدد کے نہ نیکی کرنے کی قوت ہے اور نہ بُرائی سے بچنے کی طاقت ہے،
جو اللہ تعالیٰ نے چاہا وہ ہوگیا اور جو نہ چاہا وہ نہ ہوا۔ میں خوب جانتا ہوں کہ
اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اسی کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔

یہ دعا تو اپنی اور اپنے جان و مال کی حفاظت کے لیے صبح و شام پڑھنی چاہیے اور اسے بچوں کو بھی سکھا دینا چاہیے۔

⑥ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَ رِضٰى نَفْسِهٖ وَ زِنَةَ عَرْشِهٖ وَ مِدَادَ كَلِمٰتِهٖ.

ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ کے ہر عیب سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ، اس کی حمد و ثنا بیان کرتا ہوں اور ایسی پاکیزگی وحمد و ثنا جس کی تعداد اس کی مخلوق کے برابر ہے اور ایسی پاکیزگی اور حمد و ثنا جس سے وہ خود بھی خوش ہو اور ایسی پاکیزگی اور حمد و ثنا جو اپنے وزن میں، عرش کے وزن کے مساوی ہو اور ایسی حمد و ثنا جسے لکھنے کے لیے اتنی ہی روشنائی درکار ہو جتنی روشنائی اس کی تعریف کے جملوں کو لکھنے کے لیے مطلوب ہو۔

اس جملے کو جب بھی پڑھا جائے گا تو تین مرتبہ پڑھا جائے گا اور اگر کوئی اس جملے کو تین مرتبہ سے زیادہ پڑھے گا تو پھر تین مرتبہ کی پابندی نہیں رہے گی۔

⑦ سُبْحَانَ اللّٰهِ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ

وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهِ.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ تمام کائنات میں اسی کی بادشاہی ہے اور تمام تعریفیں بھی اسی کے لیے ہیں اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ انسان کوئی نیکی کا کام نہیں کر سکتا اور نہ ہی کسی گناہ سے بچ سکتا ہے، جب تک کہ اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق اس کے شامل حال نہ ہو۔ میں اس ذات بے عیب کی پاکیزگی اور تعریف بیان کرتا ہوں۔

⑧ سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهِ، أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا.

ترجمہ: میں اللہ تعالیٰ کے ہر عیب سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی حمد و ثنا بھی بیان کرتا ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہوں اور بلاشبہ وہ توبہ کو بہت زیادہ قبول فرمانے والا ہے۔

⑨ سُبْحَانَ الْمَلَكِ الْحَيِّ الْحَقِّ الْقُدُّوْسِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهِ.

ترجمہ: اللہ تعالیٰ بے عیب ہے وہ شہنشاہ، ہمیشہ زندہ، اُس کی ذات موجود اور وہ ہر عیب سے منزہ ہے۔ میں اس بے عیب ذات کی پاکیزگی اور تعریف بیان کرتا ہوں۔

متفرقات
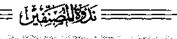
كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ.

(پ:۲۱،سورۃ الروم،آیت:۳۲)

ہرایک گروہ، جوکچھ (بھی) اس کے پاس ہے (اس پر) خوش ہورہاہے۔

بیسویں صدی کا سب سے بڑا تحفہ.

(فرمایا) بیسویں صدی کی سب سے بڑی دریافت اوراسکا تحفہ ''بھوک'' ہے۔ پیٹ کی بھوک، سر چھپانے کی بھوک، مہینوں کی مسافت اور عمر بھر کے تجربات کو منٹوں اور بعجلت حل کرنے کی بھوک، جنس کی بھوک اوران سب کے نتیجے میں تمام اخلاقی اقدار پامال ہوکر رہ گئیں۔

استعماری راج نے دنیا کو جہنم کدہ بنادیا.

(فرمایا) بیسویں صدی کے استعماری راج نے دنیا کو جہنم کدہ بنادیا۔ ایسے دکھ دیے اور ان مظالم کی طرح ڈالی، جواب رہتی دنیا تک ختم نہ ہوگی۔ سیدنا مسیح علیہ السلام کے دور مسعود کا انتظار واستثناء ہے وگرنہ تو اب ہر صدی کی اپنی قیامت برپا ہونے کو ہے۔ بیسویں صدی میں ہی دو عظیم جنگیں لڑی گئیں۔ شمالی افریقہ کے تمام ممالک ان کے مظالم کا شکار ہوئے۔ اٹلی نے لیبیا پر حملہ کیا۔ برطانیہ نے ہندوستان تو ایک طرف مصر کو اپنے قابو میں لے لیا اور ترکوں کو روک دیا کہ وہ طرابلس کے مظلوم مسلمانوں کی مدد کر سکیں، روس نے برطانیہ کے ساتھ مل کر سازش بنالی کہ ایران اور افغانستان کو تقسیم کردیا جائے۔ برطانیہ اس تقسیم اور لڑائی پر خوش تھا کہ اسے جنوبی ایران میں تیل کے چشموں پر قبضہ مل جائے گا اور اس کے عوض روس، ایران کے شمالی حصوں پر قبضہ کرلے تو برطانیہ مداخلت نہیں کرے گا۔ روس نے ایران کو خون میں نہلا دیا۔ برطانیہ نے یونان کو بھی
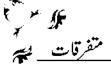
شہ دی کہ خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دو لیکن اللہ تعالیٰ ہی نے حفاظت فرمائی۔

شرح اشارات کہ جرح اشارات؟

(فرمایا) شیخ الرئیس بو علی حسین بن عبداللہ بن سینا نے اپنی کتاب ''کتاب الاشارات والتنبیہات'' میں جو مشکل اور پیچیدہ الفاظ، تراکیب اور مسائل بیان کیے ہیں، علامہ فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سب کی تشریح کے لیے مزید ایک کتاب لکھی، جس میں انھوں نے تشریحات کے ساتھ ساتھ جابجا بوعلی سینا پر جرح بھی کی ہے۔ پڑھنے والوں نے جب اس شرح کو پڑھا تو کہا کہ فخرالدین رازی کی اس شرح کو ''شرح اشارات'' کی بجائے ''جرح اشارات'' کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ویسے خواجہ نصیرالدین محمد بن حسن طوسی نے بھی ''حل مشکلات'' کے نام سے ''کتاب الاشارات والتنبیہات'' کی خوب شرح کی ہے۔ ایران سے اس کتاب کا قلمی نسخہ، سید محمد عمادی حائری کے مقدمے کے ساتھ خوب چھپا ہے۔ اپنے ذخیرۂ کتب میں یہ موجود ہے۔ فلسفہ کے شراح اگر اس کتاب سے اعتنا کرتے تو یہ کیا ہیرا تھا جس کی پالش ہو جاتی۔

۵۸۲ھ میں مصر کے نجومیوں کی پیشینگوئی اور اس کا انجام

(فرمایا) ۵۸۲ھ منجمین مصر کے لیے بہت رسوا کن تھا۔ ہُوا یوں کہ علم نجوم کے تمام ماہرین نے دنیا بھر کے زائچے بنائے اور حکم یہ لگایا کہ تمام عالم میں تباہی مچے گی۔
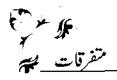
زحل، مریخ، سورج اور چاند ایک ہی برج ''سرطان'' یا ''میزان'' میں جمع ہو رہے ہیں اور ان کے اجتماع کے نتائج حد درجہ تباہ کن ہوں گے۔ سرخ ریتلی آندھیاں چلیں گی اور مسموم ہوائیں بستیوں کو اجاڑ دیں گی۔

لوگ ان کے جھانسے میں آگئے، خندقیں کھدیں، اشیائے خورد ونوش کا ذخیرہ کیا گیا اور اتھل پتھل مچی لیکن وقت مقررہ آیا اور کسی تغیر وتبدل کے بغیر گذر گیا۔ نجومی جھوٹے پڑے اور ان کی مذمت میں شعر کہے گئے۔ ابو الغنائم محمد نے اس دور کے ایک قابلِ ذکر نجومی ابوالفضل پر پھبتی کسی

؎ قل لأبي الفضل قول معترف
مضى جمادى و جاء نا رجب
وما جرت زعزع كما حكموا
ولابدا كوكب له ذنب

ترجمہ: ابوالفضل نجومی کو یہ طے شدہ بات بتا دو کہ جمادی الاول گذر گیا اور رجب آ گیا، ان دونوں مہینوں میں آپ کی پیشن گوئیوں کے مطابق شدید آندھیاں اور نہایت تیز اور تباہ کن ہوائیں چلنی تھیں مگر ایسے ہوا نہیں اور ایک دمدار ستارہ، جس کی آپ نے پیشن گوئی کی تھی، وہ بھی ظاہر نہیں ہوا۔

پھر ان جھوٹے نجومیوں کو سمجھایا:

؎ مدبر الامر واحد ليس للسب
عة في كل حادث سبب
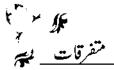
~ لا المشتری سالم و لا زحل
باق و لا زهرة و لا قطب

ترجمہ: دیکھیے پوری کائنات کے کاموں کو بنانے والی ایک ہی ذات (اللہ تعالیٰ کی) ہے اور اس کی طرف نامناسب باتوں کی نسبت کرنا (تحویل بروج ونجوم) درست نہیں ہے۔ یہ تمام ستارے مشتری، زحل، زہرہ اور قطب فانی ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔

یورپ کی سائنسی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ

(فرمایا) یورپ میں سائنس کو جتنی بھی ترقی ملی اور آج اس ترقی کے پھل پھول سے جو تمام دنیا مستفید ہو رہی ہے، اس ترقی کی اصل بنیاد، مسلمانوں کی وہ ترقی، تہذیب اور اصول وضوابط ہیں، جو انہوں نے سپین میں دنیا کو عطا کیے تھے۔ علامہ اقبال مرحوم نے فارسی کے چند اشعار میں اس حقیقت کا انکشاف بہت خوبصورتی سے کیا ہے۔

حکمت اشیاء فرنگی زادہ نیست   اصل او جز لذت ایجاد نیست
چوں عرب اندر اروما پر کشاد   علم وحکمت را بنا دیگر نہاد
دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند   حاملش افرنگیاں برداشتند

ترجمہ: دنیا کی کسی چیز میں کیا اثر اور حکمت ہے، فرنگی زادے اس علم سے بے خبر تھے۔ انھوں نے مختلف اشیاء کے باہمی ملاپ سے جو لذت پیدا ہو سکتی ہے (کیمیا) اسے ڈھونڈ نکالا۔ مغربی ممالک جب مسلمانوں نے فتح کیے تو

اس علم و حکمت کی بنیاد انھوں نے وہاں ڈالی۔ ان مسلمان صحرا نشینوں نے اس جدید سائنس کا بیج وہاں کاشت کیا اور یہ انہی بیجوں کی فصل (سائنس) ہے، جسے اب فرنگی کاٹ کر، جمع کر رہے ہیں۔

اونٹ اور ہندوستان کی معاشرتی زندگی

فرمایا اونٹ کی خصوصیت کچھ عربوں کے ساتھ ہی نہیں ہندوستان میں بھی یہ برابر معاشرتی زندگی کا حصہ رہے ہیں۔ اکبر بادشاہ نے انھیں چٹھی رسانی کے لیے استعمال کیا تھا۔ اس کثرت سے اونٹ ہوتے تھے کہ ہندوؤں کے ایک فرقے ''رائباری'' نے اپنے آپ کو اونٹوں ہی کے لیے مخصوص کر لیا تھا، وہ اونٹوں کی صحت، علاج، ادویہ اور غذا کے ماہر تھے۔ دیسی اونٹوں کی ایسی عمدہ تربیت کرتے تھے کہ وہ سفر کے مقصد صحیح طور پر پورے کر دیتے تھے، کم وقت اور سرعت رفتار۔

دنیا میں حسد اور آخرت میں جہنم کی آگ میں جلنے والے

فرمایا حسن زندگی کے حقائق میں سے ایک ہے۔ اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے اور اس لطف کی حد بندی کر لینا عقل کی دلیل ہے۔ جو چیز بھی اپنی حدود کو عبور کر جائے وہ باعث زحمت بن جاتی ہے۔ شدید سردی پڑ رہی ہو، باد و باراں کا سامنا ہو، یخ بستہ ہوائیں ہوں اور برفباری شروع ہوتے ہی شام کے اندھیرے چھانے لگیں تو ایسے میں گرم لحاف اور بستر کی قدر کس کو نہ ہوگی لیکن اسی لحاف میں روئی مناسب

مقدار کی بجائے محض ٹھونس دی جائے تو ایسا بھاری بھرکم لحاف جسم کو تھکا تو دیتا ہے لیکن نیند سے لطف نہیں اٹھانے دیتا۔ سو حسن سے تمتع جب حدود میں مقید ہو تو زندگی اپنی بہار دکھاتی ہے۔ پھر یہ بھی مسئلہ ہے کہ حسن کا مورد کیا ہے؟ عمارت ہے، کتاب ہے، کپڑا ہے، چہرہ ہے، دریا ہے، پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور یہ بھی تو ہے کہ دیکھنے والا کون ہے؟ دیکھنے والوں کی ایک قسم ہے:

ع ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش وقت ہوئے اور چل نکلے

ایک قسم ہے جو حسن میں تصرف چاہتی ہے۔ ایک قسم ہے جو حسن کو اپنی ملکیت میں دیکھنا چاہتی ہے، خود مالک ہوں تو درست اور قابل فخر اور غیر مالک ہو تو حسد اور اس حسن تک کو زائل کرنے کی مذموم کوشش۔ ایسے ہی لوگ ہیں، جن کو دنیا میں حسد اور آخرت میں جہنم کی آگ میں جلنا ہے۔ ان کے لیے تو حسن کو دیکھنا ہی روا نہیں۔

اہل علم تنہا رہ گئے اور جہال کی محفلیں گرم ہوگئیں.

فرمایا دیار اہل اسلام، علم سے ایسے اجڑے ہیں کہ اب بسنے کا نام نہیں لیتے۔ جہالت کا ایسا غلبہ ہوا ہے کہ گویا زوال اس کا مقدر نہیں۔ علوم شرقیہ کو گھن لگا ہوتا تو بھی کوئی بات تھی اس پُر ثمر شجر کو تو آرے سے کاٹا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ تہذیب زوال پذیر ہوگئی ہے۔ مشائخ، علم سے ایسے بے بہرہ ہیں کہ ہمارے دور کے اکثر نماز تک سنت کے مطابق ادا نہیں کرتے اور علماء محض عقل سے فتویٰ دیتے ہیں۔ جس کی بات جتنی سمجھ میں آئی اپنی معاشی او معاشرتی مصلحت دیکھ کر اپنی سمجھ کے مطابق مسئلہ بتا دیا۔
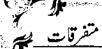
مفتی اردو کے فتاویٰ دیکھ کر کام چلاتے ہیں کیونکہ محنت سے پڑھا نہیں اور اب افتاء کا منصب ہاتھ لگ گیا ہے تو جو کمی تعلیم و تربیت میں رہ گئی تھی اسے کیسے پورا کریں۔ پڑھنے کی بات ایسی اجنبی ہوگئی ہے کہ جیسے اس مسافر کو کوئی جانتا تک نہیں اسی لیے اہل علم تنہا رہ گئے اور جہال کی محفلیں گرم ہوگئیں

مال ہے نایاب اور گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالؔی نے، دکاں سب سے الگ

کیا غفلت میں گذری زندگی کی بھی قضا ممکن ہے؟

فرمایا عبادات کی قضا ہے۔ نماز کی قضا، روزے کی قضا، حج اور عمرے کی قضا لیکن جو زندگی غفلت میں گذر جائے کیا اس وقت کی قضا، بھی ممکن ہے؟

حصولِ علم کے مختلف مراحل اور نیت کی درستگی
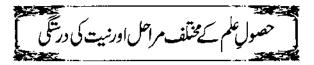
فرمایا علم کا آغاز خاموشی سے ہوتا ہے کہ استاد کے سامنے بولے نہیں، خاموش بیٹھے۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ سننا ہے کہ استاد بیان کریں اور طالب علم سنے۔ تیسرا درجہ استاد سے سنے یا پڑھے ہوئے علم کو حفظ کرنا ہے کہ استاد کے بیان کردہ علم کو ذہن یا تحریر کے ذریعے محفوظ کرلے۔ چوتھا درجہ عمل ہے کہ علم جب عمل کے مرحلے سے گزرتا ہے، تو پختہ ہوجاتا ہے، یہ ایسے ہی ہے جیسے اینٹ کچی ہوتی ہے اور جب اسے آگ دکھائی جاتی ہے تو پختہ ہوجاتی ہے۔ اب پانچواں مرحلہ آتا ہے کہ اس علم کو بیان کرے یا اس کو شائع کرے۔

یہ تو طریقہ ہے کسی بھی علم کو محفوظ رکھنے کا اور ان تمام مراحل میں اگر نیت درست ہوگی تو پھر برکت بھی آئے گی اور اگر نیت ہی درست نہ ہو تو پھر غالباً علم تو آ جائے گا لیکن برکت اُٹھ جائے گی۔

دربارِ الٰہی میں حاضری اور ناپاکی کا کوئی میل نہیں.

(فرمایا) حضرت رسالت پناہ ﷺ کا سینۂ مبارک شب معراج میں چاک کر کے ظاہر و باطن، تقدیس کی اعلیٰ سطح پر پہنچایا گیا۔ پھر اسے ایمان اور حکمت سے بھر دیا گیا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا کہ نماز جیسی عبادت اور حضرات انبیاء علیہم السلام اور فرشتوں کی امامت کے لیے یہ اہتمام ضروری تھا۔ ملاء اعلیٰ کا ملاحظہ کرایا گیا اور انھیں اس شب پروردگار عالم، اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے مناجات کا شرف بخشا گیا۔ اس کے بعد پانچ نمازیں فرض کی گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا کیا شرف اور مقام ہے۔ اسی لیے اب بھی کوئی شخص جب نماز کی تیاری کرتا ہے تو پہلے پاکیزگی حاصل کرتا ہے کہ دربار الٰہی میں حاضری اور ناپاکی کا کوئی میل نہیں۔ پھر فرشتوں کی ہم رکابی سے اسے ملاء اعلیٰ سے مناسبت حاصل ہوتی ہے اور پھر وہ نماز میں اپنے پروردگار سے شرف مناجات پاتا ہے۔ جو لوگ نماز سے غافل ہیں وہ کس مقام سے محروم رہتے ہیں؟ کاش کہ انھیں احساس ہو۔

حاتم طائی کی نصیحت
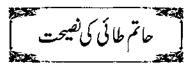
(فرمایا) حاتم طائی اپنی سخاوت کے لیے مشہور تو ہے ہی لیکن وہ بہت دانا شخص بھی

تھا۔اس کا ایک شعر ہے۔

فَـإِنَّكَ إِنْ أَعْـطَيْـتَ بَـطْـنَكَ سُؤْلَـهُ
وَ فَـرْجَكَ نَـالَا مُـنْـتَهَـى الذَّمِّ أَجْـمَعَا

(ترجمہ) اگر تم اپنے پیٹ اور شرمگاہ دونوں کی مرادیں پوری کرتے رہے تو تم انجام کار رسوا ہو جاؤ گے۔

جو شخص ہر وقت کھانے پینے میں یا اپنی جنسی خواہشات پوری کرنے کی فکر میں رہے گا اس کے پاس تعمیری کاموں کے لیے وقت ہی کیا بچے گا اور پھر اس حیوانیت کے لیے جو مال درکار ہوگا وہ کہاں سے آئے گا؟ نتیجہ یہ کہ جب حلال مال ناکافی ہوگا تو وہ ضرور حرام مال حاصل کرنے میں منہمک ہو جائے گا اور ایسی حرکتوں کا انجام بجز رسوائی کے اور کیا ہے؟

''رتھ'' اور مرزا غالب کی وضاحت
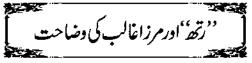
فرمایا ''رتھ'' کے متعلق اہل دہلی میں اختلاف تھا کہ یہ لفظ مذکر بولا جائے گا یا مؤنث؟ مرزا غالب سے دریافت کیا گیا تو فرمایا: بھیا جب رتھ میں خواتین سوار ہوں تو مؤنث کہو اور جب مرد بیٹھیں تو مذکر سمجھو۔

سپتن، انباغ اور سوتن

فرمایا اردو زبان میں سوکن یا سوتن لفظ اس دلہن کے لیے بولا جاتا ہے، جو مرد اپنی پہلی

دلہن پر لاتا ہے۔ فارسی میں اس کا ترجمہ ہے "انباغ"۔

کانٹا بُرا کریل کا اور بدری کا گھام
سوکن بُری ہے چُون کی اور ساجھے کا کام

سنسکرت زبان میں دشمن کو "سپتن" کہتے ہیں۔ اور وہیں سے یہ لفظ پنجابی اور اردو میں بدل کر سوکن ہو گیا کہ یہ دونوں بیویاں بھی آپس میں دشمن ہوتی ہیں۔

دنیائے سیاست ثاقب الذہن شخص کی طلبگار رہوتی ہے.

فرمایا ملکی سیاسیات ایک الگ بات ہے اور کسی شخص کا صاحب تقویٰ ہونا الگ بات ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص نہایت متقی اور پرہیز گار ہو، نفل نمازیں تک قضاء نہ کرتا ہو اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقربین بارگاہ میں سے ہو اور امور مملکت میں اس کی رائے بالفعل قابل اعتناء نہ ہو۔ اور اس کے مقابلے میں ایک شخص امور مملکت اور سیاست کا بادشاہ ہو لیکن اس کی زندگی تقویٰ وطہارت کے معیار پر پوری نہ اترتی ہو۔ امور دنیا چلانے کے لیے اس دوسرے شخص کو ترجیح دینی چاہیے، یہ نہیں ہونا چاہیے کہ فلاں حضرت چونکہ فلاں کے خلیفہ ہیں اور اس قدر متقی و پرہیز گار ہیں اس لیے سیاست میں بھی منصب قیادت کے اہل ہیں۔ پاکستان میں دیندار حلقوں کو سیاست کے میدان میں اسی طرز عمل نے ڈبویا ہے کہ چونکہ ہمارے حضرت چناں و چنیں ہیں لہٰذا سیاست میں بھی انہی کا ساتھ دینا ہے جبکہ دنیائے سیاست ثاقب الذہن شخص کی طلب گار ہے۔

حضرت امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل یہی تھا۔ وہ نہایت متقی فرد کی بجائے انتہائی

اہل شخص کو ڈھونڈ تے تھے۔ دونوں خوبیاں کہ کوئی شخص دین کے اعتبار سے بھی معیار ہو اور سیاست کے گھوڑے پر بھی، لگام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہو، نہایت نادر الوقوع ہے۔ خیر القرون میں ایسے افراد کمیاب تھے تو اب تو النادر کالمعدوم والی بات ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ حضرت امیر المومنین سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت شرحبیل بن حسنہ ① کو معزول کر کے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو گورنر بنا دیا تھا حالانکہ حضرت شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ نے مکہ مکرمہ میں اسلام قبول کیا تھا۔ پھر حبشہ اور مدینہ منورہ، دو ہجرتیں کی ہیں۔ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں مصر اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا حتیٰ کہ مدینہ منورہ میں آپ کی وفات ہوئی اور حضرت شرحبیل رضی اللہ عنہ مصر ہی میں تھے۔ پھر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انھیں شام کے لیے جہاد میں روانہ فرمایا لشکر کی قیادت انھیں دی۔ پورا اردن انہوں نے فتح کر کے اسلام کی جھولی میں ڈال دیا۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ نے بھی فوج کے بعض دستوں کی امارت انھیں دی اور ان پر اعتماد کا اظہار فرمایا۔

جہاں تک ان کی فضیلت کا تعلق ہے سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اسلام ہی فتح مکہ کے بعد قبول کیا ہے اور قرآن نے خود یہ کہا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد، اسلام قبول کرنے والے، دونوں گروہ برابر کا درجہ نہیں رکھتے تو سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ اگرچہ رتبے میں ان سے بدرجہا کم تھے، لیکن سیدنا عمر رضی اللہ عنہ

① یہ لفظ شُرَحْبِیْل ہے جسے عوام غلطی سے ''شَرْ جِیْل'' پڑھتے ہیں۔ ہوا یہ ہے اس لفظ میں ''رُ'' کے بعد حرف ''ح'' ہے اور اس کے بعد لفظ ''ب'' ہے۔ لکھنے والوں نے ''ب'' کا نقطہ ''ح'' کے پیٹ میں ڈال کر ''ح'' کو ''ج'' بنا دیا ہے اور ''ب'' کا شوشہ غائب کر دیا ہے اس لیے یہ لفظ ''شُرَحْبِیْل'' کی بجائے ''شَرْجِیْل'' پڑھا جانے لگا ہے حالانکہ یہ غلط ہے۔ حضرت شُرَحْبِیْل بن حسنہ رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں اور ''حسنہ'' ان کی والدہ کا نام ہے اور ان کے والد کا نام عبداللہ بن مطاع بن عبداللہ بن غطریف تھا۔
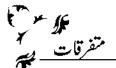
نے اپنے دور خلافت میں قیادت ان سے لے کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو دے دی تھی۔
حضرت شرحبیل رضی اللہ عنہ نے اپنی معزولی کا سبب یہ کہہ کر دریافت کیا کہ امیر المومنین کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں، اس لیے آپ نے مجھے معزول کیا ہے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں شرحبیل بات یہ نہیں ہے بلکہ میں نے تو یہ کیا ہے کہ جو پہلے اس عہدے پر فائز تھا (شرحبیل) میں نے دیکھا کہ ایک شخص (معاویہ) اس پہلے آدمی سے زیادہ اس عہدے کا حق ادا کر سکتا ہے تو میں نے اسے مقرر کر دیا ہے۔
سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ افضل نہیں۔ افضل تو حضرت شرحبیل رضی اللہ عنہ ہی ہیں لیکن افضلیت کے باوجود جب ان سے بہتر ایک شخصیت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی سامنے نظر آئی تو گورنر انھیں بنادیا۔ یہ طرز عمل سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کا تھا اور جو ان کا طرز عمل ہے وہ اسلام بھی ہے اور اسلام کی بنیاد بھی۔

جرش اور جوارش جالینوس

(فرمایا) حکماء کے ہاں مختلف بیماریوں کے علاج میں ایک دوا کھلائی جاتی ہے، جسے ''جوارش'' کہتے ہیں۔ جوارش کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اور یہ مختلف جڑی بوٹیوں اور ادویہ کے اختلاط سے بنتی ہیں جیسے ہمارے ہاں ''جوارش جالینوس'' بہت مشہور ہے۔
جوارش کا یہ لفظ درحقیقت عربی کے ایک لفظ ''جَرْشٌ'' سے بنا ہے اور ''جرش'' کہتے ہیں اس آواز کو جو کسی سخت چیز کے چبانے سے دانتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ جو نمک اچھی طرح کوٹا نہ گیا ہو، اسے ''مِلْحٌ جَرِیْشٌ'' کہتے ہیں کیونکہ اس نمک کو کوئی چبائے گا تو آواز

پیدا ہوگی، سانپ جب اپنی کینچلی بدلتا ہے تو اس کے اترنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے، اس آواز کو بھی ''جَرش'' کہتے ہیں۔ مختلف اشیاء چھیلنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسے بھی ''جرش'' کہا جاتا ہے اور اس دوا کو بھی ''جوارش'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے کھانے سے آواز پیدا ہوتی ہے۔

سبزیوں کا گہرا رنگ اور کلوروفل

فرمایا: سبزی کا رنگ جتنا گہرا سبز ہو وہ اتنی ہی مفید ہوتی ہے۔ بعض پھل اور سبزیاں جو گیا رنگ تک پہنچ جاتی ہیں تو درحقیقت ان میں کلوروفل زیادہ ہوجاتا ہے اور کلوروفل (Chlorophull) کا دانتوں کے لیے نفع بخش ہونا سائنس کی ایک حقیقت ہے۔

قریش کی فصاحت وبلاغت

فرمایا: جزیرۂ عرب میں سب سے زیادہ فصیح وبلیغ عربی قریش مکہ کی تھی۔ زبان کے معاملے میں عربوں کا کوئی شہر یا قبیلہ ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ جیسے اردو زبان کے معاملے میں دہلی اور لکھنؤ کی اُردو سَند مانی جاتی تھی اسی طرح قریش کی عربیت اپنے دور میں مسلّم تھی۔ قریش ساکنین حرم اور بیت اللہ کے مجاور تھے۔ حج اور عمرے کی غرض سے بھی اور بڑے بڑے قبائل اپنے باہمی اختلافات میں فیصلہ کرانے کی غرض سے بھی، مکہ مکرمہ حاضر ہوتے اور قریش سے رجوع کرتے۔ قریش نہ صرف یہ کہ ہر طرح کا تعاون کرتے بلکہ دینِ ابراہیمی کے وارث ہونے کے زعم میں نئی نئی بدعات بھی

شروع کرتے اور عالم عرب کو ان بدعات کا اتباع، دین ابراہیمی سمجھ کر کرنا پڑتا۔
قریش اپنی ذہانت کی وجہ سے مشہور بھی تھے اور ان کی ذہانت ہی کی یہ بات تھی کہ وہ مختلف قبائل کے اشعار اور ان کے خطباء کا کلام سن کر، اس میں سے اچھی اچھی لغات، الفاظ اور تراکیب آہستہ آہستہ اپنی زبان میں شامل کرتے رہتے۔ مدتوں یہ عمل جاری رہا اور قریش جو عربی بولتے تھے یہ اس کا ارتقائی سفر تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی عربی دنیا کی فصیح ترین زبان قرار پائی، مانی گئی، اور فطرت زبان کو ان مراحل سے اس لیے بھی گذار رہی تھی کہ اس میں وحی خداوندی (قرآن کریم) کو نازل کیا جائے۔ دنیا کے فصیح ترین فرد حضرت رسالت مآب ﷺ کو اس قبیلے میں پیدا کیا جائے اور پھر ایک ایسی جماعت، حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی بنیادی طور پر اسی قبیلے کے افراد ہوں جو فصاحت و بلاغت میں اپنی مثال آپ ہوں۔ وہ ایسی خوبصورت زبان بولیں کہ سننے والے عش عش کر اُٹھیں۔ وہ دوران کلام الفاظ اور تراکیب کا ایسا عمدہ چناؤ کریں جیسے کوئی مالن موسم بہار کی ایک صبح، رنگت و خوشبو کی نزاکت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ایک دلکش و خوشنما گلدستہ تیار کرتی ہے۔ قرآن کریم اسی لیے لغت قریش میں نازل ہوا تھا۔
ایسی، ہر عیب سے مبرّا زبان، امام محمد بن حسن الشیبانی حنفی رحمۃ اللہ علیہ بولتے تھے کہ وہ خالص عرب اور عربوں کے قبیلے شیبان کے ایک ہونہار فرزند تھے۔ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ان کے شاگرد تھے اور اپنے استاد امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی زبان دانی کی تعریف میں فرماتے تھے کہ قرآن امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی عربیت میں نازل ہوا تھا اور یہ ایسے ہی ہے جیسے ہم یہ کہیں کہ قرآن کریم اگر دہلی میں نازل ہوتا تو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

کی اردو میں نازل ہوتا۔

یہ جو قریش کی عربیت ہر عیب سے مبرّا تھی، اس بات کو سمجھنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ اس دور کے دیگر عرب قبائل کی زبان سے اس کا تقابل کریں کہ یہ دعویٰ واضح ہو۔

تو سنیے کہ اس زمانے میں مشہور عرب قبیلے تمیم کی عربیت ''عنعنہ'' کے عیب سے پُر تھی جہاں کسی کلمے کے آغاز میں ہمزہ آیا اور انھوں نے ''عین'' پڑھا۔ قریش ''اِنّ'' کا لفظ بولتے تھے اور یہی فصیح عربی تھی جب کہ بنو تمیم ''عِنّ'' بولتے تھے۔ تمام عرب ''اَسْلَمَ'' بولتے تھے اور یہ بنو تمیم ''عَسْلَمَ'' بولتے تھے اور ان کے اسی عیب کو ''عنعنہ'' کہا جاتا تھا یعنی ہمزہ کی بجائے عین بولنا اور زبان کا یہی عیب قبیلہ ''قیس'' کے عربوں میں بھی تھا۔

بنو ربیعہ اور مضر دونوں ممتاز عرب قبائل لیکن ان کی عربیت ''کُسکُسہ'' اور ''کشکشہ'' کے عیوب کی ماری ہوئی تھی۔ جب کسی مذکر کو مخاطب کرنا ہوتا تھا تو خطاب کے ''ک'' کو یا تو سین سے بدل دیتے تھے اور یا پھر ''ک'' کے بعد ''س'' کا اضافہ کر دیتے تھے۔ مثلاً رَأَیْتُكَ (میں نے تمھیں دیکھا) یہ وہ عربی ہے جو آج قرآن حکیم کی عربی ہے اور یہی قریش کی فصیح عربی تھی۔ بنو ربیعہ اور مضر کے قبائل کے افراد اس کو کبھی تو پڑھتے تھے رَأَیْتُکَسُ (میں نے آپ کو دیکھا) اور بعض افراد تو اس تخاطب کا ''ک'' بالکل غائب کر دیتے تھے اور بولتے تھے رَأَیْتُسُ (میں نے آپ کو دیکھا)۔

سو یہ مذکر مخاطب کے ''ک'' کے بعد ''س'' کا اضافہ یا ''ک'' کو ''س'' سے بدل دینا ان کی اس عادت یا لہجے یا تلفظ کو فصحاء عیب جانتے تھے اور بتاتے تھے کہ ان قبائل کی زبان میں ''کسکسہ'' کا عیب ہے۔

پھر یہی قبائل، یہی الفاظ جب کسی عورت یا مؤنث کے لیے ادا کرتے تھے تو ''ش'' کا اضافہ کر دیتے تھے۔ مثلاً قریش کی بے عیب عربی تھی رَأَيْتُكِ (میں نے آپ (خاتون) کو دیکھا)۔ اب ربیعہ اور مضر کہتے تھے رَاَیْتُکِشُ (میں نے آپ (مونث) کو دیکھا۔) مَرَرْتُ بِكِ (میں آپ کے پاس سے گذرا۔) یہ تو قریش کی عربی تھی اور یہ قبائل بولتے تھے مَرَرْتُ بِکِشُ (میں آپ (مونث) کے پاس سے گذرا۔) فصحاء عرب اس زبان کو عیب شمار کرتے تھے اور اس عیب کا نام ''کشکشہ'' تھا یعنی تانیث میں ''ش'' کا اضافہ۔

قبیلہ ''ھذیل'' جن کے فخر اور قیامت تک نام باقی رہنے کے لیے معلم الامۃ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی ہی کافی ہے کہ وہ اس قبیلے کی آنکھ کا تارا تھے، اس قبیلے کی عربیت میں ''فُحفہ'' کا سقم تھا۔ جہاں ''حاءَ'' کا لفظ آتا تھا یہ اسے ''عین'' بنا دیتے تھے۔ جیسے قریش تو ''حتیٰ'' بولتے تھے۔ قرآن کریم، حتیٰ کہ اردو زبان میں بھی ''حتیٰ'' ہی کا لفظ بولا جاتا ہے اور ھذیلی اسے ''عتّٰی'' بولتے تھے تو ''ح'' کو ''ع'' سے تبدیل کرنا ''فحفہ'' کہلاتا تھا۔

دور حاضر میں اگر اس معاملے کو سمجھنا ہو تو اہل مصر کی زبان سنیے ''ج'' کو ہمیشہ ''گ'' سے تبدیل کر دیں گے۔ حرمین شریفین میں ان کی دعاؤں کو سنیے تو اللہ تعالیٰ سے جَنّۃ (جنت) مانگ رہے ہوں گے لیکن زبان سے کہیں گے ''گنّا'' عنایت فرما۔

اردو زبان میں اس کی ایک مثال ''ارے'' اور ''اڑے'' بھی ہے۔ اصل لفظ ''ارے'' ہے لیکن بے شمار ہندوستانی اسے ''اڑے'' بولتے ہوئے ملیں گے۔
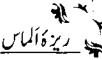
حیدرآبادی تو ہمیشہ ''قسم'' کی بجائے ''خصم'' اور ''قیمہ'' کی بجائے ''خیمہ'' کھاتے ہوئے ملیں گے۔

قریش کی عربیت اس طرح کے تمام تصرفات سے مبرّا تھی اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت رسالت مآب ﷺ کو انہی سے منتخب فرمایا اور قرآن کریم بھی انہی کی عربی میں نازل ہوا۔

ابن خلدون پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کو پڑھنا چاہیے۔

فرمایا ابن خلدون پر پڑھنا ہو تو ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے جو کچھ لکھا ہے، وہ پڑھیے۔ اصل کتاب تو انہوں نے فرنچ میں لکھی تھی پھر خود ہی محمد عبداللہ منان سے اس کا عربی ترجمہ کروایا تھا پھر عربی سے اردو میں اسے مولانا عبدالسلام ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے منتقل کیا تھا۔ اس ترجمے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کا مقدمہ حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا تھا۔ دَارُالمصنّفین سے یہ کتاب مع مقدمہ 1940ء میں شائع ہوئی تھی۔

کتاب ''سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم'' اور حُسنِ توارد۔

فرمایا اسوۂ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اردو زبان میں کوئی کتاب نہ تھی۔ سب سے پہلے اس موضوع کو قلمبند کرنے کا خیال مولانا نواب حبیب الرحمٰن شروانی رحمۃ اللہ علیہ کو آیا اور انہوں نے جب علامہ شبلی نعمانی کو اس طرف متوجہ کیا تو انہوں نے اطلاع دی کہ وہ بھی یہی منصوبہ بنا رہے تھے۔ اس منصوبے کو عملی جامہ تو کچھ تاخیر سے ہی پہنایا جا سکا اور
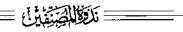
سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم، کتابی شکل میں کچھ تاخیر سے ہی سامنے آئی لیکن کم لوگ ہوں گے جنہوں نے اس کی تمام جلدوں کو بغور مطالعہ کیا ہوگا۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے متعلق جتنی غیر محتاط زبان اس میں استعمال کی گئی ہے، اردو زبان میں اہل السنۃ والجماعۃ نے کون سی اور کوئی کتاب ایسی لکھی ہوگی؟ اس حقیقت کی تردید کا حق صرف اسے حاصل ہے جس نے اس کتاب کا باء بسم اللہ سے لے کر تاء تمت تک بنظر عمیق مطالعہ کیا ہو۔

منڈی بہاؤالدین سے شائع ہونے والا رسالہ ــــ ''صوفی''

فرمایا منڈی بہاؤالدین سے ایک رسالہ ''صوفی'' کے نام سے نکلتا تھا اور اپنے دور میں برصغیر کے ممتاز جرائد میں سے ایک تھا لیکن اس کی مکمل فائل اب تک نہ ملی۔ صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی منڈی بہاؤالدین پنجاب نامی پریس تھا۔ انہوں نے بعض عمدہ اور مفید کتابیں بھی شائع کی تھیں لیکن اب ان کی مطبوعہ کتابیں بھی نایاب ہی ہیں۔ پڑھنے کا رجحان نہیں ہے اس لیے مارکیٹ میں وہ چیز آتی بھی نہیں، جس کی طلب نہ ہو۔ فارسی کے مشہور شاعر ابن یمین کے حالات پر انہوں نے مولانا عبدالسلام ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب پیش کی تھی۔ عام طور سے اب کتب خانے اس نعمت سے محروم ہیں۔

سندھ کی پہلی مفصل اور مستقل تاریخ

فرمایا: اردو زبان میں تاریخ سندھ پر اب تک سب سے زیادہ بہتر اور مفصل کام سید ابوظفر ندوی کی کتاب ''تاریخ سندھ'' ہے۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اردو میں یہ سندھ کی پہلی مفصل اور مستقل تاریخ ہے۔

لاہوری نمک

فرمایا: حکماء کی کتابوں میں اور پرانے ہندوستانی گھرانوں میں خواتین میں جو ''لاہوری نمک'' کی ترکیب یا الفاظ استعمال ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لاہور میں نمک کی کوئی کان ہے، یا تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نمک تو کھیوڑہ، وڑچھ، کلرکہار اور پنڈ دادن خان سے آتا ہے۔ غالباً نمک کی، دنیا میں سب سے بڑی کان کھیوڑہ ہی کی ہے اور ان تمام علاقوں سے نمک لاہور جاتا تھا اور برصغیر میں نمک کی سب سے بڑی منڈی لاہور میں ہی تھی اس لیے لاہور میں بکنے والے اس نمک کا نام ''لاہوری نمک'' پڑ گیا۔ ''لاہوری نمک'' یہ وہی سادہ نمک ہے جو پاکستان میں ہر گھر میں استعمال ہوتا ہے۔

کاغذ سازی اور سیالکوٹ
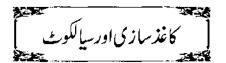
فرمایا: کسی زمانے میں سیالکوٹ کاغذ سازی کے لیے مشہور تھا۔ پورے پنجاب اور
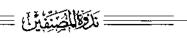
برصغیر کے بہت سے علاقوں میں اس کاغذ کی بہت مانگ تھی۔ جہانگیر بادشاہ کے دور میں سیالکوٹ کے باشندوں نے ایک نہایت اعلیٰ قسم کا کاغذ تیار کیا اور اس کا نام ''خاصہ جہانگیری'' رکھا۔ اس سے بھی پہلے اکبر بادشاہ کے دور میں یہاں پر ایک کاغذ تیار کیا گیا جو کہ اکبر بادشاہ کے ایک رتن راجہ مان سنگھ کو بہت پسند آیا اور اس کاغذ کا نام ہی مان سنگھی رکھا گیا۔ سیالکوٹ کا کاغذ نہایت سفید، مضبوط اور دیرپا بنتا تھا اس لیے شاہی خط و کتابت کے لیے بھی اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔

کاغذ کے علاوہ اور کسی چیز پر کتابت نہ کی جائے، خلیفہ ہارون الرشید کا شاہی فرمان

فرمایا مسلمانوں میں غالباً سب سے پہلے حکمران ہارون الرشید ہیں، جنہوں نے یہ حکم دیا کہ ان کی مملکت میں کاغذ کے علاوہ اور کسی چیز پر کتابت نہ کی جائے۔ ان کے اسی حکم کی بدولت پوری اسلامی دنیا میں کاغذ پر لکھا جانے لگا۔ اس سے پہلے لوگ چمڑے، لکڑی کی تختیوں اور پتھروں وغیرہ پر لکھا کرتے تھے۔ کاغذ کے کارخانے مسلمانوں میں رواج پا چکے تھے لیکن سرکاری طور پر یہ پہلا حکم تھا۔

کیا پٹھانوں اور افغانوں کے آباؤ اجداد اسرائیلی تھے؟

فرمایا پٹھانوں کو چاہیے کہ اپنے آباؤ اجداد کے اصل حالات جاننے کے لیے عباس شروانی کی کتاب ''تحفہ اکبر شاہی'' کا مطالعہ کریں۔ یہ کتاب ''تاریخ شیر شاہی'' کے

نام سے بھی مشہور ہے۔عباس شروانی درحقیقت افغان تھا اور اس کی شادی شیر شاہ سوری کے خاندان میں ہوگئی تھی۔اس نے ایسے لوگ دیکھے اور ان سے ملا تھا جو شیر شاہ سوری کے ہمراہ ہمایوں بادشاہ اور اس زمانے کے دیگر حکمرانوں کے خلاف لڑے تھے اس لیے اس نے شیر شاہ سوری اور دیگر پٹھانوں کے متعلق بہت مستند معلومات کو تحریر کیا ہے۔

دوسری کتاب ''خانجہانی مخزن افغانی'' ہے۔جہانگیر بادشاہ کے دور میں خان جہان لودھی نے نعمت اللہ صاحب کو حکم دیا کہ وہ افغانوں کی تاریخ مرتب کریں تو نعمت اللہ صاحب نے ''مخزن افاغنہ'' کے نام سے یہ تاریخ مرتب کی۔لیکن چونکہ یہ مرتب خان جہان لودھی کے حکم سے ہوئی تھی اس لیے اس کا نام ''خانجہانی مخزن افغانی'' مشہور ہوا اور اس کا آخری باب خان جہان لودھی کے حالات پر ہی مشتمل ہے۔اس کتاب کا انگلش میں ترجمہ بھی ہوا تھا اور ''تاریخ افغان'' کے نام سے یہ 1839ء میں چھپی بھی تھی۔

تیسری کتاب ''تاریخ داؤدی'' ہے یہ بھی عہد جہانگیری میں تحریر کی گئی اور اس کے مصنف عبداللہ نے لودھیوں اور سوریوں کے دور حکومت کو قلمبند کیا ہے۔

چوتھی کتاب محمد عبدالسلام خان صاحب کی ہے جو کہ برٹش دور میں سب جج کے عہدے پر فائز رہے ''نسب افاغنہ'' کے نام سے انہوں نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کیا ہے کہ پٹھانوں اور افغانوں کے آباؤ اجداد اسرائیلی تھے اور یہ یہودیوں ہی کا ایک قبیلہ ہے جو یہاں آ کر آباد ہوگیا تھا۔پھر ان کا نام پٹھان کیسے ہوا یہ تمام تحقیق اپنی بساط کی حد تک انہوں نے خوب کی ہے۔ یہ کتاب ''نسب افاغنہ'' پہلی جنگ عظیم کے موقع پر 1914ء میں شائع ہوئی تھی۔

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی ''سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' اور ''الفاروق'' کے لیے بیگم بھوپال اور سرکار آصفیہ حیدرآباد کی مالی سرپرستی

فرمایا علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی تصنیفات میں سے سب سے زیادہ جو پسند تھی وہ ''الفاروق'' تھی۔ ابھی یہ چھپی بھی نہیں تھی اور اس کا نام اور غلغلہ تھا۔ جنوری 1899ء میں پہلی مرتبہ یہ مطبع ''نامی'' کانپور میں چھپ کر، جب منصۂ شہود پر آئی ہے تو ایک تہلکہ برپا ہوا۔ ہندوستان کے اہل علم نے تو پڑھا اور داد دی ہی، ترکوں نے بھی کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ ترکی زبان میں محمد عمر رضا آفندی نے ترجمہ کیا اور 1926ء میں اس کا پہلا ایڈیشن استنبول سے چھپا۔ اس کتاب کا جتنا کریڈٹ علامہ شبلی نعمانی کو جاتا ہے اتنا ہی سرکار آصفیہ حیدرآباد کو بھی کہ انہوں نے پیشہ خرچ کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ علامہ شبلی نعمانی کی اس کتاب میں سرکار آصفیہ حیدرآباد اور ان کی دوسری کتاب ''سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' میں ریاست بھوپال نے جو مالی تعاون کیا اسے کوئی کیسے فراموش کر سکتا ہے۔ ان دونوں ریاستوں کے معاونین اور فرماں روا پیوند خاک ہو گئے لیکن ہم گنہگار اب بھی ان کے لیے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تُربتوں کو ٹھنڈا رکھے۔ رحمتِ خداوندی چھم چھم برسے اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کبریٰ میں سے انھیں بہت بڑا حصہ ملے۔ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنا پیسہ خرچ نہ کیا ہوتا تو عالم اسباب میں ''الفاروق'' اور ''سیرت'' کا لکھا جانا نہایت دشوار ہو جاتا۔ بیگم بھوپال نے جو تعاون کیا علامہ شبلی نعمانی نے تو اس پر ایک خاص تاریخی قطعہ بھی کہا۔

ـــہ مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہرصورت
کہ ابر سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی
تو اس کے واسطے حاضر، مرا دل ہے مری جاں ہے
غرض دو ہاتھ ہیں، اس کام کے انجام میں شامل
کہ جس میں اک فقیر بے نوا ہے، ایک سلطاں ہے.

وہ دس خوش نصیب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہیں بار بار جنت کی خوشخبری سنائی گئی.

فرمایا یوں تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمام کے تمام جنتی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں انھیں اپنی رضا کے اعزاز سے نوازا ہے لیکن ان تمام میں دس حضرات تو وہ ہیں، جنھیں حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار جنتی ہونے کی بشارت دی ہے۔ کوئی شخص جنتی ہے یا جہنمی؟ دنیا کی کوئی طاقت اسکا فیصلہ نہیں کرسکتی بڑے سے بڑا عالم دین اور اولیاء اللہ میں قطب الاقطاب اور ابدال کے درجے کا شخص بھی کسی اور کے بارے میں تو کیا، خود اپنے بارے میں بھی قطعی اور حتمی فیصلہ نہیں دے سکتا کہ وہ جنت میں جائے گا یا جہنم میں، اگر کوئی یہ فیصلہ کرسکتا ہے اور کرتا ہے اور حتمی اور قطعی خبر اس نے دی بھی ہے تو وہ صرف اور صرف ذات باری تعالیٰ ہے۔ وہ جانتا ہے اور اسی کا علم کامل ہے کہ کون جنت میں جائے گا اور کون جہنم میں۔ اپنے انہی فیصلوں کی خبر وہ

حضرات انبیاء علیہم السلام کو دیتا رہا ہے اور اسی سے وحی اور خبر پا کر یہ حضرات علیہم السلام بشارت دیتے رہے ہیں، جنت کی خوشخبری سناتے رہے ہیں اور اسی پاک ذات کی وحی اور خبر پا کر یہ بتاتے رہے ہیں کہ فلاں جہنم میں جائے گا۔

تو حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسی ذات باری تعالیٰ نے بار بار یہ خوشخبری دی اور قرآن کریم میں قطعی فیصلہ فرمادیا کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب جنتی ہیں۔

اور اسی ذات اقدس، ذوالجلال والاکرام، فالق الحب والنویٰ، فالق الاصباح نے اپنے نبی حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی کہ فلاں فلاں صحابی رضی اللہ عنہ قطعی جنتی ہے نہ حساب و کتاب ہے نہ عذاب قبر ہے نہ قیامت کے دن کی سختیاں ہیں اور نہ اعمال کا وزن ہے۔ اِدھر دم نکلا اُدھر جنت میں گئے۔ ان کی قبور جنت کے باغات ہیں اور کسی بھی نوع کی پریشانی تو کیا، ہر طرح کی راحت اور سرور ہے۔ اپنے پروردگار کی رضا، اس کی خوشی اور اس کے انعامات ہیں۔ پھر ان میں دس ہستیاں تو ایسی ہیں جنھیں بار بار یہ خوشخبری سنائی گئی کہ وہ جنتی ہیں۔ اسی وجہ سے ان کا لقب عشرہ مبشرہ ہوا۔ عشرہ کے معنی ہیں دس (۱۰) اور مبشرہ کے معنی ہیں جنھیں خوشخبری دی گئی۔ چنانچہ بشارت تو ہر ایک صحابی رضی اللہ عنہ کو دی گئی لیکن جنھیں بار بار جنت کی بشارت دی گئی وہ یہ دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں۔

حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اور قطعی خبر دی کہ

① حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

② حضرت عمر رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

③ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

④ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

⑤ حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

⑥ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

⑦ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

⑧ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

⑨ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

⑩ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جنت میں ہیں۔

.......کرنے کا ایک کام.
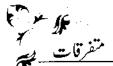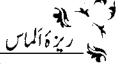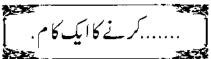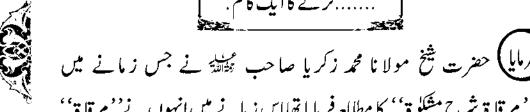
فرمایا حضرت شیخ مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جس زمانے میں ''مرقاۃ شرح مشکوٰۃ'' کا مطالعہ فرمایا تھا اس زمانے میں انہوں نے ''مرقاۃ'' میں جن جن رُواۃِ حدیث پر حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے کلام فرمایا تھا، ان کے اسماء گرامی کو الگ لکھ دیا تھا اور اپنی کتاب یا کتابچے کا نام بھی تجویز فرما دیا تھا "جز ملتقی الرواۃ عن المرقاۃ" لیکن یہ رسالہ اب تک نہ چھپ سکا۔ بہت ضرورت تھی کہ کوئی اللہ کا بندہ اس مخطوطے کو حاصل کر کے اس پر کام کرتا۔

تاج محل آگرہ

فرمایا ان مغل بادشاہوں میں فن تعمیر کا بھی بادشاہ، شہزادہ خرم شاہ جہاں بادشاہ تھا۔

عمارات کے نقشے، تزئین، تعمیر میں مہارت گویا کہ ان کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے۔ حد یہ کہ ان کے والد جہانگیر بادشاہ نے خود اپنی پسند کی تعمیرات لاہور اور کشمیر میں انہی کے حوالے کیں۔ تاریخ بار بار یہ بتلاتی ہے کہ عمارات کے نقشے ان کے سامنے لائے جاتے تو ترامیم کرواتے۔ عمارات کا بنیادی تصور اور ڈھانچہ نقشہ نویسوں کو بتاتے اور تعمیرات بھی اپنی نگرانی میں کرواتے۔ جہاں دیکھتے کہ قاعدے کے خلاف کام ہوا ہے تو اس تعمیر کو ختم کرنے میں بھی تاخیر نہ کرتے۔ جہانگیر نے اپنے اس بیٹے کی شادی کے لیے اپنی محبوب ملکہ نور جہاں کی بھتیجی ارجمند بانو بنت آصف خان کو منتخب کیا اور اسے ممتاز محل کا خطاب دیا تھا۔ شاہ جہاں بادشاہ جو اس وقت شہزادہ خرم تھا، اسے اپنی اس بیوی سے شدید محبت تھی اور 1040ھ میں برہان پور میں اس کا انتقال ہوگیا، میّت آگرہ لائی گئی اور اس کا مزار 1040ھ ہی میں بننا شروع ہوگیا تھا، یہاں تک کہ 1057ھ میں اس کی تعمیر مکمل ہوئی اور روضۂ ممتاز محل اس کا نام ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ غالبًا یہ ممتاز کا لفظ بگڑ کر تاج ہوا اور یہ تاج محل کہلانے لگا۔ اس پورے تاج محل کی تعمیر میں کسی مغربی انجینئر کا کوئی کام نہیں ہوا۔ اصل بات یہ ہے کہ میر مرتضٰی شیرازی وغیرہ اپنے کتب خانوں سمیت جب ہندوستان آئے ہیں تو انہوں نے یہاں کے نظامِ تعلیم میں ترسیم اعداد، علومِ طبیعات وغیرہ کو بہت داخلِ نصاب کیا۔ انہی علوم کو بچوں نے پڑھا، ریاضی اور جیومیٹری کے ماہر ہوئے، ان میں سے ایک بچہ احمد معمار بھی تھا، جس نے تاج محل تعمیر کیا اور وہ جیومیٹری کا بہت بڑا صاحبِ فن تھا۔ جس فرانسیسی ہنرمند موسیو آسٹن ڈی بورڈو کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ تاج محل کی تعمیر میں وہ بھی شریک تھا، سب جھوٹ اور خود تراشیدہ افسانے

ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ موسیوفرانسیسی کا تذکرہ تزک جہانگیری میں بھی آیا ہے۔جہانگیر بادشاہ نے اس کی قدر کی پھر شاہ جہاں بادشاہ نے بھی اسے اپنے دربار میں رکھا اور پھر اس پر اعتماد کرتے ہوئے پرتگال کے ساتھ سفارتی تعلقات کی غرض سے انھیں وہاں بھیجا گیا۔پرتگالیوں نے اس موسیوفرانسیسی کو قتل کر دیا اور بات ختم ہوگئی۔شاہ جہاں بادشاہ کی یہ اہلیہ ممتاز محل اس وقت زندہ تھیں اور تاج محل کا کوئی تصور دور دور تک بھی کسی کے ذہن میں نہ تھا۔یہ تو اس حادثے کے کہیں بعد ملکہ عالیہ کا انتقال ہوا ہے اور پھر کہیں جا کر ''تاج محل'' بنا ہے۔موسیوفرانسیسی کا اس میں کیا کام،تاج محل خود شاہ جہاں بادشاہ ہی نے بنوایا تھا۔ 1048ھ میں دہلی کے لال قلعہ اور نئے شہر شاہ جہان آباد کی بھی بنیاد انھوں نے ہی رکھی اور محل کلاں وغیرہ سب اسی دور کی یادگاریں ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ شاہ جہاں بادشاہ کمال کا شخص تھا۔ایک طرف تعمیرات اور دوسری طرف علم کے سمندر کا ماہر شناور۔پورب میں تعلیمی ادارے بنوائے اور اتنے قابل اساتذہ کہ جن کی شہرت سن کر ایران،توران، آذربائیجان اور روس تک کے طلباء پڑھنے کے لیے یہاں آئے۔شاہ جہاں نے چونکہ فلسفہ اور منطق بھی بخوبی پڑھ رکھے تھے اس لیے اہل علم کو یارا نہیں تھا کہ ان کے دربار میں کسی بھی علم میں بغیر جانکاری کے دخل دیں۔

''تاج''میں ارجمند بانو بیگم،ممتاز محل کی قبر بھی گواہ ہے کہ اس تعمیر میں کسی مغربی ماہر کا ہاتھ نہیں ہے اور ایک دلیل اس کی یہ بھی ہے کہ جب سمرقند جانا ہوا تو حضرت امیر تیمور گورگانی کی قبر پر حاضری ہوئی اور یہ وہ قبر تھی جو حضرت گورگانی نے اپنی اہلیہ بی بی خانم کے لیے ان کی حیات ہی میں بنوائی تھی لیکن قضاء قدر کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا،بالآخر حضرت امیر تیمور

گورگانی خود اس میں دفن ہوئے۔ زیر زمین سردانہ برائے قبر ہے اور یہی وہ انداز ہے جو ممتاز محل کی قبر کا ہے۔ مغل شہزادیوں کی قبریں ہمیشہ یوں ہی بنتی تھیں۔ حضرت شاہ جہاں نے سمرقند میں بھی اور اپنے خاندان کی قبریں ہمیشہ دیکھی ہوں گی اور انہوں نے اپنی اس اہلیہ کی قبر بھی یونہی بنوائی ہوگی اس لیے قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ طرزِ تعمیر خود صاحبِ قِران ہی کا ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مرحوم نے ایک کتاب ''تاج محل آگرہ'' تحریر فرمائی تھی لیکن اب یہ بہت کمیاب ہوگئی ہے، اس میں بہت سے تاریخی حقائق سے پردہ اُٹھایا گیا ہے۔ اس موضوع پر اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

قبر پرستی، جاہل پیر اور من گھڑت کرامات

فرمایا خانقاہوں کا پورا نظام ایک ہی مرکز کے گرد گھومتا تھا اور وہ مرکز تھا ''تزکیہ نفس''۔ مشائخ واردین وصادرین کی تربیت کرتے تھے انہیں باطنی بیماریوں سے نجات دیتے تھے اور ان کے باطن کو اخلاقِ جمیلہ سے مزین کرتے تھے۔ عیاری، غصّے اور حد سے بڑھی ہوئی شہوت کا علاج ان کے ہاں تھا اور وہ توحید باری تعالیٰ، اِتباعِ سنت اور اعمالِ صالحہ کے رنگ میں رنگ دیتے تھے۔ قبر پرستی کا شائبہ تک نہ تھا اور یہ قبر پرستی کا رجحان تو اس وقت زیادہ ہوا ہے، جب مسلمانوں کے ہاں تعلیم میں کمی آئی ہے۔ جہالت نے اسے رائج کیا ہے اور پھر صورتحال اتنی بگڑ گئی کہ اُنیسویں صدی کے آغاز میں ایک عیسائی مسلمان ہوگیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم مسلمانوں کو دھوکہ دینے یا دنیاوی اغراض ومقاصد کی وجہ سے یا سچے دل سے، بہرحال وہ مسلمان ہوگیا اور لوگوں نے

اسے پیر و مرشد مشہور کر دیا۔ اب اس کے بھی مزے ہو گئے اور جہاں بھی گیا خوب پذیرائی ہوئی۔ جاہل مسلمان دھڑا دھڑ بیعت ہونے لگے اور مریدوں نے اپنے پاس سے گھڑ گھڑ کر کرامتوں کے دفتر رقم کر دیئے۔ ایک مرتبہ ایک مرید کے گھر گئے اور اس مرید باصفا نے مرغ پلاؤ، بہت اہتمام سے پکایا۔ پیر صاحب کی اُردو بھی کچھ اچھی نہ تھی اور مشرقی تہذیب سے بھی کماحقہ واقفیت نہ تھی تو قاش سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مرید سے فرمایا سبحان اللہ بکرے کا پلاؤ بہت خوب ہے۔ مرید مخلص لیکن دیہاتی اور آداب گفتگو سے ناآشنا، بہت بگڑا اور بولا حضرت آپ کی کرامت کے کیا کہنے، برسوں سے اپنے کشف و کرامات کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہو اور کھلی آنکھوں چیز دکھائی نہیں دیتی کہ مرغ اور بکرے میں فرق نہیں کر سکتے۔

بادشاہی، فقیری اور علم

فرمایا بغداد اُجڑا تو دہلی بسا۔ تاتاریوں نے بغداد میں خلافت کا خاتمہ کیا تو اس دور کے علماء و صوفیاء نے دہلی ہجرت کی۔ ہندوستان کو بھی تاتاری تباہ و برباد کر دیتے لیکن یہاں حکومتیں بہت مضبوط تھیں۔ سلطان بلبن نے اپنے ولی عہد بیٹے اور لخت جگر کو ہدایت دی کہ جان پر کھیلنا پڑے تو کھیل جائے لیکن تاتاری ہندوستان نہ داخل ہوں۔ شہزادہ محمد بھی جان پر کھیل گیا لیکن ہندوستان، تاتاریوں کے لیے سد سکندری بن گیا۔ علاؤالدین خلجی نے بے شمار قربانیاں دیں اور تب جا کر ہندوستان محفوظ رہا اور یہی مضبوط حکومتیں وہ حصار اور چاردیواریاں تھیں جن کے اندر اَمن اور سکون تھا،

علماء و مشائخ دعوت کا کام کر رہے تھے، غیر مسلم مسلمان ہو رہے تھے، ہندوستان میں اسلام کا پودا جڑ پکڑ رہا تھا تو یہ سب کچھ اسی وجہ سے تھا کہ ان بادشاہوں اور غازیوں نے سرحدوں کو محفوظ کر رکھا تھا۔ اگر سرحدیں محفوظ نہ ہوتیں تو دہلی بھی بغداد کی طرح خون سے نہا جاتی اس لیے اگر خدمات، خواجہ اجمیری، حضرت کعکی اور حضرت سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کی ہیں تو کچھ کم حصہ بلبن، اس کے بیٹے محمد، خلجی، تغلق، لودھی اور مغل حکمرانوں کا بھی نہیں ہے۔ ہم ایسے بے توفیق واقع ہوئے ہیں کہ کبھی ان بادشاہوں، غازیوں اور شہداء کے لیے چار الفاظ پڑھ کر ایصالِ ثواب نہیں کرتے حالانکہ احسانات ان کے صوفیاء سے بھی کچھ سواء ہی ہیں۔

بغداد کے جو بھی مشائخ اور علماء دہلی آئے، دربار نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا ان کے معاشی مسائل حل کیے انھیں تعلیمی ادارے اور خانقاہیں بنانے کو مفت میں گاؤں کے گاؤں دیئے۔ نقد رقوم پیش کیں کہ آزادی سے خرچ کر سکیں اور ان کے کتب خانوں کے لیے عمارتیں بھی سرکار نے بنوا کر دیں۔ دہلی اور کیا احسان کرتا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت کے ہندوستانی معاشرے میں ہر طرف تعلیم ہی تعلیم تھی۔ دہلی علم کے میدان میں بغداد، مصر، بیت المقدس اور استنبول کے ہم پلہ ہوا اور معاشی اعتبار سے تو ان تمام مقامات سے فائق تھا۔ کتاب فروشوں کی دکانیں چمک اُٹھیں اور باقی ہندوستان تو الگ رہا، صرف دہلی ہی میں کاتب اتنے زیادہ تھے کہ کوئی گلی محلّہ ان سے خالی نہ تھا اس کے باوجود کوئی شخص کسی بھی علم و فن کی کوئی کتاب کسی کاتب کے پاس لے جاتا اور کہتا کہ اس کا دوسرا نسخہ تحریر کر دیں تو کاتب عام طور پر یہ کہتے کہ کتاب چھوڑ جائیے اور

ایک سال تک فرصت نہیں اس کتاب کا دوسرا نسخہ سال کے بعد لکھنا شروع کریں گے۔ اکبر جیسا بادشاہ، جو مشہور ہے کہ اَن پڑھ تھا، اس کا قلعہ آگرہ میں دیکھا تو اکبر کے سونے کے مقام سے، سب سے زیادہ قریب ترین مقام اس کا کتب خانہ دیکھا۔ چونکہ کتابوں کے سائز مختلف ہوا کرتے ہیں اس لیے یہ بھی دیکھا کہ اکبر بادشاہ نے کتابوں کے لیے پتھر کی الماریاں بنوائی ہیں اور خانوں کا سائز بھی مختلف رکھا ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے جس طرح اپنے کتب خانوں کو محفوظ رکھا اور علم کی ترویج کی، یہ علم کی ایسی عظیم الشان خدمت تھی کہ آج تک کوئی بھی قوم اس شرف میں ان کی شریک وسہیم نہیں ہے۔

کتب عقیدہ

فرمایا عقیدہ سب سے اہم بات ہے اور اہل علم نے ہر دور میں اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے کے تحفظ اور تشریح میں مختلف کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ ہمیشہ ان کتابوں سے عقیدے کو پڑھتے رہنا چاہیے اور جاننا چاہیے کہ ان حضرات نے عقیدے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ برحق ہے۔ حضرات ماتریدیہ اور اشاعرہ رحمہم اللہ دونوں علم کلام کے ماہرین ہیں اور ان دونوں میں سے کسی کو بھی مان لیا جائے تو، انسان اہل السنۃ والجماعۃ ہی میں شمار کیا جائے گا۔ حنفی حضرات نے عموماً عقیدۂ علماءِ ماتریدیہ اور شافعی علماء نے عموماً عقیدۂ علماءِ اشاعرہ کو ترجیح دی ہے۔ موالک بھی انہی کے ہمراہ ہیں اور عقیدہ سبھی کا اہل السنۃ والجماعۃ کا ہے۔ "فقہ اکبر" بہت عمدہ متن ہے اور کتب عقائد میں اگر کسی استاد

سے یہ کتاب پڑھ لی جائے تو پھر اس سے بہتر کتاب کوئی نہیں "عقیدۂ طحاویہ" میں بھی وہی بات ہے جو "فقہ اکبر" میں ہے لیکن "عقیدہ طحاویہ" میں تکرار بہت ہے۔ "عقائد بزدوی" اور "عقائد نسفی" کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے۔ امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ کی "بداء الامالی" اور حضرت ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس کی شرح تحریر فرمائی ہے اسے بھی سمجھنا چاہیے۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "اعتقاد نامہ" حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "عقیدۂ حسنہ" اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "میزان العقائد" بھی پڑھنی چاہئیں۔ حضرت فخر الدین چشتی نظامی رحمۃ اللہ علیہ بھی بہت صاحبِ علم اور سلسلۂ چشتیہ نظامیہ کے رکن رکین تھے۔ عقیدے پر انہوں نے ایک نہایت عمدہ رسالہ "نظام العقائد" تحریر فرمایا ہے۔ ان تمام کتابوں میں تحریر شدہ عقائد اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد حقہ ہیں، انھیں مضبوطی سے تھام لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں، حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح احادیث میں جو عقیدہ رکھنے کا حکم دیا ہے، ان حضرات نے اپنے اپنے دور میں انہی عقائد کو بیان اور اس کی تشریح کی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہی صحیح عقائد پر خاتمہ بالخیر فرمائے اور قبر و حشر میں بھی عافیت رکھے۔

قصیدہ در مدحِ حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ

فرمایا عبدالملک بن مروان نے خواب میں دیکھا کہ مسجد کے محراب میں اس نے چار مرتبہ پیشاب کیا۔ بیدار ہوا تو اس خواب کی اہمیت کو محسوس کر کے تعبیر کے درپے
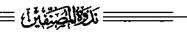
ہوا۔ حضرت سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ مدینہ منورہ میں پورے جلال واکرام کے ساتھ بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کو تعبیر کے لیے زحمت دی گئی تو ارشاد فرمایا اس کے چار بیٹے خلیفۃ المسلمین ہوں گے چنانچہ اس کے چاروں بیٹے ① ولید بن عبدالملک ② سلیمان بن عبدالملک ③ یزید بن عبدالملک ④ ہشام بن عبدالملک درجۂ خلافت تک پہنچے۔

اس ہشام بن عبدالملک نے تقریباً 20 برس حکومت کی اور ایک مرتبہ طواف کے لیے مکہ مکرمہ حاضر ہوا تو حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے آگے بڑھا، طواف کرنے والوں کی بھیڑ نے کوئی پروانہیں کی اور خلیفہ ہونے کے باوجود دھکے لگے اور بالآخر مطاف کے کنارے پر واپس آ گیا۔ اسی اثنا میں خانوادۂ نبوت کے گل سرسبد، حضرت سید الساجدین، امام زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ کی حرم شریف حاضری ہوئی اور جونہی آپ مطاف میں داخل ہوئے تو لوگوں نے آپ کے احترام میں جگہ چھوڑ دی آپ بہت پُر وقار طور پر آگے بڑھے، حجر اسود کو بوسہ دیا اور طواف کا آغاز کیا۔ آپ جس طرف بھی جاتے تھے لوگ آپ کے احترام میں راستہ چھوڑ دیتے تھے اور نہایت پُرسکون طواف جاری تھا۔ دیکھنے والوں کے لیے یہ منظر نہایت حیرت ناک تھا کہ خلیفۂ وقت کی پروانہ ہوا اور ایک ایسی ہستی کے لیے لوگ بچھے چلے جارہے ہوں، جس کے پاس نہ فوج، نہ خدم وحشم، نہ تاج اور نہ تخت، اسی اثنا میں کسی نے ہشام سے پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ کون ہیں؟ حضرت زین العابدین ابن حسین ابن علی رضی اللہ عنہم ہیں لیکن تجاہل عارفانہ سے بولا مجھے کیا معلوم کہ یہ کون ہے؟ شاعر اہل بیت کرام ابوفراس ہمام بن غالب فرزدق تمیمی وہاں کھڑا تھا۔ اس سے حضرت والا کی یہ توہین برداشت نہ ہوئی اور حضرت زین العابدین رحمۃ اللہ علیہ

کی شان میں برجستہ یہ قصیدہ کہا:

هٰذَا الَّذِيْ تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْأَتَهُ
وَالْبَيْتُ يَعْرِفُهُ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

ترجمہ: یہ وہ مقدس شخصیت ہے کہ جس کے نقشِ قدم کو وادیٔ بطحا (مکہ مکرمہ) پہچانتی ہے اور بیت اللہ (کعبہ) اور حل وحرم سب ان کو جانتے پہچانتے ہیں۔

هٰذَا ابْنُ خَيْرِ عِبَادِ اللّٰهِ كُلِّهِمٖ
هٰذَا التَّقِيُّ النَّقِيُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ

ترجمہ: یہ تو اس ذاتِ گرامی کے لختِ جگر ہیں جو اللہ کے تمام بندوں میں سے سب سے بہتر ہیں (حضور اکرام ﷺ) یہ پرہیزگار، تقویٰ والے، پاکیزہ، صاف ستھرے اور قوم (قریش) کے سردار ہیں۔

إِذَا رَأَتْهُ قُرَيْشٌ قَالَ قَائِلُهَا
إِلٰى مَكَارِمِ هٰذَا يَنْتَهِي الْكَرَمُ

ترجمہ: جب ان کو قبیلہ قریش کے لوگ دیکھتے ہیں تو ان کو دیکھ کر کہنے والا یہی کہتا ہے کہ ان کی بزرگی وجواں مردی پر بزرگی وجواں مردی ختم ہے۔

اگرچہ مؤرخین میں اس قصیدے کے متعلق یہ اختلاف ہے کہ اس قصیدے کو حضرت زین العابدین نہیں بلکہ ان کے والد محترم حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہم کے بارے میں پڑھا گیا ہے اور اس قصیدے کو فرزدق نے نہیں بلکہ عمرو بن عبید حزین کنانی نے کہا ہے، مادح، جریر اور کثیر اور ممدوحِ حضرت امام محمد باقر ابن زین العابدین رحمۃ اللہ علیہم کو بھی
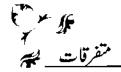
کہا گیا ہے لیکن ان تاریخی اختلافات کے باوجود یہاں ابن خلکان ، امام یافعی اور ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کو ترجیح دی گئی ہے۔

عربوں کا معاہدہ اور یمین.

فرمایا عربی زبان میں ''یمین'' قسم کو کہتے ہیں اور اس کی جمع ہے ''اَیمان''۔ اور یمین سیدھے، دائیں ہاتھ کو بھی کہتے ہیں۔ عرب جب کوئی معاہدہ کرتے تھے تو اس میں شدت اور پختگی پیدا کرنے کے لیے آپس میں دائیں ہاتھ سے بھرپور مصافحہ کیا کرتے تھے۔ اس وجہ سے قسم کو بھی ''یمین'' کہنے لگے۔

چراغ حسن حسرت اور زاہد خشک.

فرمایا برصغیر کی زرخیز زمین نے جو زر و جواہر اُگلے ان میں سے ایک جناب چراغ حسن حسرت بھی تھے۔ حقے کے رسیا اور رند خراباتی۔ ایک مرتبہ دوران سفر ایک مولوی صاحب کے گھر رات ٹھہرنا پڑ گیا۔ سونے سے پہلے مولوی صاحب سے حقے کی فرمائش کی لیکن وہ زاہد خشک اور مکان حقے سے خالی۔ مولوی صاحب نے صورتحال عرض کر دی اور خود نسوار منہ میں ڈال لی۔ حضرت حسرت نے برجستہ شعر کہا:

؎ نیست حقہ نے تماکو بر مکان مولوی
ہاں مگر نسوار بینم در دہان مولوی
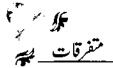
شورش کاشمیری اور مولانا حسرت کی عیادت.

فرمایا جب موت اپنا پنجہ گاڑ دے تو بستی کے کسی مسجد والوں کی دعا نہیں سنی جاتی۔ نزع کے عالم میں دوستوں کے چہرے شاید موت کی تلخی کو کم کر دیتے ہوں لیکن چراغ بجھ کر رہتا ہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت کا آخری وقت دن بدن قریب آ رہا تھا۔ جناب شورش کاشمیری عیادت کے لیے حاضر ہوئے تو انہوں نے دیکھا اور شاد عظیم آبادی کا یہ شعر پڑھا:

اعضاء بدن سب مضطر ہیں اس دل کے شہادت پانے سے
لشکر میں تلاطم برپا ہے، سردار کے مارے جانے سے

ماسوا غیر ہے اور اس کی نفی لازم ہے.

فرمایا ماسوا کی نفی کر کے وجود حقیقی صرف ایک ہے۔ سبحانہ وتعالیٰ. ماسوا اس کے مظاہر نہیں، مخلوق ہیں۔ وجود حقیقی ہی کی عبادت شارع کا مطلوب ہے۔ اگر ماسوا کو اس کی مخلوق کی بجائے اس کے مظاہر سمجھ کر عبادت کی جائے تو بعثت انبیاء علیہم السلام باطل قرار پاتی ہے۔ خام خیال صوفیاء کو اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے اور اس پُر فریب تقیے سے باز رہنا چاہیے۔ ماسوا کی عبادت سے حضرات انبیاء علیہم السلام کیوں اتنی سختی اور تاکید سے منع فرماتے ہیں اور اس پر دائمی عذاب کی وعید وارد ہوئی ہے، تو آخر کوئی تو اس میں حکمت ہوگی۔ وحدۃ الوجود کے غالی دعاۃ کیوں اس حقیقت سے صرف نظر کرتے ہیں؟ ماسوا غیر ہے اور اس کی نفی لازم ہے۔ وحدت معبود کی راہ ہی اصل راہ ہے۔

اشاریہ

Index

ریزۂ الماس

عناوین

سورتیں اور آیاتِ قرآنیہ

ندوۃ المصنفین

احادیث نبویہ

اسماء

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ب

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ش

ندوۃ المصنفین

ط

ع

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ی

قبائل/خاندان

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

مذاہب وفرق (فرقے)

غزوات

ماہ وسال

ندوۃ المصنفین

کتب

آ

ا

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

رسائل واخبارات

اوراد ووظائف

اصطلاحات/محاورات

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ش

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ندوۃ المصنفین

ن

تہوار

طب

ضرب الامثال

جانور

علمِ نجوم

اشعار

عربی

إن كـــان لـــي عـــنـــد ســلـــمـــىٰ قبـــول
فـــلا أبـــالـــي بـــمـــا يـــقـــول الـعـــذول

36 ———————

جَـــوَادٌ كَـــرِيْـــمٌ، نَبِـــيُّ الـــرَّحْـــمَةِ وَالْهُـــدَىٰ
شَـــمَـــائِـلُـــهُ عَـفْـوٌ، مَـنْبَـعُ الْجُـوْدِ وَالْـوَفَـا

——— دوسرے شعر کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ:34

فَـــإِنَّكَ إِنْ أَعْـــطَيْـــتَ بَـــطْـــنَكَ سُـــؤْلَـــهُ
وَ فَـــرْجَكَ نَـــالاَ مُـــنْتَهَـــى الـذَّمِّ أَجْـمَـعَـا

479 ———————

قــل لأبــی الــفــضــل قــول مــعــتــرف

مــضــی جــمــادی و جــاء نــا رجــب

—— دوسرے شعر کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ:473

هــذَا الَّــذِيْ تَــعْــرِفُ الْبَــطْــحَــاءُ وَطْــأَتَــهٗ

وَالْبَيْــتُ يَــعْــرِفُــهٗ وَالْــحِــلُّ وَالْــحَــرَمُ

—— اس قصیدے کے باقی اشعار کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ:504

يَــا رَبِّ أَعْــضَــاءَ السُّــجُــودِ عَتَــقْتَهَــا

مِــنْ عَبْــدِكَ الْــجَــانِــيْ وَ أَنْــتَ الْــوَاقِــي

—— دوسرے شعر کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ:63

فارسی

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم

من و تو کشتۂ شان جمالیم

—— 221

حکمت اشیاء فرنگی زادہ نیست

اصل او جز لذت ایجاد نیست

—— مزید اشعار کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ: 474

خامۂ او نقش صد امروز زیست

تا بیارد صبح فردائے بدست

—— مزید اشعار کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ:162

دریں محفل کہ افسونِ فرنگ از خود ربود اُو را
نگاہ پردہ سوز آور، ولے دانائے راز او را

——— دوسرے شعر کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ:293

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ با دشمناں نظر داری

——— 412

دی شیخ باچراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دیو و دد ملوم و انسانم آرزوست

——— مکمل نظم کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ:108

ز رازیؔ حکمت قرآں بیاموز
چراغے از چراغ او بر افروز

——— رباعی کے دوسرے شعر کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ:331

ز من بجرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

——— 409

من نکردم خلق تا سودے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

——— 285

میان ما و بیت اللہ رمزیست
کہ جبریل امیں را ہم خبر نیست

——— 292

نیست حقہ نے تماکو بر مکان مولوی
ہاں مگر نسوار بینم در دہان مولوی

505————————

وا کرد چشم چوں پے دیدار مرتضٰی
خندید مثل غنچہ و کارش تمام شد

396————————

وقتِ عزیز رفت، بیا تا قضا کنیم
عمرے کہ بے حضورِ صراحی و جام رفت

399————————

یاراں ز مہربانی دانند، ہرچہ دانند
ما خوب می شناسیم، اے درد، آنچہ مائیم

396————————

اردو

آتے نہیں جن کو اور دھندے ساقی
اوہام کے وہ بنتے ہیں پھندے ساقی

393————————

آکے سجادہ نشیں قیس ہوا میرے بعد
نہ رہی دشت میں خالی کوئی جا میرے بعد

دوسرے شعر کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ: 422

اے نازشِ آدم صل علیٰ
اے مُرسلِ خاتم صل علیٰ

(مکمل نعت ص:29 پر ملاحظہ فرمائیں)

ایک ڈھیری راکھ کی تھی صبح جائے میرؔ پر
برسوں سے جلتا تھا، شاید رات جل کر رہ گیا

423

بت خانے کھود ڈالیے مسجد کو ڈھایئے
دل کو نہ توڑیے یہ خدا کا مقام ہے

413

بس کہ رہتا ہے یار آنکھوں میں
ہے نظر بے قرار آنکھوں میں

مزید اشعار کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ:403

بسنتی قبا پر تیری مر گیا ہے
کفن میر کو دیجیو زعفرانی

424

بہت میرؔ پھر ہم جہاں میں رہیں گے
اگر رہ گئے آج شب کی سحر تک

424

ٹ

ج

جنس بازار معاصی، اسد اللہ اسدؔ
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

304

جود ہے، بخشش ہے، دل نوازی ہے
ہر ایک طرح غلاموں کی سرفرازی ہے

285

جھکی کچھ کہ جی میں چبھی سبھی، ہلی ٹک کہ دل میں کھبی سبھی
یہ جولاگ پلکوں میں اس کی ہے نہ چھری میں ہے نہ کٹار میں

420

جی ڈھا جائے ہے سحر سے آہ
رات گذرے گی کس خرابی میں

421

چندن پڑا چمار کے نت اُٹھ کوٹے چام
رو رو چندن مہی پھر ے پڑا نیچ سے کام

379

چھلے ہیں مونڈھے، پھٹی ہے کہنی، چسی ہے چولی، پھنسی ہے مہری
قیامت اس کی ہے تنگ پوشی، ہمارا جی تو، بہ تنگ آیا

421

ح

حدیث زلف دراز اس کے منہ کی بات بڑی
کبھو کے دن ہیں بڑے یاں کبھو کی رات بڑی

423

خ

خم کو توڑ دیں گے یہ کھلونے دیکھو
چہرے جیسے پھٹے بچھونے دیکھو

دوسرے شعر کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ: 394

خوش رہتے ہیں چار ابرو کی ہتلا کے صفائی مانند قلندر
نے ہم کو غم دزد نہ اندیشہ کالا ہے خوب فراغت

مزید اشعار کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ 416

خوشا وہ دل کہ ہے جس دل میں آرزو تیری
خوشا دماغ جسے تازہ رکھے بو تیری

413

د

دانت گرے اور کُھر گھسے پیٹھ بوجھ نہ لے
ایسے بوڑھے بیل کو،کون باندھ، بُھس دے

304

دل جو تھا اک آبلہ، پھوٹا گیا
رات کو سینہ بہت کوٹا گیا

423

دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا

424 ————

دوسرا مجھ سا کوئی لا نہ سکے گی دنیا

378 ————

دے مارا اس نے شیشۂ دل کو زمین پر
کہتے ہوئے کہ "جایئے! میرا نہ آپ کا"

393 ————

ڈ

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

391 ————

ر

رات بھر شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

418 ————

رات دن جمگھٹا ہے، میلہ ہے
مہر و ماہ کا کٹورا بجتا ہے

398 ————

سیکھ وا کو دیجیے جا کو سیکھ سہائے
سیکھ نہ دیجیے باندرا جو گھر بئے کا جائے

173

ش

شاید وہ عاشقوں کو سمجھتا ہے بومِ محفل
رکھتے ہیں جو وفا کی تمنا جفا کے بعد

236

شبہہ ناسخ نہیں کچھ میر کی اُستادی میں
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

422

ص

صاف آتش میں کود پڑ، جل جا
کچھ تُو شعلے سے اے پتنگ نہ پوچھ

415

ظ

ظہور آدم خاکی سے یہ ہم کو یقین آیا
تماشا انجمن کا دیکھنے، خلوت نشین آیا

412

کانٹا بُرا کریل کا اور بدری کا گھام
سوکن بُری ہے چُون کی اور ساجھے کا کام

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چُرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر
پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہوگئے

کھولے ہیں اس نے پیرہن یوسفی کے بند
تہہ کر رکھے نسیم سے کہہ دو، قبائے گل

کیا ڈھونڈ رہے ہو رہ رہ کر ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تم دیکھ کے جس کو بھول گئے اے اہل وفا وہ خواب ہیں ہم

کیا کیا عذاب اٹھائے ہیں اندوہ عشق کے
جز نام اب تو کچھ بھی نزاکت نہیں رہی

مسجد کے زیر سایہ اک گھر بنا لیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

400

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت
کہ ابر سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے

اس قطعہ کے باقی اشعار کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ:493

میرؔ دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی
اللہ اللہ رے طبیعت کی روانی اس کی

420

میرؔ صاحب زمانہ نازک ہے
دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار

418

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

422

میرؔ! اس بے نشاں کو پایا جان
کچھ ہمارا اگر سراغ لگا

419

ن

نہ ہوا، پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

نہیں معلوم اب کے سال مے خانے پہ کیا گذری
ہمارے توبہ کرلینے سے پیمانے پہ کیا گذری

وہ دلِ روشن کہ تھا سارے زمانے کا چراغ
گور پر میری بنا ہے اب سرہانے کا چراغ

وہاں تو صبح سے شام تک کٹورا بجتا ہے

ہجر شیریں میں کیوں کہ کاٹے گا
کوہ کن یہ پہاڑ سی راتیں

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

110————————

ہرچند رام پور میں گھبرا رہا ہے داغؔ
کس طرح جائے کلب علی خان کو چھوڑ کر

382————————

ہوش والوں سے جو سنتا ہے فسانہ تیرا
بیٹھا منہ پھیر کے ہنستا ہے دوانہ تیرا

392————————

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

401————————

ہے دو روحوں کا نشیمن پیکر خاکی میرا
رکھتا ہے بے تاب دونوں کو مرا ذوق طلب

مکمل رباعی کے لیے ملاحظہ فرمائیں صفحہ: 362,363

یا یک نیاز اس سے کیوں کر کوئی بر آوے
آتا ہو سو طرح سے جس کو کہ ناز کرنا

414————————

یہ جو مہلت، جسے عمر کہتے ہیں
دیکھو تو! انتظار سا ہے کچھ

419 ————————

یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

418 ————————